سلسلۂ مطبوعات مجلس :

علامہ سید سلیمان ندویؒ

کے

تفسیری نکات

(جلداول)

محمد فرمان ندوی

(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

۱۴۳۶ھ - ۲۰۱۵ء

نام کتاب	:	علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تفسیری نکات (جلداول)
نام مرتب	:	محمد فرمان ندوی
صفحات	:	۵۲۸
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

وإنه من سليمان، وإنه بسم اللّٰه الرحمن الرحيم

(یہ سلیمان کی طرف سے ہے، اور اس میں ہے :

شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے، رحیم ہے)

(نمل:۳۰)

فہرست عناوین

عرض ناشر جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی	
مقدمہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	
تقریظ جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی	
پیش لفظ جناب مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	
عرض حال	
ابتدائیہ	
باب اول علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ان کا تفسیری مزاج	
تاریخی پس منظر	
ولادت اور جامع الکمالات شخصیت	
خاندان وتعلیم	
مشہور اساتذہ	
تعلیمی وملی خدمات: عمومی جائزہ	
قرآن مجید کی خصوصی تعلیم	
علامہ سید سلیمان ندویؒ کا قرآنی ذوق	
ترجمۂ قرآن کا ادبی پہلو	
علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر مترجمین کے تراجم کا تقابلی مطالعہ	
پہلا نمونہ	
دوسرا نمونہ	
تیسرا نمونہ	
آیات قرآنی اور فہم سلیمانی : چند نمونے	

قرآن کی تفسیر قرآن سے	
قرآن کی تفسیر حدیث سے	
مقاطع آیات	
آیات قرآنی کا باہمی ربط	
عمود قرآن	
تحقیق الفاظ کی ندرت	
تفسیری نکات	
علامہ سید سلیمان ندویؒ کا درس قرآن	
علامہ سید سلیمان ندویؒ کے درس قرآن کی خصوصیات	
علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریری قرآنی خدمات	
قرآن اور تجدد پسند مسلمان	
غیر معمولی مقبولیت	
باب دوم قرآنی استناد مکاتیب وخطوط میں	
مکاتیب سلیمان (مرتبہ مولانا مسعود عالم ندویؒ)	
مکتوبات سلیمانی (مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)	
تذکرۂ سلیمان (مرتبہ ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادیؒ)	
خطوط سلیمان (مخطوطہ) بنام مولانا محمد اویس ندویؒ	
مشاہیر علمائے ہند کے علمی مراسلے (مرتبہ مفتی ظفیر الدین مفتاحی)	
خطوط سلیمانی (مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری)	
بریدفرنگ (مؤلفہ علامہ سید سلیمان ندوی)	
متفرق تحریروں میں قرآنی آیات کا برمحل استعمال	
باب سوم الفاظ قرآنی: تحقیق، ونکتہ آفرینی	
اسماء حسنی	

اللہ	
رحمان	
رب العالمین	
فله الأسماء الحسنى	
صفات جمالی	
صفات جلالی	
صفات کمالی	
صفات وجودی	
علم	
قدرت	
تنزیہہ	
اسماء قرآن	
قرآن	
فرقان	
ومهيمنا عليه	
وإنا له لحافظون	
اعلام القرآن	
لقمان	
صالح	
آزر	
اسماعیل	
ایوب	
مریم بنت عمران واخت ہارون	
عزیرابن اللہ	
ملائکہ	

جبریل	
میکائیل	
جن	
نبی	
اقوام قرآن	
عاد	
آل ابراھیم	
ثمود	
أصحاب الأیکہ	
أصحاب الرس	
أصحاب الحجر	
اصحاب الأخدود	
تبع	
أصحاب الفیل	
قریش	
غلبت الروم في أدنىٰ الأرض	
والذين آووا و نصروا	
یہود	
المجوس	
امکنہ قرآن	
مدین	
سباوملکۂ سبا	
کعبہ	
وادغیر ذی زرع (یاعرب)	
مکہ یابکہ	

یثرب	
طائف	
اِمام مبین	
الفاظ قرآن	
شرح صدر	
خاتم	
مبشراًونذیراً	
حُلم اوررویا	
الہام	
وحی	
اسرا	
علم لدنی	
علم وحکم	
تبیین کتاب	
حکمت	
تزکیہ	
تقویٰ	
اخلاص	
توکل	
صبر	
شُکر	
حمد	
انفاق	
امانت	
رحم	

عدل	
عہداورعقد	
احسان	
معروف اور بر	
رفق ولطف	
اواہ	
خفض جناح (تواضع)	
استقامت	
استغناء	
استخلاف	
ذبح عظیم	
ایمان بالغیب	
البلاغ المبین	
حکمت،موعظہ،مجادلہ	
قول لین	
شھد	
اَیامامعدودات	
فمن شھد منکم الشھرفلیصمہ	
عضین	
تختانون	
غُلف	
ذنب،اثم	
کفر	
فحشاء،منکراوربغی	
زُوراوراِفک	

خیانت	
نقض عہد	
استراق سمع	
خمر (شراب)	
خلیفہ	
کبر وغرور	
خود بینی، خودنمائی (أعجبتكم كثرتكم)	
ریا (الذين هم يراؤون)	
حسد (أم يحسدون الناس)	
جہاد	
ظلم	
خلق جدید	
برزخ	
علم الیقین وعین الیقین	
أمتنا اثنتين وأحييتنا اثنتين	
سکرۃ الموت	
اقرأ كتابك	
نفخ الصور (صور قیامت)	
میزان	
حساب	
دارالسلام	
رحمة الله	
نورهم يسعى	
رضوان	
طبتم فادخلوها خالدين	

سبحانك اللّٰهم	
جزاؤهم عند ربهم	
وجوه يومئذ ناضرة	
ختم الله على قلوبهم	
أساطير الأولين	
ربا	
ضلالت	
دلوک	
اطراف النہار	
وعلى الذين يطيقونه	
لعنت	
شدید	
قوامون على النساء	
والجار ذى القربى	
وأما السآئل فلاتنهر	
العزۃ	
أعدوا لهم ما استطعتم من قوة	
الغائط	
لباس التقوىٰ	
حسنة الدنيا والآخرة	
متفرقات قرآن	
حنیف	
شرک	
دہریت	
صابی	

اللات	
العزّی	
مناۃ	
ود	
سواع	
یعوق	
یغوث	
نسر	
بعل	
بحیرہ،سائبہ،وصیلہ، حام	
لسان عربی مبین	
ھدھد	
باب چھارم تفسیری نکات	
نکات سورہ فاتحہ	
أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم	
بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم	
الحمدُ للّٰہ	
رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالك یوم الدین.	
إیاك نعبد و إیا ك نستعین.	
اھدنا الصراط المستقیم.	
صراط الذین انعمت علیھم	
غیر المغضوب علیھم ولاالضالّین	
متفرق نکات	
اسلام کی جامعیت	

دنیا کی ساری چیزوں کی غرض وغایت	
اسماء حسنی کی معنویت	
ایک لطیف نکتہ	
رسالت کی حقیقت اوراس کے شرائط	
نبی اور غیر نبی کے امتیازات	
تین روحانی ذرائع	
غیب کی حقیقت	
علوم نبوی کی قسمیں	
نبی کا مشن	
نبی کی دو بعثتیں	
نبی کی یقینی کامیابی	
رسول اللہ (ﷺ) کی شان عبدیت	
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی القبلتین ہونا	
ہجرت اور عذاب	
حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت ﷺ کے واقعات اور حالات میں مماثلت	
شق صدر کیفیت، اوراس کا تعدد	
ضمائر کے استعمال میں نکتہ سنجی	
رسول اللہ (ﷺ) کے اجتہادی امور	
انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ	
قرآن مجید میں آپؐ کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے؟	
قرآن معجزہ ہے،لغوی بھی اور معنوی بھی	
نماز پنج گانہ کی فرضیت	
اسلامی اوقات نماز	
جمع بین الصلاتین	
ایام روزہ کی تحدید	

روزہ کی مشروعیت	
اسلام کے ارکان پنج گانہ اور اخلاق	
امانت عظمیٰ کا حق	
فقہ اسلامی کا مدار	
ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک	
تعلیم اخلاق کا تنوع	
قانون اور اخلاق	
نکاح کے برکات	
صلہ رحمی	
یتیموں کے حقوق	
احسان کی وسعت	
حلم و بردباری	
خودداری کا اعلیٰ درجہ	
جھوٹ برائیوں کا مجموعہ	
چغل خوری قتل کا پیش خیمہ	
باہمی تعلقات برقرار رکھنے کا ذریعہ	
بخل کی وسعت	
غصہ پر قابو پانے کے طریقے	
اسلامی سلام اور غیر اسلامی سلام	
دن میں عربوں کے آرام کا وقت	
لباس کے دو مقصد	
کتاب اور میزان	
لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل	
باغ جنت کا استعارہ	
مراجع کتاب	
اشاریہ	

عرض ناشر

جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد بن عبد اللّٰہ الأمین، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد.

قرآن کریم اپنی زبان وبیان اور مضامین کے اعتبار سے ہر زمانہ میں بحث وتحقیق کا موضوع رہا ہے، اس لیے کہ وہ عربی میں نازل ہونے کے باوجود ہر دور اور ہر قوم کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے ﴿لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ [سورہ انبیاء:۱۰] ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے، کیا تم نہیں سمجھتے، دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَى عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [سورہ اعراف:۵۲] اور ہم نے ان کے پاس کتاب پہنچادی ہے، جس کو علم ودانش کے ساتھ کھول کھول کر بیان کردیا ہے، اور مومنوں کے لیے ہدایت ورحمت ہے، ایک دوسری خصوصیت کی طرف اشارہ اس طرح کیا گیا ہے ﴿تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [سورہ یوسف:۱-۲] یہ کتاب روشن کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا، تاکہ تم سمجھ سکو۔

قرآن فہمی کے لیے عرب قوم کے جو اس کے مخاطب اول ہیں، مزاج، فہم، تاریخ، عربی زبان، لغات اور محاورات کے علم سے واقفیت بہت ضروری ہے، محض کتب تفاسیر اور تراجم سے استفادہ کافی نہیں، مصر کے مشہور ادیب سید قطب صاحب ''فی ظلال القرآن''

نے ''التصویر الفني في القرآن'' میں اپنا تجربہ ذکر کیا ہے کہ جب اس ذوق اور علم کو بنیاد بنا کر قرآن کریم کا مطالعہ کیا تو اور زیادہ لطف محسوس ہوا اور فہم قرآن میں مدد ملی۔

لغات قرآن پر متقدمین میں ابن قتیبہ، ابن سلام جمحی اور ابوعبیدہ کی متعدد کتابیں ہیں، یہ صرف لغات کا علم نہیں رکھتے تھے، بلکہ عربوں کے مزاج، ان کے محاورات، بیان اور فہم بیان کا اعلی ذوق رکھتے تھے۔

پیش نظر کتاب علامہ سید سلیمان ندوی کے قرآنی نکات پر مشتمل ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کو اہل تفسیر سے تفسیر کا علم حاصل ہونے کے ساتھ عربی زبان وادب اور تاریخ وسیر کا بھی اعلی ذوق حاصل تھا، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فہم قرآن کے متعلق لکھتے ہیں:

''میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا، یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مؤرخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پایہ بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں، بلکہ تحتی براعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعۂ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو، اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان وادب اور بلاغت اور اعجاز قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع وعمیق تھا''۔(۱)

''سیرت النبی'' کے ساتھ ''ارض القرآن'' میں عربوں کی زبان وادب پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیقات مشہور مستشرقین کی آراء سے مختلف ہیں، نولڈیکی، مرگیولیوتھ اور دوسرے مغربی اہل قلم جنہوں نے عربوں کی زبان وادب کو اپنا موضوع بنایا، ان کی معروضات کو غلط فہمی قرار دیا، یہ کتاب عرب قبائل، اماکن اور ان کے عقائد وافکار کے بارے میں اہم مرجع ہے۔

اس کے علاوہ عربی زبان وادب سے ان کو گہری واقفیت حاصل تھی، اسی واقفیت

(۱) دعوت فکر وعمل، از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص:۱۸۷-۱۸۸، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، بار سوم، ۲۰۱۳ء

اور ذوق کی بنیاد پر قرآن شریف کی بعض تعبیرات پر ان کی اپنی رائے ہے، ان کو اپنے نسخہ قرآن میں تلاوت کے دوران متعدد مقامات پر نوٹ کیا ہے، اسی طرح اپنے مضامین میں قرآن کی بعض آیات سے استشہاد کیا ہے، یہ ذوق مولانا محمد اویس نگرامی (سابق استاد تفسیر قرآن دارالعلوم ندوۃ العلماء) اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی میں منتقل ہوا۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس ذوق کے حصول کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید سے ذاتی اور قوی تعلق، ربط ومناسبت اور اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ اور اس کے ذریعہ سے ترقی اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایک تجربہ اور مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے کلام اللہ سے براہ راست اشتغال اور متن قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جائے، اس سے لذت وذوق حاصل کیا جائے، اور اس کے معانی ومضامین میں تدبر سے کام لیا جائے، اگر بقدر ضرورت عربی زبان کی استعداد اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے تو براہ راست، ورنہ کسی معتبر ترجمہ اور مختصر حاشیہ کے ذریعہ، حتی الامکان انسانی تفہیم وتشریح کی مدد پر انحصار اور تفسیروں کی بار بار مراجعت کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت، اس کے سمجھنے اور اس کا لطف لینے کی کوشش کی جائے اور ایک عرصہ تک اس پر اکتفا کیا جائے اور توفیق خداوندی اور اعانت الٰہی سے جو کچھ میسر آئے اس پر ہزار زبان سے شکر کیا جائے، اس میں سوائے اضطراری موقعوں کے کہ کسی لفظ کی تحقیق، کسی شبہ کے ازالہ اور کسی سبب نزول کی واقفیت کے بغیر کام نہ چلتا ہو، کتب تفسیر (عربی واردو) کی تفصیلی بحثوں، مفسرین ومصنفین کی دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں سے پرہیز کیا جائے کہ بعض اوقات قرآن مجید کے چشمہ صافی پر انسانی عقول وعلوم کا ایسا سایہ پڑجاتا ہے جیسا کہ کسی صاف شفاف چشمہ پر کنارے کے درختوں کے گھنے سایہ کا، اور پھر اس میں وہ لطافت واصلیت اور کلام الٰہی کی حلاوت ولذت باقی نہیں رہتی جو اس کی اصل جان ہے''۔(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے مضامین میں قرآن کریم سے استشہاد کیا

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی، ص:۱۹۲، مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۶ء۔

اور جو نئے نکات سامنے آئے، وہ ''قرآنی افادات'' کے نام سے دوجلدوں میں شائع کیے گئے جو بہت مقبول ہوئے۔

تدبر قرآن میں اور قرآن کے مفہوم کی ادائیگی میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ذاتی فکر کی بنیاد پر اجماعِ امت کی آراء سے انحراف نہ ہو، اس لیے کہ جو رائے اجماع امت سے ٹکرائے گی وہ رد کردی جائے گی، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے چونکہ اپنے عصر کے اساتذۂ تفسیر سے خصوصی استفادہ کیا تھا، اور ان کا حدیث نبوی وسیرت نبوی اور احوال صحابہ سے خصوصی گہرا تعلق رہا، اس لیے ان کے یہاں اس طرح کی نزاکت کا بہت خیال رکھا گیا ہے اور ان کے یہاں اس کی احتیاطیں ملتی ہیں۔

میری معلومات کی حد تک سید سلیمان ندوی کی تفسیری خدمات پر کام نہیں ہوا تھا، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے مولانا سید محمد اجتباء حسینی ندویؒ کی سرپرستی میں یہ کام مولوی محمد فرمان ندویؒ کے سپرد کیا، ابتدائی کام مولانا محمد اجتباء حسینی ندوی کی نگرانی میں ہوا، ان کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی کے صاحبزادہ گرامی قدر ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے مشورہ سے جاری رہا، اس طرح یہ ایک وقیع تصنیف ہوگئی، جو آپ کے ہاتھ میں ہے، اس کے متعدد مضامین عربی میں ''البعث الاسلامی'' میں شائع ہوچکے ہیں۔

پیش نظر کتاب پر ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور برادر گرامی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے گراں قدر مقدمے ہیں، جن سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اس سعادت میں شرکت کی غرض سے مولوی محمد فرمان ندوی کی فرمائش پر یہ چند سطریں لکھی جارہی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو قرآن فہمی اور ذوق تلاوت میں اضافہ کا سبب بنائے (آمین)

یکم صفر ۱۴۳۶ھ
۱۴؍نومبر ۲۰۱۴ء

محمد واضح رشید حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنو

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء وامام المرسلین محمد وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین ، أما بعد :

انسان کی کلامی صلاحیت اس کے خالق ومالک رب العالمین کی طرف سے عطا کردہ بڑی نعمت ہے، اس کے ذریعہ انسان صرف اپنی ضرورت کا اظہار ہی نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی اور دیگر انسان کی نفسیاتی کیفیتوں کو بھی ادا کرتا ہے، معلومات کا اظہار انسان کی معلوماتی ضرورت کو پورا کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ انسان کو معلومات میں اضافہ ووسعت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، جس سے انسان اپنی عقل کی مدد سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے بہت سے مقاصد حاصل کرتا ہے، یہ فائدہ ایسا فائدہ ہے جس کی بنا پر انسان کو دیگر مخلوقات پر امتیاز حاصل ہوا، یہ امتیاز ایسا امتیاز ہے جس کا ذکر اللہ رب العالمین نے انسان پر اپنے خصوصی انعام کے طور پر کیا ہے، یہ امتیازی خصوصیت انسان کو صلاحیت کلام سے حاصل ہوتی ہے، اس طرح کلام انسانی انسان کی ترقیات کا بڑا ذریعہ بنتا ہے، یہ کلام انسانی جہاں معلومات کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے، وہاں بطور مزید انسانی کیفیات کی بھی عکاسی کرتا ہے، یہ کیفیات زبان کے الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہیں، اور زبان ہی کے مختلف الفاظ میں وہ پائی جاتی ہیں، انسان اس عکاسی کے ذریعہ احساسات کی ترجمانی کرتا ہے، اور دوسرے کے احساسات کو متأثر بھی کرتا ہے، انسانی کلام میں یہ دونوں پہلو پائے جاتے

ہیں، ان دونوں میں سے جو پہلو اختیار کیا جاتا ہے، اس کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، متأثر کرنے کے پہلو کے لئے مخاطب کی نفسیات کے لحاظ سے کیفیات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے مطابق الفاظ کا انتخاب اور ترتیب کلام اختیار کرنا ہوتا ہے۔

انسان کی نفسیات کو اس کا خالق ومالک رب العزت سب سے زیادہ جانتا ہے، وہ جب انسان کو اس کی نفسیات کی رعایت کے لحاظ سے مخاطب ہو تو اس کی نفسیات پر اس کا اثر کتنا پڑے گا، یہ کسی سے مخفی نہیں۔

قرآن مجید میں انسان سے مخاطبت عربی زبان میں کی گئی ہے، نزول قرآن کے موقع پر عرب اپنی زبان کے ان الفاظ اور ان کی اثر انگیز ترتیب کو جس طرح سمجھتے اور محسوس کرتے تھے، اس کی رعایت رکھی گئی ہے، جس کے نتیجہ میں اس کے کلام کے سننے والے اس طرح متأثر ہوتے تھے کہ ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا تھا، مثلاً دو ایک الفاظ کو کیفیت کے لحاظ سے دیکھئے: ہوا کے لئے عربی میں ریح کا لفظ ہے، اس کی جمع ریاح آتی ہے، قرآن مجید میں جہاں راحت پہونچانے والی ہوا کا ذکر ہے، جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اور جہاں مصیبت لانے والی ہوا کا ذکر ہے تو اس کا مفرد ریح استعمال ہوا ہے، اسی طرح نعمت کا لفظ راحت وآرام کے لئے ہے، قرآن مجید میں جہاں صرف دنیاوی آرام ولطف کے لئے استعمال ہوا ہے، نون کے زیر کے ساتھ استعمال ہوا ہے، اور جہاں آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا دلانے والے آرام ولطف کے لئے استعمال ہوا ہے، وہاں ن کے زبر کے ساتھ ہوا ہے۔

قرآن مجید کی اثر انگیزی کے اس پہلو سے واقف لوگ قرآن مجید سے وہی اثر لیتے ہیں، جو مطلوب ہے، نزول قرآن کے زمانہ کے بعد آنے والے حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر وتشریح میں اس سلسلہ کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی اس تشریح وتفسیر پر خود اس زمانہ کی رائج خصوصیات کا بھی اثر پڑا ہے، لیکن جن حضرات نے نزول قرآن کے زمانہ کے لوگوں کے احساسات ونفسیات کو بہتر طریقہ سے سمجھا ہے، انہوں نے بہت مفید باتیں ظاہر کی ہیں، ایسے حضرات میں دور جدید کے علماء میں حضرت مولانا

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کو بڑی خصوصیات حاصل رہی ہے، انہوں نے باقاعدہ کوئی تفسیر نہیں لکھی، لیکن ان کی تصنیفات میں جگہ جگہ ایسے موقع آئے ہیں کہ انہوں نے الفاظ قرآن کی ان خصوصیات کے مطابق مطالب کی وضاحت کی ہے، ان کے ان افادات کو دار العلوم کے استاذ مولوی محمد فرمان ندوی نے جمع کیا ہے، جو قرآن فہمی کا مقصد رکھنے والوں کے لئے استفادہ کا بڑا ذریعہ ہیں، مولوی محمد فرمان صاحب نے اس طرح ایک بیش قیمت کام انجام دیا ہے، جو قابل قدر ہے، امید ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

۱۴۳۵/۱۲/۲۴ھ — سید محمد رابع حسنی ندوی

۲۰۱۴/۱۰/۲۰ء — ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تقریظ

بقلم: جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی

(صاحبزادہ علامہ سید سلیمان ندویؒ)

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین، محمد وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین، أما بعد:

قرآن پاک ایک ایسا معجزہ ہے، جس کی مثال دنیائے مذاہب پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ صرف قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ وہ اپنی اصل عربی زبان میں محفوظ ہے، قرآن کے محفوظ ہونے اور اس کی دائمی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" [سورۂ حجر: ۱۵-۹] کہہ کر کیا ہے، چنانچہ قرآن کے معانی ومطالب اور اس کی تفسیر پر مشتمل ایک عظیم ذخیرہ جمع ہوتا رہا ہے، اور جب تک دنیا قائم ہے ہوتا رہے گا۔

قرآن کے معانی ومطالب کا صحیح فہم اللہ تعالیٰ کی دین ہے، قرآن کے صحیح معانی ومطالب کے لئے فکر سلیم اور قلب سلیم کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے والد ماجد علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۹۵۳م) کو فہم قرآن کا عجیب کمال عطا فرمایا تھا، سورتوں کا عمود، ربط آیات کے معانی کی تشریح چھوٹے چھوٹے مگر بلیغ اشاروں سے اس طرح فرماتے تھے کہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، خود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۹۹ء) نے کئی بار مختلف جگہوں پر اظہار کیا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اصل علمی ذوق وشغف قرآن کریم اور اس کے معانی سے تھا، حسب ذیل چند مثالوں سے بات واضح

ہو جائے گی، تفصیل تو مصنف کتاب کی تحریر میں مل جائے گی۔

سورۂ بقرہ کی آیات ربا[۲۷۵ تا ۲۷۶] کا اختتام "واللہ لا يحب كل كفار أثيم" پر ہے، اس پر حاشیہ دیا ہے کہ أخذ الربا كفر النعمة يعني كفر نعمة ربهم. اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت دی ہے اس کا غلط استعمال یا غلط فائدہ اٹھانا کفر نعمت الٰہی ہے، سورۂ بنی اسرائیل کی آیات[۹۰ تا ۹۳] میں کفار کا یہ اعلان ہے کہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، جب تک آپ کا گھر سونے کا بنا ہوا نہ ہو، چاہے آپ آسمان پر چڑھنے کا دعویٰ بھی کرلیں، اس آیت کا آخری ٹکڑا ہے: "لن نؤمن لرقيك حتىٰ تنزل علينا كتاباً نقرؤه" اس پر حاشیہ دیا: "تدل الآية علىٰ أن النبي ﷺ ادعىٰ الرقي في السماء" سورۂ بنی اسرائیل کا عمود بھی معراج ہی کو بتایا ہے، اس طرح سورۂ ہود کے عمود کا اظہار اس عبارت سے کیا ہے: "هذه السورة تسلية للنبي ﷺ". اس سورت میں مختلف انبیاء اور ان انبیاء کو اپنی قوموں میں جن مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح سورۂ حجر[۱۵] کی آیات ۴۲ تا ۴۷ پڑھا جائے تو اس کا اختتام "إن اللہ عزيز ذو انتقام" پر ہے، عام طور سے انتقام کا لفظ دیکھ کر بدلہ لینے کا ترجمہ ذہن میں آتا ہے، حاشیہ سلیمانی ہے: "الانتقام أخذ الحق من الظالم للمظلوم". اس حاشیہ سے مطلب واضح ہو جاتا ہے، مصنف کتاب نے بڑی محنت کے ساتھ نکات سلیمانی کو جمع کیا ہے۔

عزیزی محمد فرمان ندوی ایک عرصہ سے والد ماجد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (م۱۹۵۳ء) کے قرآنی نکات مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے زیر اہتمام جمع کررہے ہیں، اور اس کی طرف رہنمائی مکرمی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور برادر مکرم مولانا واضح رشید صاحب معتمد ندوۃ العلماء نے کی۔ وہ اس کے ایک باب کو اپنے تشریحی نوٹس کے ساتھ ندوۃ العلماء کے عربی مجلّہ البعث الاسلامی میں شائع کرتے رہے ہیں، اب پورے مجموعہ تفسیری نکات کو کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ فرمان ندوی صاحب کا اصرار ہے کہ میں اس کتاب پر پیش لفظ کے طور پر چند سطریں لکھوں، میں اس

وقت حالت سفر میں ہوں، پھر بھی قلم برداشتہ چند سطریں پیش ہیں۔

عزیزی محمد فرمان ندوی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ ان نکات کو علامہ سید سلیمان ندوی کی مختلف کتابوں اور تصنیفات سے مدون کیا ہے، اور سلیقہ کے ساتھ ایک بڑا ذخیرہ جمع کردیا ہے، ان نکات سے حضرت علامہ کی قرآن فہمی کا اندازہ ہوگا۔

اس سلسلہ کی یہ پہلی کتاب ہے، امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ اس سلسلہ کو اور آگے بڑھائیں گے اور حسب توفیق دوسری جلد پر بھی کام مکمل کرلیں گے۔ وما ذلك على الله بعزيز.

سید سلمان ندوی
حال مقیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۷/۱/۱۴۳۴ھ
۱۳/۱۲/۲۰۱۲ء

پیش لفظ

جناب مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مدیر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین. أما بعد؛

علامہ سید سلیمان ندویؒ بیسویں صدی کے نہایت بلند پایہ عالم دین، محقق اور سیرت نگار تھے، وہ دین ودنیا کی فکر کے جامع تھے، ان کا شمار اس عصر کی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے، وہ ایک طرف زبردست عالم دین، اسلام کے داعی، مفکر اور محقق وادیب تھے تو دوسری طرف سیاسی بصیرت میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ملی غیرت، حالات حاضرہ پر مبصرانہ اور گہری نظر ان کا طرۂ امتیاز تھا، وہ داعیانہ صفات کے ساتھ قائدانہ صلاحیتوں کے پوری طرح جامع تھے، اور ان تمام خصوصیات میں متوازن فکر اور طریقۂ عمل ان کا خاص وصف سمجھا جاتا تھا، وہ تحریک ندوۃ العلماء کے روح رواں، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے قلب وزبان، اور دارالقضاء بھوپال کے رئیس القضاۃ تھے، علمی اور تحقیقی صحافت، زبان وبیان کی مہارت اور ادب وانشاء کی لطافت میں ان کا مقام بہت بلند تھا، علم کی پختگی، مطالعہ کی وسعت اور کتاب وسنت پر گہری نظر کے ساتھ ورع وتقوی، تواضع اور کسر نفسی اور تعلق باللہ کا ایک حسین امتزاج ان کی زندگی میں موجود تھا، سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور قابل ذکر وصف ان کی یہی جامعیت ہے، جیسا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سید صاحب پر اپنے

تأثرات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء میں ان کی جامعیت ہے اور ان کے علوم ومضامین کا تنوع ہے، ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم وجدید کی واقفیت، علمی تبحر اور ادبی ذوق، نقاد ومورخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء وانشاء پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر ونظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہوگئی تھی جو شاذ ونادر جمع ہوتی ہے۔''

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور پانچ سال احاطۂ دارالعلوم میں رہ کر سند فراغت حاصل کی، ندوہ میں آپ کے اساتذہ میں مفتی عبداللطیف سنبھلی، سید علی زینبی، مولانا شبلی فقیہ جیراجپوری، مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ قابل ذکر ہیں، ۱۹۰۷ء میں ندوہ العلماء سے فارغ ہونے والے طلباء کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہِ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوا، اس میں سید صاحب نے ''علوم قدیم وجدید کے موازنہ'' پر اردو میں تقریر کی، پھر حاضرین کے مطالبہ پر عربی میں بھی برجستہ تقریر کی، جس سے لوگوں پر خاص اثر ہوا، خواجہ غلام الثقلین جلسہ میں موجود تھے، انہوں نے امتحاناً سید صاحب کے لئے ایک موضوع: ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہو؟'' منتخب کیا، سید صاحب نے بلا کسی توقف کے عربی میں ایسی مؤثر تقریر کی کہ اُحسنت اور آفریں کی صدائیں بلند ہونے لگیں، ۱۹۰۶ء میں فارغ ہوتے ہی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریض پر ''الندوہ'' کی سب ایڈیٹری ان کے سپرد کی گئی، اور متعدد علمی وتحقیقی موضوعات پر مضامین لکھا، سید صاحب نے ۱۹۰۵ء میں ''علم حدیث'' کے موضوع پر ایک ایسا مؤثر مضمون لکھا جو بہت مقبول ہوا، ۱۹۰۸ء میں حضرت سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد مقرر ہوئے، اور ضرورت کے پیش نظر ''دروس الأدب'' کے نام سے عربی کی دو ریڈریں مرتب کیں، جو بیشتر مدارس کے نصاب تعلیم کا جزء ہیں، ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ دہلی

میں طے ہوا کہ عربی کے نئے الفاظ کی ڈکشنری تیار کی جائے، چنانچہ سید صاحب نے دو برس کی جہد مسلسل کے بعد ''لغات جدیدہ'' کے نام سے ایک ڈکشنری تیار کی، اور وہ بھی مقبول خاص وعام ہوئی۔

سید سلیمان ندویؒ کا تعلق اگر چہ ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء سے ضابطہ کا نہیں رہا لیکن انہیں کلکتہ، پونا، اعظم گڑھ، بھوپال اور پاکستان کے دوران قیام اس کی سرگرمیوں سے غیر معمولی دلچسپی رہی، اور برابر ندوۃ العلماء کے احوال وکوائف سے واقف ہوکر مفید مشوروں سے نوازتے رہے، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد جب نواب علی حسن خاں صاحب کو ۲ر فروری ۱۹۲۳ء میں بحیثیت ناظم منتخب کیا گیا تو سید صاحب کو معتمد تعلیم کا عہدہ ملا، اور تا وفات ۱۹۵۳ء اسی عہدہ پر قائم رہ کر ندوۃ العلماء کی خدمت انجام دیتے رہے۔

سید صاحب کو ندوہ سے نہایت گہرا اور روحانی تعلق تھا، وہ دل وجان سے ندوہ کی خدمت اور اس کی فکر کو عام کرنے اور دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچانے کی سعی پیہم میں مشغول تھے، وہ دارالعلوم کے طلباء کو جس علمی اور فکری بلندی پر لے جانا چاہتے تھے، اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے، اور وہ نہ صرف اپنے شاگردوں بلکہ اس وقت کے تمام علمی حلقوں سے بھی وابستہ تھے، وہ دارالعلوم میں عربی زبان وادب کو اہل زبان کی طرح رواج دینے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرتے تھے، وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ ندوہ صرف زبان ہوشمند ہے، بلکہ وہ ندوہ کو ایک عظیم المرتبت اور نمونہ کی علمی اور فکری تحریک سمجھتے تھے، جہاں سے عربی زبان وادب کے سوتے پھوٹیں اور ندوہ میں عربی زبان وادب کے ماہرین علماء پیدا ہوں، تا کہ وہ براہ راست کتاب وسنت کی زبان اور اس کے معانی کے نکتہ داں ہوں، اور وہ عربی زبان کو ایک زندہ اور متحرک اور تعبیری صلاحیتوں سے بھرپور زبان سمجھ کر علوم اسلامیہ کے ماہرین علماء، ادباء، دعاۃ ومفکرین کی حیثیت سے سارے عالم میں متعارف ہوں۔

اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ندوہ کو اپنی تمناؤں کی اصل آماجگاہ

بنایا اور زیادہ سے زیادہ قیام کیا، وہ علم وعمل کی جامع علماء کی ایک فوج تیار کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے معتمد تعلیم کا عہدہ قبول فرمایا، اور فکر وعقیدہ کی گہرائی اور علم وعمل کی جامعیت، زبان وادب کے امتزاج سے ندوہ کو ایک صحیح اور بامقصد سمت عطا کی، اور ندوہ کے بارے میں اہل علم کے طبقہ میں حسن ظن پیدا کرنے کے نقطہ پر اپنی توجہات کو مرکوز کیا، اور علماء ودانشوران قوم کے طبقہ میں ندوہ کی ضرورت اور اس کی افادیت کا یقین پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی، اور تاسیس ندوہ کے ابتدائی سالوں میں اس کو متہم کرنے اور اس کے فضلاء کو ملحد وبے دین قرار دینے کا جو فیشن چل پڑا تھا، اس میں بہت حد تک کمی آئی۔

سید صاحب اپنے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد بھی ندوہ سے اسی طرح منسلک اور اس کو شجر پھل دار بنانے کی کوششوں میں مصروف رہے، وہاں کے علماء اور عامۃ المسلمین کو ندوہ کی حقیقت سے آگاہ کیا، اور اپنی عظیم شخصیت کے بہترین علمی اور فکری نقوش چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوکر آخرت کی راہ لی، اور تاحیات معتمد تعلیم کے عہدہ پر فائز رہے، اپنی وفات سے کچھ ہی دن پہلے مشرقی پاکستان سے واپس ہوتے ہوئے ندوہ تشریف لائے اور کئی دن تک ندوہ میں قیام فرمایا، افسوس کہ اس زمانہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان تشریف لے گئے تھے، سید صاحب کو افسوس رہا کہ ملاقات نہ ہو سکی، اور یہ مصرعہ دہرایا: ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا

اس وقت کے ندوہ کے ذمہ دار حضرات نے خاص طور سے حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری علیہ الرحمہ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے سید صاحب کے استقبال میں ایک جلسہ مسجد دارالعلوم میں منعقد کیا، اس میں سید صاحب نے طلباء اور اساتذہ سبھی حضرات کو حال ومستقبل کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی میں تعمق پیدا کریں، اور

اس کے ترجمان بننے کی کوشش کریں، تاکہ ہم اللہ کی شریعت کا جیتا جاگتا نمونہ اپنی زندگیوں میں لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں۔

سید صاحب کے بارے میں ان کے صاحبزادہ مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی (سابق صدر شعبہ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ) مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی صاحب کی کتاب ''علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت وادبی خدمات'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''سید صاحبؒ کو جاننے والے اور ان سے ملنے والے یہ جانتے ہیں کہ ان کا علمی مقام بہت بلند تھا، اور ان کی جامعیت تو اس دور میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ سید صاحبؒ کا اصل علمی ذوق قرآن وحدیث وعلم کلام کا تھا، خود سید صاحبؒ کے بقول کہ تاریخ تو علمی دسترخوان کی چٹنی ہے جو صرف منھ کا مزہ بدلنے کے لئے ہے، سید صاحبؒ نے اگرچہ قرآن پر یا حدیث پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی، پھر بھی ان کے تفسیری نکات اور حدیث کی تشریحات سیرت النبی ﷺ، سیرت عائشہ ؓ اور ارض القرآن وغیرہ میں تفصیل سے موجود ہیں، اگر کوئی سید صاحبؒ کی ان تفسیری نکات و حدیث کی تشریحات کو ان کی علمی تصنیفات سے علیحدہ جمع کرکے ان پر کام کرے اور پھر ان کو شائع کرے تو یہ خود ایک مستقل اور قیمتی کام ہے''۔

یہ ساری باتیں بلکہ ان سے بہت زیادہ سید صاحب کے مطالعۂ قرآن کے ضمن میں موجود ہیں، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے ذمہ داروں نے سید صاحب کے تفسیری نکات کو جمع کرنے کی طرف توجہ دی، اور دارالعلوم کے استاذ مولوی محمد فرمان ندوی کو مکلّف کیا کہ وہ ان شہ پاروں کو جمع کریں، چنانچہ انہوں نے بڑی محنت سے ان نکات کو جمع کیا ہے، اور میرے مشورے سے اس کے حصہ "مفردات القرآن للعلامة السيد سليمان الندوي" کو عربی میں منتقل کیا، جو البعث الاسلامی کی ۵۰ رقسطوں میں شائع ہوا، مزید سید صاحب کے ذاتی نسخہ قرآن میں جو تشریحات تھیں ان کو بھی جمع کیا ہے، وہ بھی "تفسير القرآن بالقرآن" البعث میں شائع ہورہی ہیں۔

مجھے انتہائی مسرت ہے کہ مولوی محمد فرمان ندوی صاحب نے سید صاحب کے قرآنی جواہر پاروں کو اردو زبان میں نہایت سلیقے اور بہتر ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے، یہ مجموعہ انشاءاللہ ایک مستقل تفسیر کا درجہ حاصل کرے گا، اور معتبر علماء سے خراج عقیدت حاصل کرے گا، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرمائیں اور اس کو نفع عام کا ذریعہ بنائیں۔

وصلى الله على خير خلقه سيدنا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين.

راقم الحروف

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مدیر البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۴۳۶/۱/۵ھ

۲۰۱۴/۱۰/۳۱ء

عرض حال

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وعلی آلہ وأصحابہ ومن تبعھم أجمعین. أما بعد :

۱۴۲۴ھ میں یہ ناچیز المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تھا کہ مؤرخہ ۲؍صفر ۱۴۲۴ مطابق ۵/۵/۲۰۰۳ء مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کی طرف سے ایک اعلان نظر نواز ہوا: اس علمی وتحقیقی ادارہ میں نوجوان فضلاء کی تربیت کے لئے دوندوی فاضل کا انتخاب ہوگا، یہ انتخاب انٹرویو کی بنیاد پر ہوگا، وقت مقررہ پر خواہشمند افراد حاضر ہوئے ،انٹرویو میں قرعۂ فال اس ناچیز کے نام بھی نکلا، اسی دن مجلس کے انچارج کی طرف سے ایک رقعہ ملا: جس میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی کہ ''اطلاعاً تحریر ہے کہ مجلس تحقیقات میں علمی وتحقیقی کام کے سلسلہ میں آپ کا انتخاب ہوا ہے، آپ کے تحقیقی کام کا موضوع درج ذیل ہے :

''علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تمام تصنیفات میں تفسیری آیات کی تدوین'' آپ کے مشرف مولانا سید محمد اجتباء حسینی ندوی ہیں''۔

اس مژدہ کو سنتے ہی فطری طور پر خوشی محسوس ہوئی، اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا کہ اس کی توفیق سے یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔

مشرف مکرم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے موضوع کی مزید وضاحت کی، فوری طور پر تمہیدی کلمات لکھ کر پیش کرنے کا حکم دیا، اللہ تعالی کی توفیق سے یہ معاملہ بھی بآسانی طے ہوگیا، مشرف مکرم کی خصوصی توجہ اور ہر گام پر رہنمائی سے کام کی رفتار تیز رہی، اور سال کے آخر تک اچھا خاصا مواد اکٹھا ہوگیا، حضرت سید صاحبؒ کی تمام تصنیفات جو مستقل کتاب، کتابچے اور رسائل کی شکل میں شائع ہوئے تھے ان کو دیکھا، کھنگھالا، مجلّات اور

جرائد نیز مکتوبات وغیرہ کو بھی دیکھا، اس درمیان دارالمصنفین اعظم گڑھ، اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کا بھی سفر کیا، اور وہاں سے مواد جمع کرنے کی کوشش کی، سال کا اختتام ہوا، دارالعلوم سے تدریسی وابستگی ہوئی، اس طرح جمع شدہ مواد کو مکمل شکل میں پیش کرنے میں تاخیر ہوتی رہی، یہاں تک کہ مشرف مکرم مولانا ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی ۲۰ جون ۲۰۰۸ء کو دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید محمد اجتباء حسینی ندویؒ کی شخصیت حسن تربیت کا اعلی نمونہ تھی، اللہ رب العزت نے انہیں علم وادب کا حصہ وافر عطا فرمایا تھا، پوری زندگی تدریس میں گزری، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے خوب کسب فیض کیا، اور حضرت ہی کے مشورہ سے دمشق یونیورسٹی بھی اعلی تعلیم کے لئے گئے، اس کے بعد جامعۃ الامام محمد بن سعود، ریاض، اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، کشمیر یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دی، وہ عربی کے ایک باکمال ادیب تھے، اس طرح ان کی زندگی وسیع تجربات پر مشتمل تھی، اور بقول حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی: ''عزیزی مولوی محمد اجتباء ندوی کو ایک خصوصیت یہ حاصل رہی کہ انہوں نے عالم اسلام کی اہم اور چوٹی کی شخصیات سے استفادہ کیا''۔(۱)

مرکزی موضوع کے ماتحت جب مواد جمع کیا گیا تو کئی جلدوں میں مسودات تیار ہوئے، اور یہ خیال دامن گیر ہوا کہ صرف تفسیری آیات کی تدوین سے کتاب ضخیم ہوجائے گی، کیونکہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنی تصنیفات میں قرآن ہی کے معانی کی تشریح کی ہے، اس لئے ذمہ داروں کے مشورے سے یہی مناسب سمجھا گیا کہ الفاظ قرآنی کی تحقیق، اہم تفسیری مباحث اور نکات قرآنی کو جمع کیا جائے۔

حالیہ تین برسوں میں ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے ماہنامہ البعث الاسلامی میں جمع شدہ مواد کا ایک حصہ عربی میں شائع ہوا، لیکن چونکہ اصل مواد اردو میں تھا،

(۱) یادوں کے چراغ ص۳۲۲۔

اس لئے فکر ہوئی کہ اس کو مرتب کر کے جلد از جلد قابل اشاعت بنایا جائے ،اللہ رب العزت کی توفیق اور بزرگوں کی خاص توجہات سے اس کی جلد اول مکمل ہوئی۔

کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا جائے ،جلد اول میں ضخامت کے خوف سے صرف چار ابواب شامل کئے گئے ہیں:

باب اول: علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ان کا تفسیری مزاج

باب دوم: قرآنی استناد- مکاتیب اور خطوط میں

باب سوم: الفاظ قرآنی: تحقیق ونکتہ آفرینی

باب چہارم: تفسیری نکات

بقیہ ابواب:

باب پنجم: تفسیری افادات (ہر موضوع کے اہم تفسیری مباحث)

باب ششم: حواشی قرآنی (سید صاحب کے نسخہ قرآن پر مکتوب قیمتی تفسیری اشارات)

باب ہفتم: سیرت نبوی قرآن کے آئینہ میں

دوسری جلد میں شامل ہوں گے۔

بڑی احسان ناشناسی ہوگی اگر اپنے مخدوم ومعظم ،صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے احسان عظیم کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آپ نے پورے مسودہ کو ملاحظہ فرما کر سید الطائفہ کے شایان شان مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں سید صاحب کی قرآن فہمی کا پورا خلاصہ آ گیا ہے۔

حضرت سید صاحب کے خلف الرشید جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی (مقیم حال ڈربن جنوبی افریقہ) کی معلومات افزا تقریظ کتاب کی زینت ہے، کام کے آغاز سے لے کر اس مرحلہ تک برابر آپ کی فکرمندی، اور رہنمائی لائق صد شکر ومستحق ہزار فخر ہے۔

مشرف مکرم کے انتقال کے بعد مجلس کے سکریٹری جنرل مخدوم ومحترم جناب مولانا سید محمد واضح رشید ندوی (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے صائب مشورے اور ہدایات اس

کام کو منظر عام پر لانے میں سنگ میل ثابت ہوئے ،مزید شفقت یہ رہی کہ اپنے کلمات عالیہ کے ذریعہ سے کتاب کی قیمت میں اضافہ فرمایا، اللہ رب العزت جزائے خیر سے نوازیں۔

استاذ محترم جناب مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) کی ہدایت کے مطابق اس مجموعہ کے ایک حصہ کا عربی ترجمہ ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی تحقیقی ترجمان البعث الاسلامی میں شائع ہوا۔ کتاب کے اردو ایڈیشن کے لئے مخدوم ومکرم کے بیش قیمت کلمات حضرت سید صاحب کی زندگی اور کارناموں پر سند کا درجہ رکھتے ہیں، راقم استاذ محترم کا تہہ دل سے ممنون ہے، اور خصوصی توجہ وعنایت پر سراپا احسان مند ہے۔

موضوع کے انتخاب کے بعد راقم نے دار المصنفین اعظم گڑھ اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کا سفر کیا، دار المصنفین کے سابق ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ نے موضوع کو پسند کیا اور رہنمائی کی، اور اس کے بعد کئی بار دار المصنفین کے قیام میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور مولانا حافظ عمیر الصدیق ندوی کا بیش قیمت تعاون کام کو مکمل کرنے میں حوصلہ افزا ثابت ہوا۔

کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی، ندوۃ العلماء کے معاون علمی مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی کے علمی تعاون کا یہ ناچیز شکر گذار ہے۔ اسی طرح ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جن نے کسی طرح کا تعاون ملا، مجلس تحقیقات کے معاون انچارج کلام الدین ندوی نے طباعت کے سلسلہ میں خاصی محنت کی، پروف کی تصحیح میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے دو طلباء معصوم سیفی اور سیف النبی کا تعاون حاصل رہا، اللہ تعالی جزائے خیر سے نوازے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کوشش کو قبولیت سے سرفراز فرمائے، اور دارین میں فلاح وکامیابی مقدر فرمائے۔

راقم الحروف

محمد فرمان ندوی

(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

۱۴۳۶/۴/۲۴ھ

۲۰۱۵/۲/۱۱ء

تمہید

قرآن کریم ایک مقدس اور زندہ جاوید کتاب ہے، اس میں پوری زندگی کا صحیح نظام عمل پیش کیا گیا ہے، زندگی کے جملہ شعبہ جات میں اس کی رہنمائی موجود ہے، خواہ وہ عبادات کے شعبے ہوں یا معاملات کے، سیاسیات کے ہوں یا اخلاقیات کے، ہر درد کا درماں اور ہر مسئلہ کا حل اس میں موجود ہے، قرآن کی تعلیمات دنیا میں انقلاب لاسکتی ہیں، وہ قسمت کو چمکا سکتی ہیں اور انسان کو تحت الثری سے اٹھا کر ثریا تک پہونچا سکتی ہیں، بشرطیکہ انسان ان پر عمل کرے، عرب دنیا نزول قرآن کے وقت فقر وافلاس، بے شرمی وبے حیائی سے دوچار تھی، نہ کھانے کا سامان مہیا تھا اور نہ پینے کا پانی بسہولت انہیں میسر ہوتا تھا، انہیں اس کے لئے صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کرنی پڑتی تھی، لیکن قرآن کا معجزانہ اثر ہے کہ اس نے انہیں اقبالؔ کے الفاظ میں ''جہاں گیر وجہاں دار وجہاں بان وجہاں آرا'' بنادیا، اور بقول شاعر

خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

یہ نتیجہ تھا اسی کتاب الٰہی سے غایت درجہ تعلق کا، صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے قرآن سے گہرے تعلق کی بنا پر زبان نبوت نے ان کے ادوار کو ''خیر القرون'' کے لقب سے نوازا، جب وہ قرآن پڑھتے اور اپنی زندگی کو اس کے آئینہ میں دیکھتے اور اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موازنہ کرتے تو انہیں اپنی کمی کا احساس بے چین کردیتا، اور اصلاح حال کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرکے دوسروں کو بھی قرآن فہمی کی دعوت دیتے، اسی کا اثر تھا کہ بعد کی صدیوں میں قرآن کریم کے معانی ومطالب بیان کرنے کے لئے اہل علم

حضرات نے قلم اٹھایا، اور اپنے قلم سے حکمت ونصیحت، عبرت وموعظت، اور احکام ومسائل کی ایسی سوغات پیش کی، جس پر آج بھی تاریخ انسانی کو ناز ہے۔

چودہ صدیوں کے اس طویل عرصہ میں اسی جہد پیہم کو مفسرین ومحدثین، فقہاء اور اہل علم حضرات نے جاری رکھا، کہیں افق عالم پر ابن جریر طبری، امام زمخشری کہکشاں بن کر چمکے تو کہیں امام فخر الدین رازی، محمد قرطبی، ابن کثیر ستاروں کے جھرمٹ میں تابندہ نظر آئے، جنہوں نے گم کردۂ راہ انسانیت کے لئے اپنے آپ کو ''بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی'' کی حیثیت سے پیش کیا، اور امت کے بڑے طبقہ نے فائدہ اٹھایا، آفتاب اسلام جب برصغیر کے افق پر نمودار ہوا تو سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیوانے عاشق زار کی طرح لپکے اور میراث نبوی سے خوب خوب کسب فیض کیا، اور اس بحر کی شناوری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت وہ سنگِ میل ثابت ہوئی، جہاں سے راہ گیروں نے راہ لی، اور تاریخ کے صفحات پر شاہ عبدالقادر دہلویؒ، شاہ رفیع الدین، مولانا محمود الحسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا احمد علی لاہوری وغیرہم (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) اس طرح چمکے کہ ہر ایک کے لئے حجت وسند بن گئے، لیکن اسی بحر کی شناور ایک شخصیت تاریخ کے پردہ میں اس طرح گمنام رہی کہ لوگوں نے اس کی سیرت نگاری، تاریخ نویسی کی شہادت تو خوب دی، لیکن اس کو تفسیر کے فن کا درنایاب اور گوہر کمیاب سمجھنے سے قاصر رہے، جبکہ اس کے قلم کی گہر باری، فکر کی بلند پروازی، زبان وبیان کی سحر آفرینی اور اکثر کتابوں ومقالوں میں تفسیری نکات کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے ضرورت تھی کہ اس پہلو پر بھرپور توجہ کی جاتی اور ان کے تفسیری شذرات، قرآنی جواہر پاروں کو جمع کیا جاتا، بتوفیق الٰہی آئندہ صفحات میں اسی اہم پہلو سے قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب اول

علامہ سید سلیمان ندویؒ

اور ان کا تفسیری مزاج

باب اول

علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ان کا تفسیری مزاج

تاریخی پس منظر

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا زمانہ یورپ کے عروج واقبال اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا نقطۂ آغاز تھا، یورپ ترقی کے بام پر پہونچ کر کمندیں ڈال رہا تھا، لیکن مسلمان ممالک زوال کی آخری حد تک گر کر ہچکیاں لے رہے تھے، اور عالمی قیادت کی سیاسی وتمدنی باگ ڈور ”زوال پذیر“ مغرب کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی، اس کا اثر ونفوذ دنیا کے ہر زرخیز خطہ پر پڑ رہا تھا، برصغیر بھی اسی کے دام فریب میں پھنسا سسکیاں لے رہا تھا اور عام باشندے شکست خوردگی اور انتشار ذہنی کی عجیب کیفیت میں مبتلا تھے، رفتہ رفتہ بیسویں صدی کا سورج بھی لب بام آیا، آزادئ وطن کی کوششیں ہر سمت زور وشور سے جاری تھیں اور ملی ودینی ورثے کی حفاظت کے لئے دو محاذ (دیوبند، علی گڑھ) بھی قائم ہو چکے تھے، اور تیسرے محاذ کی (ندوۃ العلماء) کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، بلکہ ۱۹۹۲ء میں وہ محاذ بھی مولانا محمد علی مونگیری کی سرپرستی میں قائم ہو گیا۔ لیکن برطانوی اقتدار کا رعب ودبدبہ اتنا قائم تھا کہ بقول منشی ذکاء اللہ صاحب: ”انگریز ہر ایک سے پوچھتا تھا کہ تو ہندوستانی ہے یا مسلمان ہے، جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا تھا“۔(۱)

ولادت اور جامع الکمالات شخصیت

یاس وقنوطیت کے ان خونچکاں اور چنگیز وہلاکو کی یاد تازہ کرنے والے حالات

(۱) عروج سلطنت انگلشیہ ص: ۱۷۔

میں مشرقی ہندوستان کی ریاست بہار کے ضلع نالندہ کے ایک زرخیز ومردم خیز قصبہ دیسنہ میں بروز جمعہ ۲۳ رصفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۳ ردسمبر ۱۸۸۴ء کو ایک پیکر خاکی وجود میں آتا ہے، جسے دنیائے اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کے نام سے جانتی ہے، وہ بزم تحقیق کا نکتہ داں، محفل تاریخ کا ابن خلکاں، مجلس تفسیر وحدیث کا علامہ زماں اور ادب کدۂ علم کا رازداں ہے، دور غلامی کی تیرگی میں اس نے امید کی شمع جلائی، قوم مسلم کو قرآن سے جوڑا، مسائل کا حل اسی سے نکالنے پر ابھارا، غرض افق عالم پر ماہ وانجم کی طرح جگمگاتا رہا۔ اور اپنی ضیاپاش کرنوں سے پورے کرۂ ارض کو منور کرتا رہا۔ لندن وبرلن میں اس کی تقریروں کی گونج، حجاز ونجد میں اس کے خطبات کی صدائے بازگشت، مصر وشام میں اس کی تصنیفات کا شہرہ، دیار غیر میں اسی کا آوازۂ تحقیقات۔ ہندوستان کی ہر علمی مجلس کا صدر نشیں اور رہبر قوم ونمائندہ دین متیں، علم وتحقیق کا جویا اور اس راہ میں سب کچھ کھویا، بالآخر سرزمین پاکستان پر اس ترجمان قرآن نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی. للہ ما أعطى وله ماأخذ، وكل شئ عنده بأجل مسمى.

خاندان وتعلیم

علامہ سید سلیمان ندویؒ دادیہال اور نانیہال دونوں طرف سے سادات کا شرف رکھتے تھے، دونوں کا پیشہ طبابت تھا، دین اور اہل دین سے تعلق ونسبت ان کی فطرت ثانیہ تھی، آپ کے دادا سید محمد شیر محمد عرف حکیم پیر محمدی کے تین صاحبزادوں میں سید ابوالحسن، صاحب علم وفضل اور صلاح وتقوی میں معروف تھے۔ ان کے دو صاحبزادے سید ابوحبیب اور سید سلیمان ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے ابتدائی تعلیم دیسنہ کے ایک مکتب میں سید مقصود علی اکھدوی سے پائی اور اپنے بڑے بھائی سید ابوحبیب سے فارسی کی کتابیں پڑھیں اور عربی میں میزان ومنشعب، مزید صرف میر، فصول اکبری اور شرح ملا جامی پڑھی اور استھانواں میں مولانا بشارت کریم صاحب سے بھی چند اسباق پڑھے، پھر پھلواری اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں کچھ ایام طالب علمی گزار کر اپنی علمی پیاس بجھائی، اور بتوفیق الٰہی

۱۹۰۱ء میں اس ہیرا ناتراش کو ندوۃ العلماء کے معمل دار العلوم میں آنے کا موقع ملا، جہاں اسے اپنی صلاحیت کو جلا دینے کا موقع ملا، بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ: ''یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا اور کانوں نے سب کچھ سنا''۔(۱)

مشہور اساتذہ

دار العلوم ندوۃ العلماء کے دوران قیام آپ نے نابغۂ وقت اساتذہ سے علم حاصل کیا، جن میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا سید عبد الحی حسنی، مولانا سید علی زینبی، مفتی عبد اللطیف صاحب، مولانا حفیظ اللہ بندولی اور مولانا شبلی جیراج پوری اور متکلم وقت علامہ شبلی نعمانی رحمھم اللہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، علامہ شبلی نعمانی کی گوہر شناس نظر نے اس درنایاب کو پرکھ لیا۔ اور اپنی خصوصی توجہ وعنایت سے ''برج کمال'' کا مہر تاباں ''علامہ زماں''، محقق دوراں اور فخر ہندوستاں بنایا۔

تعلیمی وملی خدمات: عمومی جائزہ

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے علوم عالیہ کی تعلیم سے ۱۹۰۷ء میں فراغت حاصل کی، اور ۱۹۰۸ء میں الندوہ کے سب ایڈیٹر اور ندوہ میں عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے، اس کے ایک سال کے بعد نائب ادیب مقرر ہوئے اور ۱۹۱۳ء تک اسی ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، عالمی منظرنامہ پر نظر ڈالتے ہی علامہ موصوف کو اندازہ ہوا کہ موجودہ حالات گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر صرف درس وتدریس میں مشغول رہنے کے نہیں، بلکہ میدان عمل میں آکر قوم وملت کی علمی وفکری، سیاسی وثقافتی رہنمائی کے متقاضی ہیں، چنانچہ آپ مئی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے مستعفی ہوکر مولانا ابوالکلام آزاد کے عملۂ ادارت میں شامل ہوگئے اور اپنے قلم کی گہرباری سے قارئین الہلال کو فیض پہونچایا، اور اس رسالہ کو بدر کامل بنا کر ۱۹۱۴ء کے آغاز میں دکن کالج پونہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے اور علامہ شبلی نعمانی کے

(۱) معارف جولائی ۱۹۵۰ء

انتقال کے وقت نومبر ۱۹۱۴ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ آکر فروکش ہوگئے اور علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے پروگرام کے مطابق پانچ رکنی مجلس اخوان الصفا کی توجہ سے علمی وتحقیقی کام کا آغاز کیا اور خاصی حد تک کامیابی حاصل کی۔

افق صحافت پر علامہ سید سلیمان ندوی ''الندوہ'' اور ''الہلال'' کے توسط سے نمودار ہو چکے تھے، چنانچہ جولائی ۱۹۱۶ء میں ''معارف'' کے نام سے دار المصنفین کا علمی ترجمان اور نقیب نکالا اور اسی دوران تحقیقی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، نیز مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء سے بھی وابستہ رہے اور ۱۹۲۳ء میں باقاعدہ معتمد تعلیم مقرر کیے گئے، اس دوران قومی وسیاسی خدمات بھی انجام دیں، تحریکات آزادی سے برابر تعلق رہا، حجاز مقدس اور لندن وبرلن کا سفر کیا اور مستشرقین کے اشکالات کے مدلل ومفصل جوابات دیئے اور حضرت تھانویؒ سے بیعت وارشاد کا تعلق قائم کیا اور ۱۶/جولائی ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک بھوپال میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے، ۱۹۵۰ء کے وسط ہی میں پاکستان روانہ ہوگئے اور کراچی میں ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲/نومبر ۱۹۵۳ء کو انتقال ہوا اور ۲۳/نومبر کو احاطۂ اسلامیہ کالج کراچی میں مدفون ہوئے۔

آپ کی تصنیفات میں لغات جدیدہ، ارض القرآن، سیرت النبی جلد ۳ تا ۷، خطبات مدراس، سیرت عائشہ، عرب وہند کے تعلقات، عربوں کی جہازرانی، خیام، نقوش سلیمانی، رحمت عالم، حیات شبلی، مکتوبات سلیمانی، شذرات سلیمانی، مقالات سلیمان، دروس الادب، چند نادر مقالات وخطبات اور رسالہ اہل سنت والجماعت وغیرہ ہیں۔

قرآن مجید کی خصوصی تعلیم

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عربی زبان وادب اور قرآن کریم کی خصوصی تعلیم ندوہ کے اساتذہ سے پائی تھی، ان کے مشہور اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ بندولیؒ، مولانا محمد فاروق چریاکوٹیؒ، مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ، اور علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں، ادب ونقد کی کتابیں

مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ سے خاص طور پر پڑھی تھی، ان کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی خصوصی استفادہ کیا۔ جس سے قرآنی مزاج کی تشکیل ہوئی، علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ایک طرف ہندوستان کے علمی وتہذیبی اور ادبی ورثہ کو مالا مال کیا، وہیں دوسری طرف قرآنیات کا ایک معتد بہ ذخیرہ چھوڑا، وہ قرآن کو علوم اسلامیہ کی جان بلکہ مسلمانوں کی تعمیر وترقی کی بنیاد سمجھتے تھے، اس کی تلاوت اور فہم وتدریس کو مؤمنانہ زندگی کی شان سمجھتے تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں: ''قرآن مجید حقائق سے مملو ہے، ذرا غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے''(۱)۔ آپ کا طرز تدریس انوکھا اور نرالا تھا، ایک جگہ خود ہی فرماتے ہیں کہ :''قرآن کا درس ہو لیکن تحقیق کے ساتھ ہو، سرسری بیکار ہے''۔(۲)

علامہ شبلی کی قرآن فہمی کے مؤلف رقمطراز ہیں:

''مولانا علم قرآن کو بنیادی اہمیت کا حامل سمجھتے تھے اور اس کی تفسیر کو مروجہ طریقہ سے سرسری طور پر پڑھنے پڑھانے کو ناکافی سمجھتے تھے''۔(۳)

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے علی گڑھ اور ندوۃ العلماء کے زمانۂ قیام میں قرآن اور علوم قرآن کا درس دیا، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی کو آپ نے ''دلائل الاعجاز'' مؤلفہ عبدالقاہر جرجانیؒ اور ''اعجاز القرآن'' مؤلفہ امام باقلانیؒ خود پڑھائی، اور قرآن کے اصول بلاغت بھی املا کرائے، علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس درجہ عنایت خاص نے اس جوہر قابل کو قرآن کا خوشہ چیں بنا کر آستانہ مقدس پر لا کھڑا کیا، پھر پوری زندگی قرآن اس کا اصل سرمایہ اور گرانقدر پونجی ثابت ہوا، اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی بے تکلف صحبت ورفاقت نے اس ذوق کو تنویر عطا کی، اس حقیقت کا اعتراف علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:

(۱) مکاتیب شبلی ج ۱/۳۱۷۔
(۲) حوالہ مذکور
(۳) علامہ شبلی کی قرآن فہمی ص: ۱۱۔۱۴

''سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا، مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ ومفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبوی کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد اور حدیث نبوی اس کے نقش ونگار ہیں''۔(۱)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا قرآنی ذوق

علامہ اقبالؒ نے سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی کے بارے میں کہا ہے کہ ''سید صاحب علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد ہیں''۔(۲)

علامہ موصوف کا یہ معنی خیز جملہ فکر ونظر کے مختلف زاویوں پر محیط ہے۔ علامہ اقبال علم کی تقسیم کے قائل نہیں، وہ اسکو جز ولاینجزی سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس کو قدیم وجدید کے خانوں میں رکھتے ہیں وہ ان کو کوتاہ نظر مانتے ہیں۔ ان کا یہ مصرعہ اس بات کی قوی دلیل فراہم کر رہا ہے۔ ع

دلیل کم نظری قصۂ قدیم وجدید

اور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بقول: ''علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم وجدید، مشرقی ومغربی، نظری وعلمی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں''۔(۳)

اس زاویۂ نگاہ کے تناظر میں اگر سید صاحب کے تمام علمی ذخائر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ان کا تفسیری ذوق اور علمی عبقریت ہر میدان میں کھل کر عیاں ہو جائے گی، صرف سیرۃ النبی ہی علوم اسلامیہ کا ایک ایسا گنجینہ ہے جو قرآن کا پرتو اور عکس جمیل ہے۔

اسلامی علوم میں قرآن کریم منبع صافی کی حیثیت رکھتا ہے، اسی سے سارے چشمے پھوٹتے ہیں، حدیثی سوتے بھی اسی سے نکلتے ہیں، قرآن کریم وہ بحر بیکراں ہے کہ اس میں

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۴۳۔
(۲) مشاہیر کے خطوط بنام سید سلیمان ندوی ص: ۹۸۔
(۳) علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں ص: ۷۔

ہزاروں سفینے ڈالے جائیں، پھر بھی اس کی وسعت تنگ دامانی کا شکوہ نہیں کرے گی، بلکہ "ھل من مزید" کی صدائے مسلسل آتی رہے گی، وحیدالعصر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسی اصل سے اپنا رابطہ مضبوط کیا۔اس کی شہادت مشہور عالم اور بین الاقوامی شہرت کے حامل ان کے شاگرد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے دی ہے:

''عام طور پر لوگ سید صاحب کو مؤرخ، ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔خصوصا علماء کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے،لیکن مجھے سید صاحب کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے''۔(۱)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اصل موضوع قرآن تھا، وہ جب بھی لکھتے تو ان کے شگفتہ قلم سے ایسے تابدار موتی نکلتے، جو رشحات وشذرات (سونے کے ٹکڑے) کی حیثیت رکھتے اور بالفاظ دیگر وہ یہ کہنے کے لائق تھے کہ ع

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

اور بقول مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی ''وہ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ اصلی علوم تو بس قرآن وحدیث ہیں، تاریخ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے جو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہے۔(۲)

الفاظ کے یہ دو بول اس عظیم شخصیت کی زبان سے نکلے، جس نے اپنی زندگی کا پورا حصہ ان ہی دو سرچشموں (قرآن وحدیث) کی تفہیم وتشریح میں گزار دیا۔وہ مرد مؤمن ایک طرف جہاں فن سیرت کا ممتاز سیرت نگار، فن تاریخ کا بے مثال مؤرخ، لغت کا زبردست رمز شناس تھا، وہیں دوسری طرف قرآنیات کا اچھا ماہر اور اس کے نصوص کا بہترین ترجمان تھا۔اس نے قرآن کو اپنی زندگی کا رہنما بنایا تھا، جو ہر موقع پر ان کی رہبری بلکہ دستگیری کرتا رہتا تھا، تاریخ ہو یا سیرت، ادب عربی ہو یا ادب اردو، نقد وتبصرہ ہو یا شعر وشاعری، ہر جگہ قرآنی اور مذہبی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ایک مکتوب میں اپنے

(۱) پرانے چراغ ۲/۵۸ اور دعوت فکر وعمل: ۱۰۸

(۲) مجلّہ ذکر وفکر نئی دہلی میں مضمون: قرآن اور فہم سلیمان، ماہ شوال ۱۴۰۹ھ، وماہ جون ۱۹۸۹ء۔

صدیق حمیم اور رفیق قدیم مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ:

''آپ گلہ کرتے ہیں کہ (معارف میں) مذہبی رنگ تیز ہے،لیکن میں نے آپ کو اور مولوی عبدالباری صاحب کو پہلے ہی تنبیہ کر دی تھی کہ اگر مشرقیات کا جلوہ اس میں زیادہ روشن ہے تو یہ ''عاشقانِ مغربیت'' کا قصور ہے، اب بھی رحم فرمائیے''۔(۱)

علامہ سید سلیمان ندوی کا عشق قرآن کریم سے بہت بڑھا ہوا تھا، وہ مضامین ومقالات کے لئے قرآنی آیات ہی کو بنیاد بناتے تھے، خطوط ومکاتیب میں ان کا یہ قرآنی ذوق لبریز نظر آتا ہے، مولانا مسعود عالم ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہئے، تصلب اور تعصب حکم دین میں ہونا چاہئے نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں، خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت، بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [بقرہ: ۱۳۵]''۔(۲)

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:۔

''حضور کی بعثتیں'' کی تعبیر صحیح ہیں، ایک خود حضور کی بعثت، پھر حضور کی امت کی بعثت سائر الامم کی طرف بحکم: كنتم خير أمة أخرجت للناس. (۳)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے قرآن کریم کے مطالعہ کو اپنے روز وشب کا مشغلہ بنالیا تھا، یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے باقاعدہ کوئی تفسیر نہیں لکھی، لیکن دوران تلاوت اپنے خاص نسخۂ قرآن پر حواشی ضرور رقم کئے اور علمی نکات بھی تلاش بسیار کے بعد نکالے، آیتوں کے عمود کی توجیہ کی، اور علوم قرآن سے متعلق پر مغز مقالات لکھے، جغرافیۂ قرآن پر سیر حاصل بحث کی، قرآنیات سے متعلق ان کی علمی تحقیق اتنی نہیں ہے کہ اس کا احاطہ مشکل ہو، لیکن آپ نے قرآنی آیات سے متعلق جو کچھ بھی تحریر فرمایا وہ تمام مفسرین ہند میں اپنی مثال آپ اور ماقل ودل کا حقیقی مصداق ہے۔سید صاحب کی محسن کتابوں میں ابن خلکان (ولادت ۶۰۸۔

(۱) مکتوبات سلیمانی ج ۱/۵۸۔

(۲) مکاتیب سلیمان: ۱۱۵۔

(۳) حوالہ مذکور: ۸۱۔

وفات ۶۸۱ھ) کی کتاب وفیات الاعیان بھی ہے، ابن خلکان اس نظریہ کے حامل تھے کہ العبرة بالقيمة لا بالقامة، بقامت کہتر بقیمت بہتر، یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے یہاں تصانیف کی بہتات نہیں۔لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ تحقیقی دنیا کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔

ترجمۂ قرآن کا ادبی پہلو

اللہ تعالی نے علامہ مرحوم کو منجملہ تمام خصوصیات کے ایک خصوصیت یہ بھی عطا فرمائی تھی کہ انہیں اردو زبان وادب پر مکمل عبور تھا، اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اردو کے گیسوئے پرخم کو سنوارنے اور نوک و پلک درست کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا تو بیجا نہ ہوگا۔اسی وجہ سے جب کبھی آپ کا اشہب قلم چلتا ہے تو اس سے علم وعرفان کے موتی جھڑتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ کی اردو وعربی شاعری، ادبی نگارشات، مطبوعہ قلمی تحریریں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

علامہ سید سلیمان نے جہاں کہیں بھی اپنی تحریروں میں قرآن کی آیتیں استعمال کی ہیں ان کا ترجمہ کسی مفسر یا مترجم کے ترجمۂ قرآن سے نقل نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے علم وبصیرت اور وسیع مطالعہ کی روشنی میں خود اس مہتم بالشان کام کو انجام دیا ہے۔

زبان وادب کے ماہرین جانتے ہیں کہ جس طرح الفاظ کا ایک ظاہری قالب ہوتا ہے، اور اس میں طاقت وقوت ہوتی ہے، اسی طرح اس کی ایک معنوی حالت ہوتی ہے وہ بھی اپنا خاص اثر رکھتی ہے اور بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ:

''لسانیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جیسے اشیاء اور خارجی موجودات کا درجۂ حرارت (Temperature) ہوتا ہے، ویسے الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے اور جیسے اجسام کا ایک سائز ہوتا ہے، الفاظ کا بھی ایک سائز ہوتا ہے''۔(۱)

ظاہر ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسا وسیع النظر عالم کیسے اس گوشہ سے

(۱) قرآنی افادات ص:۱۷۲

ناآشنا رہ سکتا ہے، انہوں نے ترجمۂ قرآن میں اس اہم گوشہ کی حد درجہ رعایت کی ہے، بلا شبہ سید صاحب کے ترجمہ قرآن کو امتیازی حیثیت دینے میں ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر مترجمین کے تراجم کا تقابلی مطالعہ

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' میں تمام مترجمین قرآن نے رحمان ورحیم کا ترجمہ ''بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا'' سے کیا ہے، لیکن سید صاحب نے ان کو اسمائے ذات میں شامل فرمایا ہے اور ان کا ترجمہ کرنے سے گریز کیا ہے، دلیل کے طور پر سورۂ اسراء کی آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ پیش کی ہے۔ذیل میں اس کے چند نمونے دیئے جارہے ہیں:

پہلا نمونہ

شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان سے۔(شاہ عبدالقادرؒ)

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔ (حضرت تھانویؒ)

اللہ ہی کے نام نامی اور اسم گرامی کی اعانت اور امداد سے، جو بیحد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔(ترجمہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)

شروع اللہ نہایت مہر بان، بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے۔ (مولانا دریابادیؒ)

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا۔(مفتی شفیع عثمانیؒ)

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ (مولانا محمد جوناگڑھیؒ)

شروع اللہ کے نام سے جو الرحمٰن ہے، الرحیم ہے۔(مولانا ابوالکلام آزادؒ)

مولانا آزاد کے علاوہ اکثر مفسرین نے الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کیا ہے۔

اب سید صاحب کے ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں:

شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے، رحیم ہے۔ (ترجمۂ سلیمانی)

دوسرا نمونہ

''الحمد للہ'' میں عموماً مفسرین نے الف لام کو استغراق کے معنی میں لے کر یہ ترجمے کئے ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں:

سب تعریف واسطے اللہ کے پروردگار عالموں کا۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں، جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔ (مولانا تھانویؒ)

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہاں کا۔ (مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ)

ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو جہانوں کا مربی ہے۔ (مولانا دریابادیؒ)

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے (مولانا جوناگڑھیؒ)

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ (مولانا آزادؒ)

شکر سزاوار حقیقی ہے کائنات کا رب۔ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

حقیقی ستائش اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔ (مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)

سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ (مولانا فتح محمدؒ)

لیکن سید صاحب کا ترجمہ ہے:

''حقیقتِ حمد، اللہ ہی کے لئے ہے جو مربی ہے ہر ہر عالم کا''۔ (۱)

تیسرا نمونہ

اسی طرح ''لبشـــــر'' کے ترجمہ میں علامہ موصوف نے جس لسانی قوت کا لحاظ رکھا ہے وہ ذیل میں مذکور ہے:

(۱) نکات سورۂ فاتحہ مرتبہ مولانا محمد اویس ندوی۔

مَاكَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّاوَحْياً أَوْمِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْيُرْسِلَ رَسُوْلاًفَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَاءُ ،اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ. [شوریٰ:۵۱]

اور نہیں طاقت کسی انسان کو کہ بات کرے اس سے اللہ (شاہ عبدالقادرؒ)

کسی کی یہ شان نہیں کہ حالت موجودہ میں اللہ اس سے کلام فرمائے (تھانویؒ)

کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں کہ اس سے کلام کرے (مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ)

ان ترجموں پر ایک نظر ڈالئے اور سید صاحب کا یہ ترجمہ پڑھئے:

''اور کسی نبی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے''۔ (۱)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ترجمہ میں ''تاب'' کا جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ''طاقت'' ''مرتبہ'' ''میسر'' اور ''شان'' سے عظیم تر ہے، نمونے کی ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کس قدر زبان کی نوک پلک سے واقف تھے، یہ حقیقت ہے کہ جس طرح علمائے متاخرین نے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو ''الہامی'' قرار دیا ہے، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فٹ نوٹ اور منتشر ترجمہ وعلمی نکات کو وہبی ترجمہ وتفسیر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسی کی شہادت مولانا شاہ معین الدین ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح دیتے ہیں:

''قرآنی علوم پر جب کوئی مضمون لکھتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے علم وفن کے شالیمار میں قرآن پاک کی آیتوں کی نہر بہشت بہ رہی ہے''۔ (۲)

آیات قرآنی اور فہم سلیمانی: چند نمونے

مفسرین اور ماہرین قرآنیات کے یہاں تفسیری مباحث کو متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک اصول رہا ہے کہ خود قرآن کریم کی آیات کو سب سے پہلے اسی کی مثل دوسری

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۴۵۔

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ج ۱/۷۔

آیات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ کیونکہ قرآن نے ایک واقعہ کو کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان کیا ہے، اسی کو اصطلاح تفسیر میں ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کہا جاتا ہے۔ پھر قرآنی آیات کے ذریعہ وضاحت کے بعد حدیثی ذخائر اور کلام عرب کے استعمالات کی طرف رجوع کیا جائے، علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ اصول اپنے پیش نظر رکھا۔

قرآن کی تفسیر قرآن سے

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ذاتی نسخہ قرآن پر قیمتی حواشی تحریر فرمائے ہیں، یہ حواشی تفسیر القرآن بالقرآن کا بہترین نمونہ ہیں، مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی اس آیت فتلقی آدم من ربه كلمات فتاب عليه [.....]: پر حاشیہ میں لکھا ہے: ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار [اعراف:۲۳]، گویا کلمات کی تشریح سورۂ اعراف کی دعا کی شکل میں ہوئی۔

قرآن کی تفسیر حدیث سے

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے قرآن مجید کی تفسیر حدیث سے بھی کی ہے، اس سلسلہ میں سورۂ احزاب کی آیت/۶ نقل کر کے سید صاحب کا منہج تفسیر ذکر کیا جا رہا ہے، ڈاکٹر سید سلمان ندوی رقمطراز ہیں:

''والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سلسلہ شروع فرمایا تھا کہ قرآن کی آیتوں کی تفسیر حدیثوں سے کی جائے یا جو معنی ومطلب قرآن کی آیت میں ادا ہوتا ہے اس معنی ومطلب کی حدیثیں ان آیات کے ذیل میں جمع کر دی جائیں، تاکہ معلوم ہو کہ قرآن پاک متن ہے اور احادیث نبویہ اسکی شرح ہیں۔''

"اَلنَّبِیُّ أَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَأَزْوَاجُهٗ أُمَّهَاتُهُمْ [احزاب:۱]" (نبی کو مؤمنین کے ساتھ ان کے نفسوں سے زیادہ تعلق ہے، اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں)

(۱) مجلّہ ذکر وفکر، ص:۶۱

اس آیت پر حاشیہ میں سورۂ توبہ کی آخری مشہور آیت "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ [توبہ:۱۲۸]" کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور پھر حسب ذیل حدیث تحریر فرمائی ہے: "لایؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین". [بخاری: کتاب الایمان: ۱۵] (تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک کہ میں اس کے والدین، بچوں اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں)۔

مقاطع آیات

علامہ سید سلیمان ندویؒ مقاطع آیات میں مذکور اللہ کے اسماء وصفات کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان سے سابق کے مدلولات کی وضاحت کرتے تھے، بعض دفعہ ایسے گنجلک اور پیچیدہ مسائل جوامت میں موضوع بحث ہوتے اور جن کے انکار سے عقیدہ اسلامی پر ضرب آتی تھی، سید صاحبؒ نے اپنی وسیع النظری اور عمیقانہ تدبر سے آیات کے فواصل (مقاطع آیات) کی ایسی دلنشیں تشریح فرمائی، جس طرح کی تفسیر متقدمین ومتأخرین میں سے بہت کم ہی افراد نے کی، یا وہ اس نکتہ تک نہیں پہونچ سکے ہیں، مثال کے طور پر قرآن کے سورۂ نساء کی آیت "وَمَاقَتَلُوْهُ يَقِيْناًبَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاًحَكِيْماً": [نساء:۱۵۸]

اس آیت کریمہ کے آخری جزء پر سید صاحب نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے کہ "کونه عزیزاً حکیماً، یقتضی أن یکون الرفع أمراًعظیماً" اللہ تعالی کی صفت غلبہ وحکمت کا ذکر اس کا مقتضی ہے کہ رفع الی السماء ایک عظیم کام تھا۔ اگر طبعی موت کا واقعہ ہوتا تو یہ بات سنت عادیہ تکوینیہ کے نوع میں آتی، اس میں غلبہ وقدرت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ یہ کام ایک مافوق الطبیعاتی کرشمہ کی طرح پیش آیا ہے۔

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

(۱) حوالہ مذکور۔

''سید صاحب کا یہ استدلال اس جگہ پر ٹھوس اور نا قابل انکار ہے، اس کے ساتھ علوم قرآن کے طالب علموں کے لئے ایک فتح باب بھی ہے، جس سے مطالعہ قرآن کی ایک راہ کھلتی ہے''۔(۱)

مولانا عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام طبریؒ (م۳۱۰)، امام قرطبیؒ (م۶۱۷ھ) امام زمخشریؒ (م۸۱۵ء) قاضی بیضاوی (م۷۹۱ھ) اور امام ابن کثیرؒ کی تفاسیر سے سابق الذکر مقطع الآیت کی تفسیر کا مراجعہ کیا، کسی نے بھی اس طرح اشارۃً یا دلالۃً وضاحت نہیں کی ہے۔ صرف ''روح البیان'' کے مؤلف شیخ اسماعیل حقی نے اسماء وصفات کو رفع سے متعلق کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سید صاحب کی تفسیر سے قریب تر ہیں۔ شیخ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:۔

"وكان اللّٰه عزيزاً حكيماً لايغالب فيمايريده، فعزة اللّٰه عبارة عن كمال قدرته، فان رفع عيسى عليه السلام إلى السموات وإن كان متعذراً بالنسبة إلى قدرة البشر ولكنه سهل بالنسبة إلى قدرة اللّٰه تعالى لايغلبه أحد". (۲)

حقی کہتے ہیں کہ "الرفع إلى السماء" بشر کے لئے ناممکن، مگر اللہ تعالی کے لئے ممکن تھا اور سید صاحب کی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو تسلیم شدہ ہے کہ موت دینا یا زندہ اٹھالینا دونوں بشر کے لئے ناممکن اور اللہ کے لئے آسان ہے، مگر یہاں پر لفظ عزیز بتا رہا ہے کہ اللہ تعالی کی اس قدرت کا اظہار ہے جو خود اس کی سنت تکوینی یا طبیعاتی نظام کے ماوراء ہے۔

آیات قرآنی کا باہمی ربط

قرآن پاک کی آیات ایک دوسرے سے مربوط ہیں یا علیحدہ ہیں، یہ موضوع بھی علمائے تفسیر کے یہاں مختلف فیہ رہا ہے، امام رازیؒ اور امام بقاعیؒ نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور دوسرے علماء نے بھی اس میں کافی غور وخوض کیا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی

(۱) افکار سلیمانی ص:۳۶، مضمون بعنوان علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی بصیرت
(۲) روح البیان ج۱/۷۰۵

قرآن کی آیات کے باہمی ربط کا خاصا خیال تھا، اسی وجہ سے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔:

''قرآن پاک کے علوم میں سب سے زیادہ دقیق اور نازک علم آیات اور سور کے باہم ربط وتعلق کا ہے''۔(۱)

اس لطیف ونازک ربط کی طرف علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے حواشی قرآنی میں جابجا اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سید سلمان صاحب رقمطراز ہیں:۔

''سورۂ حدید کی آیت [۲۵] ملاحظہ فرمائیے (لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ [حدید:۲۵] (ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کو نازل کیا تا کہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں)۔

اس آیت میں کتاب ومیزان کے ساتھ لوہے کا ذکر جو بظاہر بے جوڑ محسوس ہوتا ہے، اس کی تفسیر کئی مفسروں نے کی ہے اور بعض نے لوہے سے سیاسی وجنگی طاقت مراد لی ہے۔ ہمارے والد ماجد کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے چند لفظوں میں کیا بلیغ بات فرمادی ہے، فرماتے ہیں:۔

"طريقان لإقامة القسط أولهماالكتاب والميزان، وثانيهما الحديد (یعنی عدل وانصاف کا قیام دو ذرائع سے ہوتا ہے، پہلا قرآن اور انصاف کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے،) جو ظاہر ہے کہ خدا اور اس کے سامنے جواب دہی کے احساس سے حاصل ہوتا ہے، لیکن انسان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ بھی معلوم ہے کہ احساس مسئولیت پر غفلت بھی غالب آجاتی ہے، ان اہل غفلت کی اصلاح کے لئے قوت کا استعمال کرنا

(۱) ترجمۂ قرآن مولانا احمد علی لاہوری ص:۱۲

پڑتا ہے ،وہ قوت چاہے انفرادی ہو یا حکومتی ۔بس اب کتاب ومیزان کے ساتھ حدید (لوہے) کا تعلق واضح ہوگیا''۔(۱)

عمود قرآن

اسی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ کے یہاں سورتوں کے عمود کے ذکر کرنے کا خاص اہتمام ہے ،آپ نے قرآن پاک کی سورتوں کا مطالعہ کیا اور اس کے مرکزی مضمون کی وضاحت چند لفظوں اور سطروں میں کی ،جن سے دیگر مضامین سورت کے سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے،شاید ان کی یہ سوچ قرآن کریم کے اس آواز پر لبیک کہنے کا نتیجہ ہو جو لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ، لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ اور أَفَلَايَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ کی شکل میں موجود ہے۔

سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معراج کا بیان سورۂ اسراء (جس کو بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں) کی صرف ابتدائی تین چار آیتوں میں ہے،لیکن ہم نے اس سورہ کو شروع سے اخیر تک بار بار پڑھا اور ہر بار اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ یہ پوری سورت معراج کے اسرار وحقائق ،نتائج وغیرہ اور احکام واعلانات سے معمور ہے''۔(۲)

ڈاکٹر سید سلمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ ''سورۂ ہود کی ابتداء میں تحریر فرمایا ہے کہ ھذہ السورۃ تسلیۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلاسے کے لئے نازل فرمائی گئی۔''(۳)

اس سورت کے مشمولات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مختلف انبیاء کو اپنی اپنی قوموں میں جن مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی رہے کہ قریش نے جن مشکلات ومسائل کی آپ

(۱) مجلّہ ذکر وفکر ۱۹۸۹ء
(۲) سیرۃ النبی ج ۳/ ۲۴۶
(۳) مجلّہ ذکر وفکر ۱۹۸۹ء

پر بوچھار کی ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ سارے انبیاء نے وہ تکلیفیں برداشت کی ہیں، کسی کو زدوکوب کیا گیا، کسی کو مارا گیا، کسی کو آرہ کے ذریعہ چیر کر تکا بوٹی کر دیا گیا، اور کسی کے ساتھ سب وشتم کا معاملہ روا رکھا گیا۔غرض نوع بنوع کے مسائل میں ان کو الجھایا گیا، تاکہ وہ کار دعوت سے باز آئیں۔

تحقیق الفاظ کی ندرت

علامہ سید سلیمان ندویؒ کو خلاق ازل نے پاکیزہ تحقیقی ذوق عطا فرمایا تھا ،وہ نصوص واصول کی مراجعت کے قائل اور مفردات والفاظ کی تحقیق کے داعی تھے،ان کی تمام تحریروں خاص طور سے ارض القرآن میں یہ وصف پورے جمال وکمال کے ساتھ موجود ہے،ایک لفظ ''شرح صدر'' کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''شرح کے لغوی معنی عربی میں چیرنے پھاڑنے کے ہیں ،اسی سے طب کی اصطلاح علم تشریح اور تشریح اجسام نکلی ہے ۔چونکہ چیرنے اور پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہوجاتی ہے،اس لئے اس سے تشریح امر اور تشریح کلام ،شرح بیان اور شرح کتاب وغیرہ مجازی معنی پیدا ہوتے ہیں، اسی سے ایک اور محاورہ شرح صدر کا پیدا ہوا ہے جس کے معنی سینہ کھول دینے کے ہیں اور کلام عرب میں اس سے مقصود بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کر دینا ہوتا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔حضرت موسی علیہ السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی تو آپ نے دعا مانگی: رب اشرح لی صدری.''(۱)

اسی طرح اعلام القرآن ،عرب، عاد، ثمود، مدین، حنیف، لات، عزی، مناۃ، ہبل، سواع، یعوق، یغوث، نسر وغیرہ کی اطمینان بخش تحقیق کی ہے اور مراجع ومصادر سے اس کی اصل کو واضح کیا ہے ۔نیز اصطلاحات قرآن خواہ شعبہ عبادات سے متعلق ہوں

(۱) سیرۃ النبی ج ۳/ ۲۷۱

یا اخلاقیات سے، معجزات سے میل کھاتی ہوں یا معاملات سے، ان کی مصادر لغت کی روشنی میں وضاحت کی ہے، قرآنی الفاظ کے معانی متعین کرنے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے استقراء سے بھی بہت زیادہ مدد لی ہے وہ ایک لفظ کے تمام مواقع استعمال اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور اس کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

قرآنی آیات سے نکات وبدائع کے استخراج میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جو کمال حاصل تھا وہ ان کے معاصر علماء میں کمیاب ہے، علامہ سید سلیمان ندوی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے دو نکات نکالے ہیں:

(۱) یہاں رحمٰن اور رحیم بدل معنی کے طور پر ہیں۔

(۲) اسمیں عیسائیوں کے اعتراض کا جواب بھی آ گیا جو مسلمانوں کے خدا کو محض جبار وقہار بتاتے تھے۔(۱)

مولانا عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سید صاحب نے فرمایا کہ ''الرحمٰن الرحیم'' لفظ جلالت کا بدل معنی ہے، اس کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ اور جو لوگ عربی نحو سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس کی قدر کریں گے کہ بدل معنی نے مفہوم کو کس قدر بلند کر دیا، اور کس درجہ پڑھنے والے کو قرآن کریم کی عظمت کا احساس ہوا۔''(۲)

قرآن کریم میں اوقات نماز سے متعلق جو آیتیں آئی ہیں ان میں ظہر اور عصر کی نمازوں کے اوقات کہیں مجمل اور کہیں مفصل ہیں، اور کہیں تو دونوں کو ایک لفظ "قبل الغروب" یا "أصیل" یا "طرف النهار" کہہ کر بیان کیا گیا ہے، مثال کے طور پر سورۂ ق کی یہ آیت پڑھئے: (فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ

(۱) نکات سورۂ فاتحہ مرتبہ مولانا محمد اویس ندوی

(۲) پندرہ روزہ تعمیر حیات ندوۃ العلماء، ۲۵ اپریل ۲۰۰۵ء

وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْد[ق:۳۹] (پس ان مخالفوں کے کہنے پر اے رسول! صبر کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد وتسبیح کر، اور کچھ رات گئے (عشاء پر اس کی تسبیح کر اور آفتاب کے سجدہ کرنے کے بعد یعنی غروب کے بعد (مغرب کے وقت) اس کی تسبیح کر)۔

سورۂ روم میں ارشاد باری ہے: (فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ.[روم: ۱۸] (اور اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو، اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔'') مؤخر الذکر آیت میں شام کی نماز (مغرب وعشاء) کے بارے میں "حين تمسون" فرمایا گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ اس اجمال پر غور کرنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے اور لطیف اشارہ ملتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

''یہ دونوں مل کر ایک بھی اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر ادا کر سکتے ہیں، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے، اسی لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔''(۱)

علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی خدمات کا یہ تھا مختصر تذکرہ۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے قرآن کو کس طرح اپنی زندگی میں منتقل کیا اور ہر لمحہ اس کی خدمت وذمہ داری کے لئے تیار رہے، تادم حیات وہ قرآن کا درس دیتے رہے، انتقال مکانی نے ان کے مزاج میں استحکام اور مزید پختگی پیدا کی، آئندہ صفحات میں قارئین بعض ایسے نمونے بھی پائیں گے جن سے انہیں اندازہ ہوگا کہ علامہ موصوف نے عام گفتگو اور

(۱) سیرۃ النبی ج ۵/۳۷۔

عمومی بول چال میں کس طرح قرآن کی آیت کو بلاتکلف استعمال کیا اور روزمرہ کی زندگی کے الجھے مسائل سلجھائے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا درس قرآن

قرآنی تعلیمات کو عام کرنے اور ہر خاص و عام کے رابطہ کو اس چشمۂ صافی سے جوڑنے کیلئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے دروس قرآن کے حلقے قائم کرنے کا فیصلہ کیا، آپ کا یہ سوچنا محض نظریاتی نہیں رہا، بلکہ اس کا عملی مظاہرہ بھی تادم حیات کرتے رہے، ان دروس قرآن میں علامہ سید سلیمان ندوی کی زبان سے جو موتی باران رحمت کے چھینٹے اور قطرے کی طرح ٹپکے ان سے تشنہ کامان انسانیت کو حیات جاودانی ملی، آپ کی خواہش تھی کہ عام مسلمانوں تک قرآنی پیغام پہنچانے کے ساتھ نئی نسل کو بھی اس سے روشناس کرایا جائے، ان کی دلی تمنا تھی کہ:

''قدیم درس گاہوں کے فارغ التحصیل طلباء اور جدید کالجوں کے ایسے تعلیم یافتہ طلبہ جنہوں نے عربی یا اسلامیات میں ایم اے کیا ہو، اور جن کو علوم دین سے شغف بھی ہو، ان دونوں قسموں کے طلباء کو ملا کر ایک باضابطہ درس کا سلسلہ قائم کیا جائے، جس میں صرف علوم قرآنی کی اعلیٰ تعلیم اور کلام اللہ سے استفادہ کے طریقوں کی تفہیم کی جائے۔''(۱)

چنانچہ آپ نے دوران قیام دیسنہ بہار، دارالمصنفین اعظم گڑھ، بھوپال اور پاکستان میں اس سنہرے سلسلہ کو جاری رکھا اور علم قرآن کے جویا افراد کیلئے الٰہی اور نبوی غذا فراہم کی، ایک مرتبہ مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ اور ان کے ساتھیوں کو بڑے درد کے ساتھ مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ لوگ تاریخ کے لئے کہتے ہیں، قرآن پڑھنے کے لئے کیوں نہیں کہتے ؟! علامہ سید سلیمان ندویؒ کے درس قرآن کا انداز یہ تھا کہ جو آیت زیر درس ہوتی، اس مفہوم کی تمام آیات کو جمع فرماتے، پھر تمام آیات کو سامنے رکھ کر سیاق و سباق کا لحاظ

(۱) تذکرۂ سلیمان ص:۲۲۴

فرماتے ہوئے مفہوم متعین فرماتے اور اس کو سنت اور اقوال سلف سے مدلل فرماتے۔

اس کا اثر یہ تھا کہ آپ کی گفتگو ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق تھی، سامعین ایستادہ کھڑے یا بیٹھ کر درس سنتے، اور ان کے علمی انداز سے محظوظ ہوتے، دقیق اور عمیق مسائل چٹکیوں میں حل فرماتے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے علم قرآنی کے عام کرنے کے اس سلسلہ کو اپنی زندگی کا ماحصل بتایا ہے، مولانا شاہ معین الدین کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''بحمد اللہ کہ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ ایک مسجد میں درس قرآن ہوتا ہے، سو دوسو سامعین ہوتے ہیں، جن میں بعض افسران بھی ہوتے ہیں، یہی زندگی کا ماحصل ہے''۔(۱)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے درس قرآن کی خصوصیات

قرآن کریم سے عالمانہ انداز میں انتفاع اور استفادہ کیلئے تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) صحیح ایمانی ذوق اور دینی مزاج۔

(۲) منصب نبوت سے تمام و کمال واقفیت اور عہد نبوی کی پوری علمی، عملی، اخلاقی، اعتقادی اور سیاسی تاریخ۔

(۳) عربی پر محققانہ نظر۔

مولانا محمد اویس ندوی فرماتے ہیں:

''ان تینوں ضروری شرطوں کے ساتھ وہ علوم جو فہم قرآن کے لئے ضروری ہیں سید صاحب ان کے بھی محقق اور متیقظ عالم تھے۔''(۲)

علامہ سید سلیمان ندویؒ میں یہ شرطیں بدرجہ اتم موجود تھیں، چنانچہ وہ عصر حاضر کے مذاق و مزاج کے مطابق قرآنی آیات کی ایسی تفسیر فرماتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھتا تھا کہ

(۱) مطالعہ سلیمان ص ۴۳

(۲) تعمیر حیات ۱۹۶۴ء

اس سے پہلے یہ بات نہیں کہی گئی تھی۔اسی کے ساتھ سلف مفسرین کا دامن نہیں چھوڑتے تھے،ان پر عقلیت کا نہیں سلفیت کا غلبہ تھا اور ان کا مسلک تاویل نہیں، بلکہ تفویض تھا،مولانا محمد اویس ندوی فرماتے ہیں ''مجھ کو سید صاحب سے قرآن مجید تین طرح سے پڑھنے کا موقع ملا۔'' فقہی،کلامی،عمومی موضوعات'' درس قرآن کی تیاری میں تفسیر طبری اور تفسیر روح المعانی پیش نظر رہتی تھیں اور نحوی مشکلات کے لئے مغنی اللبیب اور کبھی کبھی ابوحیان کی البحر المحیط کا بھی مراجعہ فرمایا کرتے تھے۔اسی طرح مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے فوائد قرآنیہ، نیز مولانا حمیدالدین صاحب کے قرآنی ذوق سے متاثر نظر آتے تھے،علامہ سید سلیمان ندویؒ دوران درس قرآن کریم کی آیات کی لغوی تشریح ایسی فرماتے تھے کہ آیت کا پورا مدلول ومفہوم سامنے آجاتا تھا۔

مثال کے طور پر ایک درس قرآن میں لفظ ''حنیف'' کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کتب احادیث میں نبوت سے قبل کے سلسلہ میں حضورﷺ کے متعلق ایک لفظ ''یتحنث'' کا آتا ہے،جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ حضورﷺ عبادت کیا کرتے تھے، فرمایا کہ میرے ذوق میں یہ لفظ اصل میں '' یتحنف'' ہے،یعنی حضورﷺ دین حنفی (ابراھیمی) کی عبادت کیا کرتے تھے۔

وہ ان لوگوں پر شدت سے نکیر کرتے تھے جنہوں نے عربی زبان کی چند کتابیں پڑھ لیں اور فہم قرآن کے مدعی ہوگئے، دوران درس علامہ سید سلیمان ندوی اس کو ایک بڑے فتنہ کی حیثیت سے ذکر کرتے، نیز بعض علماء کی غلطی کو طلباء کے سامنے بیان فرما کر کہتے کہ یہ باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کی مثالیں ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریری قرآنی خدمات

''سید صاحب کو اسلامی علوم میں حقیقی شغف قرآن سے تھا۔آیات قرآنی سے کلامی،فقہی اور سیاست اسلامی کے مسائل کا استنباط اور اس کے ادبی لطائف کی تشریح و

(۱) تعمیر حیات ۱۹۶۴ء۔

توضیح اور تاریخی مباحث کی تحقیق ان کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا'' (۱) مطالعہ سلیمان ص:۶۴

قرآنیات کے موضوع پر علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے جولائی ۱۹۰۶ء میں ''قضاوقدر اور قرآن'' کے عنوان سے ایک پر مغز علمی وتحقیقی مضمون لکھا۔ جو الندوہ میں شائع ہوا اور خراج تحسین حاصل کرنے کا باعث بنا، پھر اسی سال "القرآن والفلسفة الجديدة" (الندوہ ستمبر ۱۹۰۶ء) اور ۱۹۰۷ء میں ''مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید'' (الندوہ دسمبر) اور ۱۹۰۸ء میں "ایمان بالغیب" (الندوہ دسمبر) میں شائع ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں علم کلام اور جدید عربی کے ایک استاد کی ضرورت محسوس ہوئی تو علامہ شبلی کی نظر اس ہونہار اور فاضل شاگرد پر پڑی، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی کا باقاعدہ تقرر ہوا اور عربی زبان سکھانے کے لئے آپ نے دو ابتدائی ریڈریں "دروس الأدب" کے نام سے ترتیب دیں، جس میں قرآن کی مختصر ترین آیات کو نحوی قواعد کے اثبات کیلئے بطور مثال ذکر کیا گیا ہے اور مبتدی طلباء کے ذہن کو براہ راست قرآن سے وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بایں طور کہ نحو وصرف کے مسائل بھی عملی طور پر سامنے آجائیں اور قرآن کی برکت بھی حاصل ہوجائے، دروس الادب کا پہلا جزء ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور مرفوعات، منصوبات اور مجرورات نیز ضروری نحوی قواعد کو صرف قرآنی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے، جبکہ دوسرا جزء ۶۰ صفحات پر محیط ہے، جنوری ۱۹۰۹ء میں الندوہ ہی کے لئے آپ نے ''مکررات القرآن'' (یعنی قرآن مجید میں مکرر آیتیں کیوں ہیں؟) کے موضوع اور جولائی میں ''سود اور صحف انبیاء'' کے عنوان سے، نیز اگست ۱۹۱۱ء میں ''اسماء القرآن'' کے نام سے بیش قیمت مقالات تحریر فرمائے۔ یہ علامہ سید سلیمان ندوی کے ابتدائی دور کے مضامین ہیں، لیکن اپنی علمیت اور اثر پذیری میں اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں۔ پھر جب آپ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اصرار پر ''الہلال'' سے وابستہ ہوئے تو اپنے قرآنی مضامین ومقالات سے اس کو ماہ تمام بنادیا، جس کی نور افشانی افق عالم کو مطلع انوار بنانے لگی، الہلال میں چونکہ مضمون نگار کے اسماء نہیں لکھے جاتے تھے، اس لئے بہت کم ہی

مضامین کی شناخت ہو پائی، چند مضامین کے عناوین حسب ذیل ہیں:

(۱) تذکار نزول القرآن الھلال ۶/اگست ۱۹۱۳ء (۲) قصص بنی اسرائیل ۲۴ستمبر اور۱۲/۹/ ۱۹۱۳ء (۳) علوم القرآن ۱۱/فروری، ۲۵/مارچ، ۸/جولائی، (۴) اساطیر القرآن ۱۰/۲۲/اپریل ۱۹۱۴ء۔

علامہ موصوف نے دوران قیام دکن کالج (پونہ) ایک یہودی عالم سے عبرانی اور انگریزی زبان باضابطہ پڑھی اور عبور حاصل کیا اور یہیں سیرت عائشہ اور تاریخ ارض القرآن کا آغاز کیا، جو قرآنیات پر اپنی نوعیت کی گرانقدر تصنیف ہیں ۔پھر جب دارالمصنفین کے زیر اہتمام ماہنامہ ’’معارف‘‘ کے نام سے نکلا تو ایک مضمون ’’روزہ‘‘ کے نام سے لکھا، جو ”كتب عليكم الصيام “کی تفسیر ہے، خود علامہ سید سلیمان ندوی معارف کے پہلے شذرات کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’رسالہ معارف کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ کے مقدس مہینہ سے شروع کرتے ہیں کہ ہمارے تمام علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب یعنی قرآن اسی ماہ مقدس میں نازل ہوا تھا، شهر رمضان الذى أنزل فيه القرآن“.(۱)

پھر معارف میں آپ کے قرآنی مقالات و مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، جو دوران قیام دارالمصنفین جاری رہا اور قرآن سے متعلق لکھے جانے والے مضامین کو آپ نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا اور جب بھی شذرات لکھتے تو قرآنی آیات کی ترجمانی براہ راست یا بالواسطہ ہو کر رہتی، ذیل میں شائع شدہ مضامین کے عناوین مع سنین ذکر کئے جارہے ہیں:

(۱) قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات اگست و ستمبر ۱۹۱۶ء (۲) آیت استخلاف اکتوبر ۱۹۲۰ء (۳) ارض حرم اور اسکے مصالح و احکام قرآن مجید کی نظر میں نومبر و دسمبر ۱۹۲۳ء (۴) علوم القرآن اپریل ۱۹۲۶ء (الھلال میں شائع مضمون نظر ثانی کے بعد) (۵) لفظ صلاۃ قرآن شریف میں اکتوبر ۱۹۲۷ء (۶) ایام صیام پر نظر ثانی جنوری ۱۹۳۲ء

(۱) شذرات سلیمانی، ج ۲/۱

(۷) قرآن پاک کا تاریخی اعجاز فروری ۱۹۳۹ء (۸) کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟ اکتوبر ۱۹۴۰ء (۹) وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان نومبر ۱۹۴۰ء (۱۰) وحی کی اقسام دسمبر ۱۹۴۰ء (۱۱) حاکم حقیقی صرف اللہ ہے (یعنی اِن الحكم الا للّٰه کی تفسیر) نومبر ۱۹۴۶ء مضامین و مقالات کے علاوہ سیرۃ النبی کی سوم تا ہفتم جلدیں، ارض القرآن اول و دوم۔ منتشر جواہر پارے ان کی قرآن فہمی کی دلیل و برہان ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ جس انداز سے قرآن کی خدمت کرنا چاہتے تھے، وہ انوکھا اور نرالا تھا، بعض وہ کام جو تکمیل کی منزل کو نہیں پہونچے، ان کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد اویس ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

’’سید صاحب کے ذہن میں عصری مذاق کے مطابق قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب و تدوین کا ایک نقشہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ اصول کی رعایت کرتے ہوئے دیانت اور ذہن کی سلامتی کے ساتھ آیات قرآنی پر غور کیا جائے اور ان آیات سے جن کلامی، فقہی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط ہو سکے ان کو احادیث نبویہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) نیز صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کی تشریحات کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا جائے‘‘ (۱)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ’’عقائد القرآن‘‘ اور ’’فقہ القرآن‘‘ کے نام سے عنوان مقرر کر کے کام بھی شروع کرایا تھا اور مولانا محمد اویس ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’فقہ القرآن‘‘ کے نام سے ایک بیاض بھی تیار کی تھی جو راقم کو تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملی۔

علامہ موصوف صرف مصنف و محقق ہی نہیں تھے، بلکہ کامل مربی تھے اور گم کردۂ راہ انسانوں کو منزل تک پہونچانے کا گر اور سلیقہ رکھتے تھے، علامہ موصوف کے زیر اثر ایک نسل بھی تربیت پا رہی تھی، اس وقت دارالمصنفین کا پورا عملہ آپ کی بافیض صحبتوں سے مستفیض ہو رہا تھا، آپ نے علم دوست رفقاء رکھے اور ان کے ذوق کے مطابق ان سے تحقیقی و علمی

(۱) معارف سلیمانؒ نمبر، ۲۷۲-۲۷۳۔

کام لیا، مولانا محمد اویس ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا شروع میں بحیثیت رفیق دارالمصنفین سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن علامہ موصوف کی تربیتی نگاہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مسند تدریس سے اٹھا کر دروس قرآنی اور تحقیقی کاموں کے ذریعہ ان کی ایسی تربیت کی کہ ان کے شاگردوں کے بقول ''ان کو قرآن کا چسکا لگ گیا تھا''، آپ نے مولانا موصوف سے دوران قیام دارالمصنفین علامہ ابن قیمؒ کے تفسیری افادات جمع کرائے جو ''التفسیر القیم'' کے نام سے ایک جلد میں شائع ہوئے۔ اسی طرح ابتدائی دور میں ابومسلم خراسانی کے تفسیری اقوال علامہ رازیؒ کی ''التفسیر الکبیر'' سے منتخب کراکے "ملتقط من جامع التأویل ومحکم التنزیل" کے نام سے شائع کرائے، دوسرے مفسرین کی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ اس بات کے قائل تھے کہ آیات قرآنی کی تشریح وتوضیح احادیث نبویہ ہیں، اس لئے علامہ سید سلیمان ندوی کی تجویز تھی کہ قرآن مجید اور احادیث نبویہ کا بنظر غائر مطالعہ کرکے، احادیث کو ان کے تحت جمع کیا جائے، اسکے لئے انہوں نے بقول مولانا اویس ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم فرمائے تھے۔

پہلا عنوان یہ تھا: الآیات التی استدل بها النبی ﷺ علی ما قاله، اس عنوان کے تحت علامہ سید سلیمان ندوی نے ۵۸/ استدلالات نبوی ﷺ کو جمع فرمایا، مثال کے طور پر چند ملاحظہ ہوں:

(۱) فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم، ثم تلا "انمایخشیٰ اللّٰه من عباده العلماء" (ترمذی تفسیر)

(۲) فلما قضی الصلاة قال: من نسی الصلاة فلیصلها اذاذکرها فان اللّٰه تعالی قال: أقم الصلاة لذکری (ابوداود، کتاب الصلاة)

(۳) نهانا عن الاستخصاء ثم قرأ علینا یأیها الذین آمنوالاتحرموا طیبات ماأحل اللّٰه لکم ولا تعتدوا، إن اللّٰه لایحب المعتدین (بخاری کتاب النکاح)

(٤) إن اللّٰه یملی الظالم ثمّ قرأ: وکذلك أخذ ربك اذا أخذ القری و

هی ظالمة (مسلم، کتاب البر والصلة)

دوسرا عنوان یہ ہے: القسم الثانی من الأحادیث التی تفسّر القرآن بغیر ذکر القرآن اس عنوان کے تحت علامہ سید سلیمان ندوی نے ۲۸/ احادیث کو جمع فرمایا تھا، اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ إیاکم والظن (مسلم) إن بعض الظن اثم

۲۔ إنما هي أعمالکم تردعلیکم وما تجزون الّاماکنتم تعملون

۳۔ أنفق ینفق علیك وماأنفقتم من شیئ فهو یخلفه،"

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی نگرانی میں قرآنیات سے متعلق جو کام ہو چکے ہیں اور وہ ابھی اشاعت کے منتظر ہیں، ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) دارالمصنفین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں شاہ صاحب کے حواشی قرآن اور اصول ترجمہ قرآن نامی رسالہ بھی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی خواہش تھی کہ شاہ صاحب کے ارشادات کو آیات قرآنی سے مدلل کیا جائے اور دوسرے محققین کی کتابوں سے اس کی توثیق کی جائے، اس سلسلہ میں تھوڑا سا کام ان کی حیات میں ہو چکا تھا۔

(۲) قرآن کریم پر ادبی حیثیت سے کام کرنے والوں کی سہولت کی غرض سے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان تمام آیات کو سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے جمع کرادیا تھا، جن سے معانی وبلاغت نیز دوسرے فنون کی کتابوں کے مسائل کی تشریح کے ضمن میں قرآن مجید کے لطائف ادبیہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۳) قرآن نے جن چیزوں کو بطور آیات ذکر کیا ہے انہیں متعلقہ آیات اور قدیم وجدید ماخذ سے ایسے معلومات کے ساتھ جمع کردیا جائے جن سے ان کے آیات خداوندی ہونے کی حقیقت کی وضاحت ہوجائے، ان آیات کو جمع کیا جاچکا ہے، تشریح کا کام باقی ہے۔

(۴) اعجاز قرآنی پر مسلمانوں کے عہد تصنیف سے لے کر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو سنین کی ترتیب کے لحاظ سے سید صاحب نے جمع کرایا تھا۔ یہ مجموعہ ایک جلد میں تیار ہوا۔(۱)

قرآن اور تجدد پسند مسلمان

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے وقتاً فوقتاً قرآن کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا صرف جواب ہی نہیں دیا، بلکہ ان کے ''کارشر'' کو موقوف کر کے چھوڑا، نیاز فتحپوری ایڈیٹر ماہنامہ ''نگار'' نے جب مستشرقین کا راگ الاپنا شروع کیا اور ان کے افکار و خیالات کی ترجمانی کرنے لگا تو ابتداءً علامہ مرحوم نے ''گلہ آشنا'' نام سے ایک مضمون سپرد قلم کیا، چنانچہ مسلمانوں میں ''نیازیت'' سے شدید بیزاری ظاہر ہوئی، اور اس کے خلاف ایسی صدائے احتجاج بلند کی گئی، جس سے اس کو توبہ نامہ شائع کرتے ہی بن پڑی، لیکن چند سال کے بعد جب اس نے توبہ توڑ کر ملحدانہ خیالات کی اشاعت شروع کر دی اور قرآن کو الہامی کتاب ماننے سے انکار کیا، تو ان نیازی ہفوات سے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا، علامہ سید سلیمان ندوی کی غیرت ایمانی متحرک ہوئی اور معارف کے اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۴۰ء کی تین مسلسل اشاعتوں میں بالترتیب ''کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟'' ''وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان اور وحی کے اقسام'' کے نام سے مضامین لکھ کر ان کا مدلل جواب دیا، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''ہماری سعادتوں و ہدایتوں کے سب سے قیمتی خزانہ کا نام قرآن پاک ہے، جس پر بہ اختلاف فرق تمام مسلمانوں کا اتفاق تام اور اجماع عام تھا، اور ہے کہ یہ انسانی وخیالی قصص و حکایات سے بلند تر کی طرف سے آئی ہوئی صداقت کا نام ہے اور اسی سے وہ ہر خطا سے پاک اور ہر غلطی سے مبرا ہے، اس لئے ہر وہ ہاتھ جو اس کی عصمت کو داغدار بنانے کی کوشش کرے گا اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنا ہمارا فرض ہے''۔(۲)

(۱) معارف سلیمان نمبر ۱۹۷۲-۱۹۷۳

(۲) معارف ۱۹۴۰ء

چنانچہ یہ فتنہ دب گیا، لیکن چند سال کے بعد نیاز کی الحاد و بے دینی کی تبلیغ واشاعت پھر شروع ہوئی، بالفاظ دیگر اس نے گڑے مردے کو اکھاڑ کر ۱۹۴۵ء میں ایک اور شگوفہ چھوڑا جس میں ایک انگریز مشنری کلیر ڈ بلوٹسڈل (Dr.Clair W Tisdall) کی کتاب کو بنیاد بنا کر اسلامی تعلیمات کی تردید کا سلسلہ شروع کیا، اور اپنے مزعومات ظاہر کر کے علماء سے جواب مانگا، جس پر متعدد علماء نے مضامین و مقالات لکھے، لیکن بزم معارف کے قلمکار علامہ ندوی کے شذرات اور شاہ معین الدین صاحب ندوی کا مقالہ ''فہم قرآن کے اصول و شرائط'' ایسے مؤثر ثابت ہوئے، جس سے یہ فتنہ ختم ہو گیا اور وہ پاکستان سدھار گئے، پاکستان میں ''نگار'' جاری رہا، بقول محمد اقبال انصاری: ''ملحدانہ خیالات اپنے سینے ہی میں دفن کر لینے پڑے۔''(۱)

غیر معمولی مقبولیت

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی علمی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور عالمی منظر نامہ میں رفتہ رفتہ ان کا وقار محترم اور ان کی حیثیت باوزن ہو رہی تھی، زمانہ آپ کی قرآن فہمی اور علم آفرینی کی داد دے رہا تھا اور پوری قوم ان کی قرآنی نکتہ سنجیوں کی عاشق و شیدا تھی کہ اچانک ایک صاحب جن کا نام جناب امداد صابری ہے،(۲) انہوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں کا شوشہ اٹھایا۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں جب علامہ سید سلیمان ندوی فلسطین کانفرنس کی صدارت کی غرض سے دہلی تشریف لے گئے تو اس کا ذکر سنا، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس رسالہ کو سرسری طور پر دیکھا اور معارف دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس کا مدلل جواب دیا، بقول مالک رام

(۱)(۱) مطالعہ سلیمانی ص:۷۰)

(۲) مولانا امداد صابری دہلی کے صحافی اور اخبار نویس تھے، ولادت اکتوبر ۱۹۱۴ء ذی قعدہ ۱۳۳۳ء میں ہوئی، ساری زندگی صحافت اور سیاست سے وابستہ رہے، آپ کا انتقال دہلی میں جمعرات ۱۳/ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہوا۔(کاروان رفتہ: مولانا اسیر ادروی ص:۴۵)

کہ ’’آپ نے گیارہ غلطیوں کے اس رائی کے پہاڑ کی دھجیاں اڑادیں جس پر برافروختہ ہوکر صابری صاحب نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کردیا، مگر نواب سائل دہلوی نے درمیان میں پڑکر معاملہ رفع دفع کرادیا‘‘۔(۱)

سید صاحب نے اس رسالہ پر اپنے تأثر کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

’’مجھے اس موقع پر دو خوشیاں حاصل ہوئیں، ایک تو یہ کہ میری تصانیف کے ہزاروں اوراق میں بحمداللہ کہ قرآن پاک کی چند ہی غلطیاں ہیں، دوسری یہ کہ مصنف رسالہ اور ایک دو بریلویوں کو چھوڑ کر ان کا برعلماء نے ان کو صرف ’’مسامحات‘‘ قرار دیا، تکفیر والحاد کا فتویٰ نہیں دیا، ع

برین مژدہ گرجاں فشانم رواست

اور یہ مسامحات بھی بیشتر وہی ہیں، جو جامعہ وغیرہ میں پہلے دکھائے جاچکے ہیں، میں بھی اور دلی کے علماء اور ثقات بھی یہ خوب جانتے ہیں، کہ اوراق کے اصلی مصنف کون ہیں، ع

سراین رشتہ زجائے است کہ نمی دانم

ان صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس فریب وسازش سے محافظین حدیث وسنت کو خود ان کے ہم مذہبوں کے ہاتھوں سے قتل نہیں کرایا جاسکتا، اتنی کاوشوں کے بعد بھی جو مواد فراہم کیا گیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ میرے گیارہ اغلاط میں سے دو چھاپنے کی غلطیاں ہیں، جن میں سے ایک کا اعلان حافظ اسلم صاحب جیراج پوری کی تنقید کے جواب میں دوسال ہوئے کہ اسی معارف میں کیا جاچکا ہے کہ میں نے ’’قطّ‘‘ کا ترجمہ چھٹی نہیں بلکہ چٹھی کیا ہے، اور دوسری یہ ہے کہ عربوں کی جہازرانی میں ایک کے بجائے ’’ہرایک‘‘ پڑھئے، جیسا کہ نفس آیت کے ترجمہ میں ہے۔ ارض القرآن میں دو اور خطبات میں جس ایک اہم غلطی پر صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں وہ معترض کی قلت تدبر کا نتیجہ ہیں، بقیہ چھ

(۱) مالک رام مضمون بعنوان علامہ سید سلیمان ندوی، معارف سلیمان نمبر مئی وجون ۱۹۵۵ء۔ص:۔۳۵۶)

غلطیاں یہ ہیں کہ مباحث برزخ میں اہل قرآن کے مقابلہ میں میں نے اقوال مفسرین سے الگ ان آیتوں کے محل سمجھے ہیں، یعنی جو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں، وہ برزخ پر چسپاں کردی ہیں، اور جو پل صراط کے موقع پر لکھی جانی چاہئے تھی، وہ بہشت کے موقع پر لکھدی ہے، اگر اقوال مفسرین سے اتنا بھی اختلاف الحاد ہے، تو مفتی کو تنہا غریب سید سلیمان کے نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء کے الحاد کا فتویٰ دینا ہوگا۔

مسئلہ عدم خلود نار پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی بناء پر اگر یہ ہنگامہ ہے، تو پہلے یہ ہنگامہ بعض مشاہیر صحابہؓ بعض تابعینؒ اور مفسرین کے اور خصوصیت سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف برپا کرنا چاہیے، حافظ ابن قیم نے ’’حادی الارواح‘‘ اور ’’شفاء العلیل‘‘ میں اس پر ۲۵ دلیلیں قائم کی ہیں، اور ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اہلسنت کے ایک گروہ کا یہ مسلک ہے، سید سلیمان کا سوائے اس کے کوئی قصور نہیں کہ اس نے حافظ ابن قیم کے خیالات کی ترجمانی ایک ہزار اردو میں کردی ہے، جن لوگوں کو اس مسلک سے اختلاف ہے ان کو سید سلیمان کے بجائے بعض صحابہؓ بعض تابعینؒ بعض مفسرین اور ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف زور آزمائی کرنی چاہئے۔

بہرحال یہ سب تو غالب کے مقطع کی سخن گسترانہ باتیں تھیں، اب میں رسالہ کے اصلی ونقلی دونوں مصنفوں کو اگر وہ نیک نیت ہیں، تو بشارت اور اگر وہ اس سے محروم ہیں تو یہ پرحسرت پیام سناتا ہوں کہ ان قرآنی غلطیوں کی تصحیح کئی سال پہلے دوسرے ایڈیشن میں کردی گئی ہے، کچھ کی اب کردی گئی ہے اور پہلے ایڈیشن کے جو نسخے اسٹاک میں ہیں ان میں بھی تصحیح کردی گئی ہے اور مسئلہ نار میں جمہور کا مسلک صاحب رسالہ سے زیادہ مدلل ہے اس میں پہلے ہی اضافہ کردیا گیا ہے۔ وأستغفراللّٰہ ربی من کل ذنب وسوء عقیدۃ فی الدین‘‘(۱)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اسی رسالہ کے رد میں رقمطراز ہیں:

(۱) شذرات سلیمانی ج ۳ ص ۱۲۴۔۱۲۶۔

’’سید صاحب نے سیرت اور ارض القرآن میں قرآنی آیات کے سمجھنے میں جو غلطیاں کی ہیں وہ بقول ان کے ’’صرف پڑھنے والوں کے اسلامی عقائد پر مضمر اثر ڈالتی ہیں‘‘ لیکن کیا وہ ان مصنفین سے بے خبر ہیں، جن کی غلطیوں کی اگر انہوں نے جلد خبر نہ کی تو اندیشہ ہے کہ تمام اسلامی عقائد کی دھجیاں اڑا دیں گی (لا سمح اللہ)، سید صاحب بیشک ’’قرآنی آیات کے سمجھنے میں غلطیاں کر جاتے ہیں‘‘ لیکن ایک معصوم وجود کے سوا (روحنا فداہ) اس آسمان کے نیچے کون ہے جس نے قرآنی آیات کے سمجھنے میں غلطیاں نہیں کی ہیں، آپ ایک آیت کی تفسیر کرتے ہیں اور اسکی تائید میں تفسیروں کے نام لکھ دیتے ہیں، کیا یہ تمام تفسیریں مسامحات سے پاک ہیں، اور ان کے مصنفین معصوم تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ایسا نہیں ہے تو پھر بحث ونظر کی کوئی دوسری راہ اختیار کیجئے۔

حیرت کا مقام ہے کہ جب ہمارے مجتہدین عصر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی عقائد اور مذہبی اصول پر تیشے چلاتے ہیں، ابو ہریرہؓ اور ابو ذر غفاریؓ کی تحقیر کرتے ہیں، حدیث وفقہ کو دفتر اساطیر قرار دیتے ہیں تو اس سات کروڑ کی اسلامی آبادی میں صرف ایک شخص کا قلم ہے جو اسلام کا قلم ہے جو اسلام کی حجت اور مذہب کی برہان بن کر نمودار ہوتا ہے، وہ کون؟ مولانا سید سلیمان ندوی‘‘۔(۱)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی صدق لکھنؤ یکم فروری ۱۹۳۷ء میں ایک مبسوط مقالہ ان اعتراضات کے جواب میں تحریر کیا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جنوری ۱۹۴۳ کے معارف کے شذرات میں اپنی تحریری عمر کے چالیس سال مکمل ہونے پر ’’رجوع واعتراف‘‘ کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس سے مذکور مسئلہ کو سمجھنے میں مزید تقویت حاصل ہوگی، ذیل میں اس کا ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے:

’’مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم

(۱) مجلّہ الاصلاح: شعبان ۱۳۵۵، مطابق نومبر ۱۹۳۶ء

اللہ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہوسکی ہے، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی، جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا ہے کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کردی ہے مثلاً معراج بحالت بیداری وبجسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے پہلے نہیں مل سکا، اور بعد کو اللہ تعالی نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلائل سمجھا دی تو دوسرے ایڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کردی، اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی پیروی میں جو کچھ لکھا گیا بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے دلائل کی تشریح کردی ہے اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آ گیا ہے، وما توفیقی إلا باللّٰہ.

علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور قول ثانی کا رواج عام رہا ہے، یہ ان ہی کا اتباع حق ہے، والحق أحق أن یتبع، یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں، بلکہ اللہ تعالی کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ بارالہا! مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ‘‘۔

باب دوم

قرآنی استناد

مکاتیب اور خطوط میں

باب دوم

قرآنی استناد- مکاتیب اور خطوط میں

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زندگی کا اصل محور چونکہ قرآن مجید تھا، اس لئے انہوں نے بحرِ قرآن میں غواصی کی، اور اس سے قیمتی لعل و گہر اور علمی نکات نکالے، علامہ سید سلیمان ندویؒ خطوط ورسائل اور مکتوبات ومقالات، نیز روزمرہ کی گفتگو میں بھی قرآنی آیات سے برمحل استدلال کرتے تھے، یہ ان کی قرآن فہمی کا بین ثبوت ہیں، ذیل میں ایسی مثالیں ذکر کی جارہی ہیں:

مکاتیب سلیمان (مرتب مولانا مسعود عالم ندویؒ)

مولانا مسعود عالم ندویؒ ندوۃ العلماء کے ایک ممتاز فرزند اور عربی واردو کے باکمال ادیب تھے، کئی سال تک ندوہ کے عربی ترجمان ''الضیاء'' کے ایڈیٹر رہے، پھر ایک مدت بجنور سے شائع ہونے والے رسالہ ''مدینہ'' میں شریک ادارت رہ کر خدابخش لائبریری پٹنہ سے وابستہ ہوگئے، تقسیم ہند کے موقع پر پاکستان گئے اور وہیں اسلام کے پرجوش مبلغ وترجمان رہے، ۱۶/ مارچ ۱۹۵۴ء میں راہی آخرت ہوئے۔

مولانا مسعود عالم ندویؒ سید صاحب سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے، جب بھی کوئی اہم کام کرتے تو سید صاحب سے مشورہ ضرور لیتے تھے، زندگی کا کوئی موڑ ہو، سید صاحب چاہے جہاں ہوں، لیکن ان کی مشورہ طلبی کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، جواب میں سید صاحب صرف رسمی خط پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ ایک مربی کے انداز میں

مکتوب نگار کو دین وشریعت کی روشنی میں اچھا مشورہ دیتے تھے، سید صاحب کے ان خطوط کو مولانا مسعود عالم ندوی نے ''مکاتیب سلیمان'' کے نام سے مرتب کیا ہے ذیل میں اسی مجموعہ کے کچھ انمول موتی نذر قارئین ہیں۔

ملت حنیفی کا اتباع:

''وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہئے، تصلب اور تعصب حکم دین میں چاہیئے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں، خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت "بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْن۔ [بقرہ:۱۳۵]"(۱)

مشورہ کا ادب:

''رائے عدل وصداقت کے ساتھ دی جائے، ولو كان ذا قربى. [انعام:۱۵۲]، لیکن ہر شخص کو کوشش کا حق حاصل ہے" كل يعمل على شاكلته [اسراء:۸۴]"(۲)

سرکاری مدارس:

''اچھا ہوا کہ آپ مطمئن ہوکر اپنے کام لگ میں گئے، آپ جہاں جارہے تھے میری تمنائیں آپ کے ساتھ تھیں، مگر میں دل سے اس کو آپ کی ترقی کا میدان نہیں سمجھ رہا تھا، وہ مقام کام کرنے والوں کے لئے موزوں نہیں، ہر روز کے اس میں خرخشے اور جھگڑے ہیں اور خدا جانے کیوں سرکاری مدارس میں علم کی خیر وبرکت نہیں اور تجربے سے بڑھ کر اس کی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْر. [فاطر:۱۴]"(۳)

---

(۱) مکاتیب سلیمان ص ۱۱۴-۱۱۵

(۲) ایضاً ص:۱۲۱

(۳) ایضاً ص:۱۲۲ لفظ ''جہاں'' سے اشارہ ہے مدرسہ شمس الہدیٰ کی پرنسپلی کی طرف

حب جاہ ودنیا:

''ہمارے علماء کا ظرف ذرا چھوٹا ہوگیا ہے، اسی کی سب خرابیاں ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ حُب جاہ وحب دنیا نے ہم کوحق کی طرف سے پھیر دیا ہے، زخارف دنیا پر ہم مٹتے رہے ہیں، اوراسی کو اپنا کعبۂ مقصود بنالیا ہے۔ کَلَّا بل تحبون العاجلة و تذرون الآخرة، [قیامہ:۲۰] اس معیار سے ہم سب کو اپنے اپنے نفس کو جانچنا چاہیے اور اگر نہ پائیں تو اس کے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔'' (۱)

ترقی کا محور:

''مجھے پہلی دفعہ یہ محسوس ہوا کہ آپ کے قلب میں تأثر کی استعداد ہے، یہ معمولی چیز نہیں ہے، بہت اہم ہے، جس قلب سے یہ صلاحیت جاتی رہتی ہے، اسی کی نسبت ہے: بل طبع الله علی قلوبهم اور ختم الله علی قلوبهم، کیونکہ آئندہ کی ترقی بلکہ ساری ترقی اسی تخم صالح کے نشوونما کا نتیجہ ہے۔ (۲)

علم صحیح اور عمل صالح:

''عزیز من! عقل یہیں رہ جاتی ہے وہ ساتھ نہیں جاتی ہے جو چیز ساتھ جاتی ہے وہ صرف علم صحیح اور عمل صالح ہے، آپ نے اپنی علالت اور ضعف پر جس بنا پر تحسر ظاہر کیا ہے، یہ دوسری دولت آپ کے پاس ہے، تحسر کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس کو نہ ملنے یا اب تک نہ پاسکنے کا دلی افسوس ہے اور یہی دلی افسوس توبہ وانابت کا دروازہ ہے: "واتبع سبیل من أناب إلیَّ" [لقمان:۱۵] کی دعوت ہر ایک کے لئے عام ہے۔'' (۳)

---

(۱) ایضاً ص:۱۲۲۔۱۲۳
(۲) مکاتیب سلیمان ص:۱۴۸
(۳) ایضاً ص ۱۴۸

دین کی روح:

''دین کو تمام تر سیاست اور نظام سیاست وعمران بنانے سے ڈر لگتا ہے کہ اس کو اس قدر اہمیت نہ دے دی جائے، یا متأثر حلقہ پر یہ اثر نہ پڑ جائے کہ دین کے وہ اجزاء جن کا تعلق دین کے ماوراء مادی حقائق اور عبادات سے ہے وہ یکسر بیکار اور تہی مایہ معلوم ہونے لگیں، اس اندیشہ کی تھوڑی سی تصدیق ایک صاحب کی گفتگو سے ہوئی، جس سے یہ مقصود تھا کہ یہ ظاہری الٹی سیدھی نماز اور روزہ کے اصل قیام نظام دینی کے بغیر بے کار ہیں، میں نے سمجھا کہ بے چارہ ابھی شدھ ہوا ہے جوش میں اس کو ایسا نظر آتا ہے۔ بہرحال یہ میرے اندیشے تھے اور ہیں، تاہم میں کیا اور میرا اندیشہ کیا، صرف اپنا بچاؤ ہے، وما أملك إلا نفسي" [مائدہ :۲۵]. (۱)

دہری بعثت:

''حضور کی بعثتیں'' کی تعبیر صحیح ہے، ایک خود حضور کی بعثت، پھر حضور ﷺ کی امت کی بعثت سائر الامم کی طرف بحکم کنتم خیر أمة أخرجت للناس". [آل عمران:۱۱۰] (۲)

اگلوں کے عیوب سے چشم پوشی:

''اب اگلوں کے معائب ٹٹولنے سے کوئی فائدہ نہیں، اس زمانہ کے مسلمانوں کے عیوب کھولئے اور اصلاح کیجئے، بلکہ تاریخ کے گذشتہ دفتر کھنگالنے سے آج کوئی فائدہ نہیں۔ ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذین سبقونا بالإیمان". [حشر:۱۰] (۳)

اخلاص، کردار اور دینداری کی اصل قیمت:

''انسان میں اگر اخلاص، کردار اور دین داری ہو تو وہ غیر مسلح ہونے پر بھی غیر مسلح

---

(۱) ایضاً ص:۱۶۵۔۱۶۶
(۲) ایضاً ص:۱۸۱
(۳) مکاتیب سلیمان ص:۱۹۰

نہیں ہے، ضرورت ہے کہ اسوۂ یوسف اپنے پورے ظاہری ومعنوی رنگ میں ہو، میرا ذکر ان محفلوں میں کرنا بجز آپ کی شرافت اخلاق کے اور کچھ نہیں ہے، آپ کے لئے ہر وقت دعائے خیر ہے، آپ بھی یہ دعائے یوسفی پڑھا کریں: فاطر السموات والأرض، أنت ولی فی الدنیا والآخرة، توفنی مسلماوألحقنی بالصالحین."[یوسف:۱۰۱](۱)

الجھن میں نہ پڑنا:

''بے شبہ ایسے ہی آدمی (عام آدمی کے بجائے ایک باصلاحیت ندوی کا انتخاب) کی ضرورت ہے جس کو آپ نے پسند کیا ہے، معاوضہ ماہانہ بھی ٹھیک ہے، آپ ان باتوں سے الجھن میں نہ پڑیئے اور نہ اس کو کسی شخصی کشمکش کا نتیجہ خیال کیجئے، "إن بعض الظن إثم"[حجرات:۱۲] یاد رہے۔''(۲)

فیصلہ میں احتیاط:

''معارف میں ''دارالحرب میں سود'' کے مسئلہ پر جو کچھ چھپ رہا ہے وہ مولانا ظفر احمد صاحب کے جواب میں ہے، امید ہے کہ مولانا ممدوح اس کا جواب دیں گے، جس سے شبہات کا ازالہ ہوگا، مگر اس سے صاحب مقالہ کے باب میں آپ کا سوءظن صحیح نہیں، اور "إن بعض الظن اثم" [حجرات:۱۲] کی تہدید کی بناء پر ایسے فیصلہ میں احتیاط ضروری ہے، یہ مسئلہ تو ان کا نہیں، یہ تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا ہے، اگر آپ اس کو صحیح نہیں سمجھتے تو جواب لکھیں کہ دوسروں کا بھلا ہو۔''(۳)

حالات کا قرآنی منظر نامہ:

''آپ کے اور آپ کی جماعت کے مزید احوال کا دل طالب ہے، "تلك الأيام

(۱) ایضاً ص:۲۲۸ ''محفلوں'' سے اشارہ جماعت اہل حدیث کی نشستوں کی طرف ہے۔
(۲) ایضاً ص:۱۱۴
(۳) مکاتیب سلیمان:۱۹۶۔۱۹۷

نداولها بين الناس"[آل عمران:۱۴۰] کا ظہور تام ہے، اور وہ وہ چیزیں نظر سے گذر رہی ہیں، جن کا وہم بھی نہ تھا، أعو ذ بالله من شرِّماخلق."(۱)

خبر گیری تعلق خاطر کا ایک رمز:

''معلوم نہیں آپ کے ''ہمسایہ'' کا کیا حال ہے، مجھے اس کا بڑا تعلق خاطر رہتا ہے ولله الأمرمن قبل ومن بعد.[روم:۴]"(۲)

ہمت مرداں، مدد خدا:

''الضیاء کی تعویق سے تکلیف ہے، اب نئے سال سے ہمت کرو، اللہ مددگار ہے، إن تنصروا الله ينصركم .[محمد:۷]" (۳)

ندوہ میں بورڈنگ کی تعمیر:

''خدا کرے ایک سال میں چار پانچ ہزار ہاتھ آجائیں اور کچھ بورڈنگ بن جائے (إن أجری الاعلی الله) اخراجات آپ اس رقم سے وصول کر سکتے ہیں۔''(۴)

طلب رضا کا شعور:

''طلب رضا اور اپنے ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا، یہی اس طریق کا حاصل ہے، اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہوجاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو نسبت کہتے ہیں، اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر "یحبهم و یحبونهٗ [مائدہ:۵۴]" اور " رضی الله عنهم ورضوا عنه [مائدہ:۱۱۹]" کے لفظوں میں کی گئی ہے" یأیتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضیةمرضیة [فجر:۲۸]" ان

(۱) ایضاً ص:۲۰۵
(۲) ایضاً ص:۲۱۲
(۳) مکاتیب سلیمان ص/۶۸
(۴) مکاتیب سلیمان ص:۱۰۱، علامہ سلیمان ندوی نے ''رحمت عالم'' کی آمدنی ندوہ میں چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ کے لئے وقف کی تھی۔

ہی کے لئے نوید بشارت ہے۔''(۱)

نام ونمود سے عمل باطل ہوجاتا ہے:

''نام ونمود کی خواہش جس کا شرعی نام ریاوسمعہ ہے یہ حقیقت عمل کا مبطل ہے، الرياء هو الشرك الخفي، کیونکہ اعمال خیر کی حقیقت ابتغاء مرضاة اللہ ہے، اور جب اس میں شرکت ارضائے مخلوق اور طلب شہرت کی ہوگی تو شرک فی القصد ہوگیا، اور اللہ کی نگاہ میں وہ كسراب بقيعة يحسبه الظمأن ماءا [نور:۳۹] أو كرماد اشتدت به الريح [ابراہیم:۱۸]، اس جذبۂ ریاوسمعہ کے قلع وقمع کے بغیر اخلاص فی الدین پیدا نہیں ہوسکتا، اور مخلصين له الدين [اعراف:۲۹] کے سعادتمند گروہ میں داخلہ ممنوع، أفرأيت من اتخذ إلهه هواه [جاثیہ:۲۳]، اسی ھوی کے روکنے کا نام صوفیوں کی زبان میں مجاہدہ ہے: و نهى النفس عن الهوى [نازعات:۴۰] کا اشارہ ادھر ہی ہے۔''(۲)

سلف کی راہ سے سرموتجاوز نہ ہو:

''بسم اللہ کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت دے، میں تو اپنے کو عمر کی اخیر منزل میں سمجھتا ہوں، ساٹھ سے جو اوپر ہوا ہے، اس کی عمر کا پیالہ لبریز ہی سمجھئے، اگر کوئی تسکین کا سرمایہ ہے تو آپ جیسے چند محبین کا وجود ہے، استاد مرحوم نے اگر دو تین یادگاریں چھوڑیں جنھوں نے ان کے کام کو چلایا تو مجھ جیسے ننگ سلف کے بعد بھی کچھ خدام دین وملت باقی رہیں کہ والباقيات الصالحات خير عند ربك ثوابا [مریم:۷۶] کا مژدہ تقویت روح کا باعث ہو، سلف کی راہ سے سرموتجاوز نہ ہو، یہی اپنی وصیت ہے اور یہی زندگی کی آخری فرمائش۔''(۳)

---

(۱) مکاتیب سلیمان ۱۷۶

(۲) مکاتیب سلیمان ۱۷۶۔۱۷۷

(۳) مکاتیب سلیمان: ۱۷۷۔۱۷۸

تصوف اور احسان کی حقیقت:

''لفظ تصوف کا احسان کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے حکمت کے ساتھ لفظ فلسفہ بول دیا جائے، یا آج کل سائنس یا فلاسفی کہہ دیا جائے۔ بزرگوں نے لفظ احسان کو ان معنوں میں رکھا ہے اور ٹھیک ہے کہ اس کا ورود حدیثوں میں ہے، لیکن اب تو مجھے اس کے لئے تقوی اور ارتقاء کی اصطلاح اچھی معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ورود قرآن پاک میں بکثرت ہے اور عبادات بلکہ تمام مامورات الہیہ کا مقصود ہی کیفیت کا حصول معلوم ہوتا ہے، ولا يخفى ذلك على من يتبع كتاب الله، يأيها الناس اعبدوا ربكم الذى خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون [بقرہ:۲۱]، كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون [بقرہ:۱۸۳]، حج وقربانی: ولكن ينا له التقوى منكم [حج:۳۷]، تعظیم شعائر: و من يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب [حج:۳۲]، آغاز کتاب هدى للمتقين. وغیرہ۔''

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ حصول تقویٰ، حقیقت تقویٰ، شرائط تقویٰ، طریق حصول تقویٰ، ازالۂ موانع تقویٰ، تقوىٰ في الايمان بالله، وأسمائه و صفاته و أنبيائه و كتبه و ملا ئكته واليوم الآخر اور تقوىٰ في العبادات والمعاملات والأخلاق و كيفيات القلوب التى هي الإخلاص في الدين کو بھی عقائد وفقہ کی طرح مدون کر دیا جائے، چنانچہ محدثین وصلحائے امت نے یہی کیا ہے، امام ترمذیؒ کی ''کتاب الزہد والرقاق'' پڑھیں، امام احمد کی ''کتاب الزہد'' اگر نہ مل سکے تو ''کتاب الصلاۃ'' پڑھی جائے، تو حقیقت واضح ہوجاتی ہے، سورۂ واقعہ پڑھئے، اللہ تعالیٰ نے تین گروہوں کے نام لئے ہیں: و كنتم أزواجا ثلاثة [واقعہ:۷]، اس کی تفسیر آگے ہے: اول مقربین، أولئك المقربون [واقعہ:۱۱]، دوم اصحاب الیمین اور سوم اصحاب الشمال [واقعہ:۴۱]، تیسرا گروہ اہل نار کا ہے، دوسرا گروہ عامۂ مسلمین کا اور پہلا خواص امت کا، فأما إن كان من المقربين فروح وريحان و جنة نعيم و أما إن كان من أصحا ب اليمين فسلام لك من

أصحاب اليمين، و أما إن كان من المكذبين الضالين فنزل من حميم و تصلية جحيم.[واقعہ:۸۹ ۹۲]

اہل فن عام مسلمانوں کی کیفیت کو ولایت عامہ اور مقربین کی ولایت کو ولایت خاصہ کہتے ہیں، ولایت عامہ جو واللہ ولی المؤمنین[آل عمران:۶۸] کا منشا ہے، ہر مسلمان کو حاصل ہے اور اس کا مفاد نجاۃ من النار اور دخول فی الجنة و لو بعد برھة من العذاب ہے اور ولایت خاصہ جو واللہ ولی المتقین [جاثیہ] کا منشا ہے وہ بعد من النار بفضل اللہ دائما اور دخول جنت فی الفور مع رضوان اللہ تعالیٰ، رضی اللہ عنھم و رضوا عنه، اب معلوم ہوا کہ احسان کا درجہ ایمان سے اونچا ہے اور اس کے بے انتہا مدارج ہیں، مدارج قرب واقربیت کمالا تخفی ،جس طرح ایمان کا حصول شہادت پر مبنی ہے۔ احسن کا قرب کمال ایمان وتقویٰ پر ہے۔ اسی سے ان حدیثوں کے معنی مفہوم ہوں گے، جن میں یہ آتا ہے: لایؤمن أحد کم حتی یکون، کذا، اور ایمان کی ستر شاخیں ہیں۔ الغرض ہمارے علمائے ظاہر نے صرف اس ایمان پر توجہ فرمائی ہے جو کفر کے بالمقابل ہے اور علمائے باطن نے اس کے بعد کی منزل کی رہبری کی اور درجات ومدارج قرب کی نشان دہی فرمائی۔

اب آپ کے چار شبہے ہیں: (۱) ذکر وشغل کے غیر ماثور طریقے (۲) بیعت کا رسمی طریقہ (۳) خوابوں پر اعتبار۔ (۴) توسل بالذوات۔ اول کی نسبت عرض ہے کہ غیر ماثور طریقے ہر گز اختیار نہ کریں، مگر ماثور وغیر ماثور کی تحقیق کر لیں، اور بدعت شرعی کی حقیقت سمجھ لیں، بیعت کا رسمی طریقہ غیر ضروری ہے، یہ میں نہیں کہتا، بلکہ ہمارے بزرگوں کا ارشاد ہے، خوابوں پر اعتبار مبشرات کی حد تک ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے اور لھم البشریٰ فی الحیاة الدنیا والآخرة [یونس:۶۴] کی تفسیر میں وارد ہے۔ اس کے علاوہ خوابوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرد فقہ وحدیث وکلام واسرار اور رموز شریعت ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں ان کا پایہ ان کے دوسرے علوم کے مطابق نہیں ہے، اس لئے ان سے نہ گھبرائیے اور نہ ان کی صوفیانہ کتابوں کی طرف توجہ کیجئے۔(۱)

کوشش رنگ لاتی ہے:

خوشخبری یہ ہے کہ نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے سو روپیہ کا چیک اور نواب صدر یار جنگ نے ۵۰ کا چیک آپ کے رسالہ (الضیاء) کے لئے بھیجا ہے، اس طرح تین مہینہ کا یہ سامان اور ہوگا، یاد رکھو: وأن لیس للإنسان إلا ما سعی[نجم:۳۹].(۲)

خموشی بہتر ہے:

آپ کے مجدد صاحب کے رسالہ میں میرے متعلق جس طرح لکھوایا گیا ہے، ملاحظہ سے گزرا ہوگا، میری بات اگر ابنائے زمانہ کے دل میں نہیں اترتی تو خموشی بہتر ہے، باقی میری ذات پر ہمز ولمز و کانوا یستفتحون، اور انجیل وغیرہ کا جو نیا ادب پیش کیا جارہا ہے وہ ہمارے دوستوں کے لئے امید ہے کہ باعث ابتلا نہ ہوگا۔(۳)

ندوہ کے مندوب:

بہار کے طلبہ کے لئے آپ کو ممتحن داخلہ بنا رہا ہوں، ہر رطب ویابس طالب علم کو رجماً بالغیب لے لیا جاتا ہے، اب بہار کا ہر طالب علم آپ کی پسند کرنے کے بعد داخل ہوگا، ڈاکٹر (سید عبد العلیؒ) صاحب کو لکھ دیا ہے(۴)۔

تقویٰ کا راستہ:

بار بار اپنی خوشی وراحت اور اپنے کسی فضل پر اللہ تعالی کی حمد اور اس کو من جانب

(۱) مکاتیب سلیمان: ص۱۷۴۔۱۷۶۔ (۲)(مکاتیب سلیمان: ۴۸)
(۳) مکاتیب سلیمان: ۱۲۴۔ رسالہ ترجمان القرآن میں قمر الدین خاں صاحب نے ایک تلخ مضمونچہ لکھا تھا۔
(۴) ایضاً: ۱۴۹

اللہ فضل محض بلا استحقاق کرنا ہی احسان کا زینہ ہے، جس کا رسمی نام تصوف ہے، ولا مشاحۃ فی الاصطلاحات، ہم نے اب اس کا نام طریق تقوی رکھنا چاہا ہے، اسلام، ایمان اور احسان یا اتقاء تین ارتقائی منازل ہیں، اسلام اطاعت ہے، ایمان اس اطاعت پر سکینت اور طمانیت ہے، اور ارتقاء یا تقوی دل کی وہ کیفیت ہے، جس سے امور زیر ایماں پر عمل بسہولت پر مداومت قائم ہو جائے۔ وللہ الحمد .(۱)

علم کو صرف علم کی خاطر چاہنا قلبی جہل:

بے سود مناظرہ کو اضاعت وقت سمجھنا بڑی یافت ہے، جس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، ساتھ ہی علم کو صرف علم کی خاطر چاہنا قلبی جہل ہے، خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس حقیقت کو پالیا، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول جس کو علامہ ابن عبدالبرؒ نے جامع میں نقل کیا ہے، اس موقع پر پیش نظر [رکھنا] مفید ہوگا، فرمایا: نحن لا نشتغل فیما لیس تحته عمل، گویا آج کل کے محاورہ کے مطابق ادب برائے ادب کا تصور ذہنی عیاشی ہے اور دراصل ادب برائے زندگی ہی حق ہے، مگر کون سی زندگی؟ وہ زندگی جو اسلام کا مطلوب ہو۔ فی الحیاۃ الدنیا والآخرۃ .

آپ کے جوان دوست کا خط پڑھ کر متاثر ہوا۔(۲)

ان کے افکار وجذبات بالکل صحیح و درست ہیں، اللہ تعالی ان پر مزید حقائق منکشف فرمائے، اور علم کے مطابق عمل کی مزید توفیق ملے۔ جزاہ اللہ تعالی، بڑے کام کی بات آپ کو لکھی ہے۔ الدین النصیحۃ للہ ولرسولہ وللمؤمنین . (۳)

ایثار وقربانی:

اشتراکیت کے لئے ۹۵ روپئے بھجواتا ہوں، اور ۲۵ ندوہ کے لئے دیئے،

(۱) مکاتیب سلیمان: ۱۷۰

(۲) اشارہ ہے ملک غلام علی صاحب معاون امیر جماعت اسلامی لاہور کی طرف۔

(۳) ایضاً ص: ۱۷۰=۱۷۱۔

ویؤثرون علی أنفسهم ولو کان بهم خصاصة [حشر:۹] کی پیروی مبارک ہو، ایک کاغذ کو نمونہ بھیجتا ہوں۔(۱)

مراقبہ کا مفہوم:

آپ کچھ نہ کیجئے، صرف اس قدر کیجئے
یک دمے تو درکمین خود نشیں!

کسی وقت کو مقرر کر کے ألم یعلم بأن اللّٰه یری [علق:۱۴] کے مضمون کو سوچا کیجئے، اسی تفکر کا اصطلاحی نام مراقبہ ہے، اس تصور کا اثر اعمال پر پڑے گا اور ہر عمل پر اس حیثیت سے عمل زور پڑنے لگے گی کہ سب کچھ اس کے سامنے ہے، اب حق و باطل، صحیح وغلط اور جائز و ناجائز پر غور کرنے کا رخ بدل جائے گا اور ہر عمل کے وقت دل کو ٹٹولنے لگیں گے کہ میرے اس عمل کا قلبی مقصد کیا ہے، اس سے حسن نیت پیدا ہوگا اور حدیث شریف کی یہ حکمت کھل جائے گی: ألا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله، کیا یہ بدعت ہے؟ غور کیجئے اور ہو سکے تو عمل کیجئے۔(۲)

توسل کی حقیقت:

توسل بالذوات بے شبہ جائز ہے، احیاء میں تو کلام کسی کو نہیں، جس طرح حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے توسل سے استسقاء کیا، رہ گیا اموات کے ساتھ، اموات کے ساتھ توسل کے یہ معنی ہے کہ ان کے اعمال خیر ومقبولہ سے توسل کیا جائے۔ جس طرح اپنے اعمال خیر سے توسل جائز ہے، جیسا کہ حدیث الغمار سے ثابت ہے، کما رواہ البخاری، اسی طرح دوسرے احیاء واموات کے اعمال خیر سے بھی، وابتغوا الیه الوسیلة [مائدہ:۳۵] کی تفسیر بھی توسل بالاعمال سے کی گئی، البتہ اموات سے خطاب کر کے اگر مستقلا ان سے مانگا جائے تو یہ شرک ہے، اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ میرے لئے وہ خدا

(۱) ایضا: ص ۱۷۱

(۲) مکاتیب سلیمان ص: ۱۴۸۔۱۴۹

سے دعا کریں، تو اہل دیوبند جائز سمجھتے ہیں، لیکن میں اس کو بدعت سمجھتا ہوں، کہ یہ طریق دعا منقول وثابت نہیں، علامہ آلوسی نے (روح المعانی) آیت کریمہ وابتغوا الیه الوسیلة کی تفسیر میں اس کو بدعت کہا ہے، بعد کو شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتاوی میں بھی یہ ملا۔ مولانا تھانوی بھی یہی فرماتے ہیں۔ اور بعد کو ان راویوں کے توافق سے مجھے تسکین ہوئی۔

شرک یہ ہے کہ خدا کی ذات وصفات وعبادات میں کسی کو شریک بنایا جائے۔ توسل بالذوات الی اللہ تعالی شرک فی الذات ہے نہ فی الصفات نہ فی العبادات۔ اصحاب نجدیہ کہتے ہیں، تو یہ ان کا غلو ہے۔(۱)

ہاں اگر ذوات سے کوئی یہ سمجھ کر توسل کرے کہ اللہ تعالی ان کی درخواست کے سامنے مجبور ومضطر ہے، تو بے شبہ یہ شرک ہوگا اور اگر یہ سمجھ کر کے کہ یہ جامع اعمال خیر ہیں، اور ان کے اعمال بظاہر مقبول ہیں، تو ان کی ذات سے خدا کی طرف بہ سبب ان کے اعمال کے توسل کیا جائے کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالی میری دعا قبول فرمالیں، تو یہ جائز ہے، مگر حضرت عمرؓ کے فعل سے کہ انہوں نے توسل بالنبیؐ کے بجائے توسل بعم النبی فرمایا، یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ امر قابل احتراز ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انہوں نے عم النبی سے کیوں توسل کیا، کسی اور صحابی سے کیوں نہیں کیا، بالآخر عم النبی کی مقبولیت عند اللہ میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی تھی ملحوظ رہی، اور بالآخر بواسطہ توسل بالنبی ہی ہوا، فافہم (۲)

افراط وتفریط قبیح عمل:

مسائل میں تفریط جس طرح مذموم ہے، افراط بھی اسی طرح قبیح ہے، ایاکم والغلو فی الدین وفی کتاب اللّٰه، لا تغلوا فی دینکم.

موسیقی سے میری مراد ظاہر ہے کہ صرف غنا اور تغنی ہے، موسیقی فن تقاطیع اصوات

(۱) اصحاب نجد بھی اسے شرک نہیں کہتے۔ یوں اس باب میں قول فصل امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) کی (قاعدة جليلة فی التوسل) ہے۔

(۲) مکاتیب سلیمان ص:۱۳۲

کا نام ہے، جس سے کن پیدا ہوتا ہے اور لقد أوتيت مزما را من مزامير داود کی شان نمودار ہوتی ہے، ومن لم يتغن بالقرآن فليس منا کی تنبیہ بھی موجود ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع جواری وجاریات وانا شید شعراء کی روایات صحیح موجود ہیں۔ اور خصوصا اوقات نکاح میں غنا کا استحباب ثابت ہے، الفرق بين الحلال والحرام الصوت کی حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہے. بہر حال مقصود اس غنا کی غفلت اور لہو الحدیث کی محبوبیت نہیں، بلکہ مسئلہ کو اپنی جگہ پر رکھنا ہے، بے شبہ قین وقینات اور مغنی ومغنیات پیشہ ور کے وجود کو اسلام نے پسند نہیں کیا ہے، یہی حال دیگر فنون لطیفہ کا ہے کہ ان کا استکثار اور ان کی طرف شدت انہماک ممنوع ہے، شعر کی برائی قرآن وحدیث میں ہے، اور آپؐ نے اس کو سنا بھی ہے اور حکم دیا ہے کہ شعرائے کفار کا رد کیا جائے، تعمیر کی برائی بھی آئی ہے، اور من بنى لله مسجدا بھی ہے، ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہی ہے کہ بقدر ضرورت جائز اور استکثار وشدت انہماک ناجائز اور ذی روح کی تصویر تو قطعا گناہ ہے، یہ تمدن اسلامی کا جزء اسی طرح ہوسکتا ہے جس طرح کوئی شراب سازی کو بنائے۔ لیکن غنا، تو وہ تو اعراس واعیاد میں کم از کم مباح ہے، دونوں کا حال یکساں نہیں۔

بے شبہ مسئلہ غنا میں احناف واہل عراق کا مسلک بہت سخت ہے، لیکن اہل مدینہ اور اہل حدیث اس قدر سخت نہیں۔ آپ مسئلہ کی تحقیق کریں، اور ابن حزم اور دیگر اہل حدیث جیسے ہندوستان میں نواب صدیق حسن خاں کے اقوال پڑھیں۔ ان کی کتاب دلیل الطالب میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے، یہ تفصیل آپ کی اہل حدیثی میلان طبع کی تحقیق دلچسپی کے لئے لکھ دی ہے، ورنہ حق آپ کے ساتھ ہے، مجھے لکھتے وقت بھی یہ فقرہ کھٹکا تھا مگر بے پروائی سے رہ گیا۔(۱)

یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا، باطل کی تھوڑی سی رواداری بھی ضرر سے خالی نہیں، تاہم یہ

(۱) آل انڈیا ہسٹری کانفرنس، مدراس کے شعبہ اسلامی تاریخ کی صدارت کرتے ہوئے، حضرت الاستاذؒ نے موسیقی کو بھی مسلمانوں کے خدمات فنون لطیفہ میں شمار کیا تھا، خادم نے اس پر توجہ مبذول کرائی تھی، مسعود عالم۔

خیال میں رہے کہ شعر کی ناپسندیدگی سے جس طرح عروض اور فنون شعر کو آپ برا نہیں کہہ سکتے اور نہ تعمیر کی ناپسندیدگی سے علم بناء و ہندسہ حرام ہے، یہی حال فن تقاطیع اصوات کا ہے، اور جس طرح شعر کے حسن و قبح پر حضرت عائشہؓ کا تبصرہ حسنه حسن و قبيحه قبيح نہایت جامع ہے، ایسے ہی غناء و تغنی کا حال ہے، پیشہ حرام، اس کی کمائی حرام، اس میں انہماک حرام، تجوید قرآن میں صحت مخارج کے وہ تحسین صوت کے قواعد کافی الجملہ لحاظ ہے، گویا اس میں تکلف و تشدق حرام دیکھئے جس طرح عبارت بلیغ فصیح جائز، لیکن عبارت وکلام میں تکلف و تشدق و تصنع ناپسندیدہ، بلکہ منہی وممنوع، لیکن اس سے فصاحت و بلاغت و بدیع وسجع وقافیہ حرام نہیں، فليتنبه، امید ہے کہ آپ میرے مغز سخن تک پہنچیں گے اور خیال میں اعتدال پیدا کریں گے۔

دوسرا مسئلہ وطنیت کا ہے، ابھی تک آپ نے شاید اس کی حقیقت کی تعیین کی کوشش نہیں کی ہے، اپنے وطن سے انس ومحبت امر طبعی ہے اور شرع شریف نے اس جذبہ کی ممانعت نہیں کی ہے اور حنین الی الاوطان کی نہی وارد نہیں، هذا جبل نحبه ويحبنا أو كما قال عليه الصلاة والسلام، اس پر شاہد ہے اور وطن سے بلاضرورت سفر کی نہی مروی ہے، الغرض وطن کی محبت اور اس کی طبعی اور اللہ تعالی کی بخشی ہوئی واقعی خوبیوں کی قدر خلاف شرع نہیں، ورنہ ان تمام ائمۂ اعلام کی نسبت آپ کیا فیصلہ کریں گے جنہوں نے اپنے اپنے شہروں کے فضائل اور اخبار وحوادث تاریخ جمع کئے ہیں، تاریخ دمشق ابن عساکر اور تاریخ بغداد خطیب وغیرہ کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، کیا یہ صحیح نہیں کہ آپ کو اپنے وطن بہار سے جو انس ومناسبت ومحبت ہے، وہ دوسرے صوبوں سے نہیں، اور اس کے فضائل پر قصیدہ خوانی کر چکے ہوں گے یا کر سکتے ہیں۔

وطنیت نام ہے، وطن کو حقوق انسانی اور سیاست سلطانی میں مرکز تقسیم ماننے اور ''میرا وطن'' اور ''میری قوم'' کے نعرہ کو دوسرے ممالک اور اقوام پر غلبۂ واستیلاء اور حکم کے لئے دلیل بنانے اور عدل وانصاف کی راہ میں اس کو مابہ الامتیاز قرار دینے کا، اور اس کے

لئے کفر وشرک اور مراسم کفر وشرک کی تقدیس وتمجید، اور اہل وطن کو خواہ وہ کافر ومشرک ہوں، اہل دین پر ترجیح دینے کا غرض وطن کو مدار حکم بنانا، یہ ہے وطنیت جس کی ممانعت ہے، نہ کہ کسی کا اپنے وطن کے بعض فضائل کا اعتراف وبیان۔(۱)

ذرا سخاوی کی مقاصد حسنہ میں حب الوطن من الایمان پر نوٹ ملاحظہ کیجئے۔ معناه صحيح وان كان لا أصل له لفظا، كما أشارت إليه الآية وقد أخرجنا من ديارنا .....

اب آپ کے تیسرے شبہ پر آتا ہوں، میری نسبت اتنی بدگمانی تو آپ کو نہیں ہوسکتی کہ میں عربیت کے ذوق سے کورا ہوں، ابھی مولانا مناظر صاحب کی تعلیم وتربیت کی تنقید میں آزاد(۱) بلگرامی کی عربیت پر میری رائے آپ پڑھ چکے ہیں(۲)۔

میں نے ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا عربی شاعر وسعت کلام کی بناء پر کہا ہے، کیا ان کے علاوہ آپ نے ہندوستان کے کسی شاعر کا ان سے پہلے کوئی چھوٹا سا عربی دیوان بھی دیکھا ہے؟ پھر جس نے مثنویوں کے علاوہ جس کے بھی متعدد حصے ہیں، دس دیوان یادگار چھوڑے ہوں اس کو ہندوستان کا سب سے بڑا عربی شاعر نہیں کہیں گے؟ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کے اشعار وقصائد بھی آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے، ان کی نظم کو حجۃ اللہ البالغہ کی نثر سے تول کر دیکھئے، کہ جس کی نثر ایسی ہے، اس کی نظم کیسی ہے؟

" تحزب " و " تعصب للتخريب" مدارس کی طرح جماعت کا بھی پسندیدہ نہیں، بغضك يعمى ويصم وكذلك حبك للشئ يعمى ويصم ٹھیٹھ اسلامی سیاسیات عملا غلبہ واستیلاء اور ضعف ودہن وانحلال ہر دو موقعوں پر یکساں نہیں ہے، قبل الفتح وبعد الفتح کی سیاستیں یقیناً الگ تھیں، آپ کی جماعت جس کام کے لئے کوشاں ہے اس کی کامیابی کا بندہ بھی خواہاں ہے، اور اگر مجاہد نہیں تو داعی مجاہدین ہے، مگر عملیت کے

(۱) (اس باب میں حضرۃ الاستاذؒ کا بیان واضح تھا، البتہ خطبہ کے اسلوب بیان سے غلط فہمی ہوسکتی تھی، اس لئے توضیح کی درخواست کی گئی مسعود عالم ندوی)۔
(۲) میر غلام علی آزاد بلگرامی۔

بغیر تنہا نظریت میں شدت افراط وتفریط سے خالی نہیں، مداہنت ناجائز ہے، مگر مہاونت جائز ہے، ہندوؤں کے خوش کرنے کے لئے اسلامی نظریات سے اعراض کفر ہے، لیکن ہندوؤں کے ساتھ انصاف برتنا اور وطن کے مختلف عناصر میں صلح ومعاہدہ خلاف شرع نہیں، اور نہ بحکم شرع ان سے حسن مفاہمت اور حسن مجاورت ومجاملت ممنوع ہے۔(۱)

وحدۃ الوجود کی حقیقت:

وحدۃ الوجود کے باب میں آپ نے کئی دفعہ پوچھا، وحدۃ الوجود کی کئی تشریحات ہیں، اور ان کے اختلاف معنی کی بناء پر حکم بدل جاتا ہے، انہی میں سے ایک وہ ہے جس کو جاہل صوفیہ مانتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ خالق ومخلوق میں فرق اعتباری رہ جائے، بلکہ ہر مخلوق کو دعوائے خالقی ہوجائے، سو یہ تمام تر کفر ہے اور اس کا ماخذ نیوافلاطینت معلوم ہوتی ہے، اور ہندوؤں کا فلسفہ بھی اسی قبیل کا ہے، ہندوستان میں یہ مسئلہ مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی روایت کے مطابق آٹھویں صدی میں آیا ہے، ورنہ حضرات چشت کے کلام میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین سنجریؒ سے لے کر حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں اس کا ذکر یا دنہیں آیا، مجدد الف ثانیؒ، مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ، مولانا اسماعیل شہیدؒ وغیرہ وحدۃ الوجود یا وحدۃ شہود کی جو تشریح کرتے ہیں اس کا مقصد مسئلہ قومیت کی تفصیل ہے، أنت قیوم السموات والارض ومن فیھن، حدیث صحیح میں وارد ہے، اور اس کی تشریح بر مذاق وحدۃ الوجود یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنے وجود وبقا میں ہر آن اللہ تعالی کی محتاج ہے، جس طرح وہ اپنے خلق میں محتاج ہے، أنتم الفقراء سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری حقیقت فقر محض ہے اور اللّٰہ ھو الغنی سے ظاہر ہے کہ وہی غنی ہے، فقر کے دوسرے معنی عدم کے ہیں، ہماری حقیقت عدم ہے جس وجود یا کسی صفت کی نیرنگی اسی ذات غنی کی صفات کے ظلال ہیں، ظل کی حقیقت عدم ہی ہے، عدم نور کا نام ظل ہے، تاہم کسی ظل کا وجود اصل کے بغیر نہیں ہوتا، اس لئے ظل کا وجود اپنی ذات میں ہم

(۱) (یہ تمام ارشادات اسی خطبہ صدارت کے بعض حصوں سے متعلق ہیں)۔ مکاتیب سلیمان: ۱۸۲۔۱۸۵

معنی عدم ہے، لیکن اصل کے پرتو سے وجود کا ایک وہمی نقش پالیتا ہے، یہ ان حضرات کا وحدۃ الوجود ہے، گو کہ ہمارے نزدیک حضرت مجدد صاحب کا مسلک اخیر مسلک نہیں، اخیر مسلک وہی وحدۃ تنزیہ ہے جس پر شرع وارد ہے، کما فی المکتوبات۔(۱)

ہمارے حضرات کے یہاں وحدۃ الوجود کا تصور ایک حالی کیفیت ہے، جس کی نظر میں اللہ تعالی کی محبت وعظمت وجلالت اتنی چھا جائے کہ ساری مخلوقات اس کی نگاہوں سے چھپ جائیں، جیسے آفتاب کے طلوع سے سارے ستارے چھپ جاتے ہیں، مگر معدوم نہیں ہوتے، جیسے مجنوں کا یہ قول تمثل لی لیلی بکل سبیل.

جس وحدۃ الوجود کو ہم نے فلاسفۂ افلاطونی کا خیال کبھی کہا ہے، یا ہندوؤں سے ماخوذ ہے وہ یہ ہے کہ ذات الٰہی میں پھیل کر عالم بن گئی ہے، جیسے انڈا ہی پھٹ کر چوزہ بن جاتا ہے، خیال ہے جو ایک رباعی میں خیام کی طرف منسوب ہے:

حق جان جہاں است وجہاں جملہ بدن ارواح وملائکہ حواس ایں تن
افلاک وعناصر وموالید اعضاء توحید ہمیں ست دگر ہا ہمہ فن(۲)

(۱) حضرت مجدد کا مسلک اس باب میں بالکل واضح ہے، جن حضرات کی دسترس مکتوبات تک نہ ہو وہ ڈاکٹر احمد فاروقی کی کتاب حضرت مجددؒ کا تصور توحید ("conception of tauhid "Mujaddids") پڑھ سکتے ہیں۔
(۲) مکاتیب سلیمان: ۱۸۶۔۱۸۷

مکتوبات سلیمانی

(مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ولادت ضلع بارہ بنکی کے قصبہ دریاباد میں ۱۶؍شعبان ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۶؍مارچ ۱۸۹۲ء کو ہوئی، قدوائی خاندان کے اس مردمجاہد نے کالج سے اپنی زندگی کا آغاز کیا، لیکن مذہب کی گرفت نے اس کی ایسی دستگیری کی کہ آستانہ قرآن پر لا ڈالا، آپ تحریک خلافت کے تاحیات مؤید ونمائندہ رہے، صحافتی زندگی میں ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' نکالا، جو اپنی تاریخ کے کامیاب رسالے ثابت ہوئے، آپ کی درجنوں کتابیں ہیں، جو اسلوب کی عمدگی اور طرز ادا میں بے مثال ہیں، آپ کا انتقال ۱۶؍محرم ۱۳۹۷ھ مطابق ۶؍جنوری ۱۹۷۷ء کو ہوا۔

آپ جہاں ایک بہترین مفسر قرآن تھے، وہیں بے مثال صحافی وادیب اور فلسفہ کے ماہر ورمزشناس تھے، آپ کی خدمات کا دائرہ تمام فنون پر مشتمل ہے، آپ کے سید صاحب سے تعلقات کا آغاز شبلی مکتب فکر سے عشق کے ذریعہ ہوا اور مرور زمانہ کے ساتھ میں استحکام اور پختگی آتی گئی، سید صاحب ان کے علم وفضل، صلاحیت ولیاقت کے بہت معترف تھے، کئی بار آپ نے مولانا دریابادی کو دارالمصنفین آنے کی دعوت دی اور اپنے غائبانہ میں معارف کی ایڈیٹری کا منصب بھی عنایت فرمایا، اسی تعلق کا اثر تھا کہ مولانا دریابادی کو سید صاحب سے اور سید صاحب کو مولانا دریابادی سے بے پناہ محبت تھی، سید صاحب نے مولانا دریابادی کو جو خطوط لکھے ان کو مولانا دریابادی کی تقریبا ۱۲۰۰ بیش قیمت توضیحی حواشی کے ساتھ دو جلدوں میں ''مکتوبات سلیمانی'' کے نام سے صدق

جدید بک ایجنسی نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ہے، ان مجموعوں میں سید صاحب کا جو سرمایہ ہے وہ عموما ملکی حالات، خانگی معاملات اور تحریکی کوائف پر مشتمل ہے، ذیل میں کچھ خطوط قرآنی مباحث اور اشارات کے حامل ہیں، جو یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

تحدیث نعمت:

''آپ محمد علی صاحب کی تمام لندنی تقریروں کو پسند کرتے ہیں، یہ کیا بوالعجبی ہے؟ اختلاف مقاصد کے ساتھ یہ اتحاد مذاق، مگر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف آپ بلکہ یہاں کے معتبر انگریز تک ان کا لوہا مانتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ خاکسار بھی اپنے درجہ میں پیچھے نہیں، سعد باشا زغلول مع وفد مصری، نوری سعید مع وفد شامی وحجازی اور دیگر اہل تونس میری عربی دانی کا لوہا مان چکے ہیں أما بنعمة ربك فحدث [ضحیٰ:۱۱]''.(۱)

سید صاحب کی خاموش مزاجی:

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں: خاموشی کا مجرم ہوں، مگر میرا عذر صاف ہے:

"إنی نذ رت للرحمن صوما، فلن أكلم اليوم إنسيا[مریم:۲۶]"

خطائے بزرگان گرفتن خطا است:

نعمانی وفراہی کے عقائد پر مفصل مضامین لکھنے کی ضرورت کیا، اور فرصت کسے، تلك أمة قد خلت لها ما كسبت و عليها ما اكتسبت[بقرہ :۱۳۴](۲)

دین کا ہمہ گیر تصور:

گاندھی جی کا وہی مرتبہ ہے جو بابا نانک یا کبیر داس کا ہے یا راجہ رام موہن رائے

(۱) مکتوبات سلیمانی:۱/۱۴۵

(۲) ایضا:۲۸۳

کا، آپ نے شروع خلافت کے زمانہ کی جو شہادت پیش کی ہے وہ صحیح ہے، یہ وہ حضرات ہیں جن کا دین جامع ہے، مگر مانع نہیں اور جامعیت اور مانعیت کے بغیر حدود کی تکمیل نہیں ہوتی" تلك أمة قد خلت لها ما كسبت، و عليهاما اكتسبت و لا تسئلون عما كانوا يعملون[بقرہ:۱۳۴]"(۱)

بائے سببیہ اور بائے صلہ کا فرق:

آپ کا ترجمۂ قرآن جو نمونہ کے طور پر "صدق" میں چھپا ہے، اس کے ایک لفظ سے مجھے اختلاف ہے: ولاتكونوا أول كافربه [بقرہ:۴۱] میں "بہ" کی "ب" کو آپ سببیہ قرار دیتے ہیں، اور ترجمہ کرتے ہیں "کہ اس کے سبب سے" میرے خیال میں یہ "ب" صلہ کی ہے اور ترجمہ یہ ہوگا کہ "اسکے پہلے منکر تم نہ بنو" کفر کا صلہ ب کے ساتھ قرآن میں بار بار آیا ہے۔ مثلاً:

(۱) أفتؤمنون ببعض الكتاب و تكفرون ببعض[بقرہ:۸۵]

(۲) فلما جاء هم ماعرفوا كفروابه [بقرہ:۸۹](۲)

إن ربك لبالمرصاد اور يرى و يسمع کے ترجمے:

ان ربك لبالمرصاد [فجر:۱۴] میں جیسا کہ ابن انباری کا قول آپ نے نقل کیا ہے تاک اور گھات کے ترجمہ میں دشمنی اور عداوت کا مفہوم آجاتا ہے، گھات ہی ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے کیا ہے، ترجمہ میں نگراں لانا رحم کو ظاہر کرتا ہے، سب کا نگراں بھی یہاں صحیح نہیں، "واچ ٹاور" بھی درست نہیں، ٹاور کی تخصیص کیوں؟ میری رائے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کما عند الطبری میرے نزدیک مناسب ہے(۳)

يرى و يسمع یعنی ترجمہ میں دونوں کی گنجائش رہے، شر کی تخصیص نہ ہوجائے، اہل لغت اور مفسرین دونوں طرف گئے ہیں۔ لسان العرب دیکھ لیجئے، میرا مطلب ہے:

(۱) ایضاً ۲۔۲۰۵

(۲) مکتوبات سلیمانی ۲/۴۵

(۳) ایضا ۱/۷۹

تیرا رب (تیرے عمل کو) چھپا دیکھ رہا ہے۔ نوٹ: مرصاد کا ترجمہ اس سیاق میں واقعی مشکل ہے، سید صاحب کا یہ مکتوب قرآنیات میں ان کی مہارت کا ایک واضح ثبوت ہے (دریابادی)۔(۱)

طاغوت کا ترجمہ:

طاغوت کا ایک ترجمہ ہر جگہ نہیں چل سکتا، کہیں شیطان معنی ہوں گے، کہیں بتوں کے، کہیں ظالم حکم کے۔(۲)

أشر أريد بمن في الأرض:

ریاست بھوپال اس وقت پچاس ہزار پناہ گزینوں کا مرکز ہے اور وہ ان کے لئے وہ کچھ کر رہی ہے جو انسانیت کا اقتضاء ہے، ساتھ ہی اپنی ہندو رعایا کی بے حد دلجوئی اور دلدہی کر رہی ہے، اور امن و امان کے قیام کے لئے فرمانروا سے لے کر ادنیٰ سپاہی تک شب و روز مصروف ہے، مستقبل پر تاریکی کا پردہ ہے: أشرّ أريد بمن في الأرض أم أرادبهم ربهم رشدا [جن:۱۰](۳)

نفس عیوب کا مجموعہ:

میں اپنے نفس کو عیوب سے پاک نہیں جانتا، وما أبرّئ نفسي [یوسف:۵۳]، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میری تقصیرات کیا ہیں، کیا زمانہ کا تغیر ہے:۔ و تلك الأيا م نداولها بين الناس[آل عمران:۱۴۰] (۴)

وقعت الواقعة: علامہ اقبال کے چل بسنے کی خبر ہے(۵)

(۱) ایضا ۱/۷۹

(۲) مکتوبات سلیمانی ج ۲۔ص ۱۱

(۳) ایضا ۲/۲۰۰

(۴) ایضا ۲/۲۲۱

(۵) ایضا ۲/۴۵

بے مائیگی کا اظہار:

نادم ہوں کہ کبھی کبھی اپنی خشونت سے آپ کو تکلیف دینے کا موجب ہوتا ہوں، اور آپ اپنی شرافت ومروت وتحمل سے انگیز فرمایا کرتے ہیں، أعرض عن الجاهلين [اعراف:۱۹۹] (۱)

تابعی کی تعریف:

عمر بن سعد اور یزید بن معاویہ لغوی حثیت سے تو تابعی ہیں، مگر اصطلاح میں نہیں ہیں، کیونکہ احسان کی قید ہے: والذين اتبعو هم بإحسان [توبہ:۱۰۰] جو اس سے خالی ہیں وہ فضیلت تابعیت سے عاری ہیں، ابن سعد نے تابعین میں اول کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

عالمگیر دین:

قرانا عربيا يا كلاما عربيا کی نسبت عربی کا ترجمہ فصیح کردینے سے مشکل تو حل نہیں ہوئی، کیونکہ بہرحال وہ عربی زبان میں ہے اور جو آپ کے خیال میں قرآن کی عالمگیری کے خلاف ہے، تو پھر کسی ایسی زبان میں اس کو ہونا چاہئے جو عالمگیر زبان ہو، اور یہ ممکن نہیں۔ اس لئے جیسا کہ شاہ صاحب نے حجۃ میں لکھا ہے کہ نبی کسی خاص قوم میں یا کسی خاص ملک اور کسی خاص زبان میں مبعوث ہوتا ہے یہ اس کی نسبت اولی ہے، وہ نبی اپنی قوم کے صالح افراد کو چھانٹ کر اپنی تعلیم وتربیت سے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور ان کو مختلف اقوام، ممالک اور السنہ میں بھیجتا ہے، اور اس کے بعد آئندہ نسلوں میں یہ سلسلہ قائم رہتا ہے، اور دین اپنی عالمگیری کے مرتبۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

(۱) ایضاج ۲۔۱۴۰
(۲) مکتوبات سلیمانی ج ۲۔۱۶۳
نوٹ: مولانا دریابادی نے سوال کیا تھا کہ یزید اور عمر بن سعد بھی تو صحابی زادے اور تابعی ہیں پھر ان کا شمار تابعین میں کیوں نہیں کیا جاتا، اس کے جواب میں مذکورہ مکتوب ہے۔

آپ نے جو عالمگیری کا مفہوم سمجھا ہے اس کے مطابق آپ اس آیت کو کیسے حل کریں گے: لتنذر أم القرى ومن حولها [انعام:۹۲]، اور پھر اس کی تطبیق لأنذركم به ومن بلغ [انعام:۱۹] سے کیسے کریں گے، جس کی حد نہیں۔ (۱)

سید صاحب کی تفسیر:

"قل إني نذير مبين، كما أنزلنا على المقتسمين الذين جعلوا القرآن عضين [حجر:۹۱]" میرے نزدیک اس میں تین لفظ قابل حل ہیں كما انزلنا کا مفعول کیا ہے، القرآن سے کیا مقصود ہے؟ اور عضين کے کیا معنی۔

تفصیل وتطویل سے بچنے کے لئے خلاصہ عرض ہے: کما انزلنا کا مفعول عذاب ہے جو نذير مبين کے قرینہ ومقام سے سمجھا جاتا ہے، نذیر تو عذاب ہی کا ہوگا، مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ یہ قریش سے کہہ دے کہ میں عذاب الہی سے تم کو ڈراتا ہوں، جس طرح (اللہ تعالی فرماتا ہے) کہ ہم نے مقتسمين پر عذاب پہلے اتارا، مقتسمين سے مختلف اہل کتاب مراد ہیں، تقسیم کرنے والے یا بانٹنے والے کہا گیا یعنی جنھوں نے کتاب الہی کو بانٹ لیا ہے اور متفرق کردیا ہے، بعض احکام کو عملا مانتے ہیں، بعض کو اپنے ہوی اور مصلحت کے خلاف ہونے کے باعث نہیں مانتے، اب القرآن کے معنی مطلق کتاب الہی کے ہوئے اور قرآن وحدیث میں قرآن ان معنوں میں آیا ہے۔ (۲)

تواضع کا نمونہ:

ایک صاحب کا مجھ پر سراسر بہتان اور الزام ہے کہ میں نے مولانا کفایت اللہ صاحب کے سامنے ان کے والد ماجد مرحوم کو برا بھلا کہا ہے، میں تو ان کے نام تک سے بھی واقف نہ تھا کیونکر کہتا، مفتی صاحب اگر یہ کہہ دیں کہ میں نے ایسا کہا ہے تو میں معافی مانگ

(۱) ایضا ۲/۱۲۴
(۲) مکتوبات سلیمانی ۲/۱۲۵

لوں گا:إن هذا إلا إفك مبين میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔(۱)

حسن خاتمہ کی دعا:

اپنی خیریت مزاج سے بھی مطلع فرمائیے، میری قوت کی گرہ تو کھل چکی ہیں، اب آپ اپنی فرمائیے۔ربنا وتوفنا مع الابرار[آل عمران:۱۹۳] .(۲)

خالق اور مخلوق میں کسی صفت کا اشتراک نہیں:

خالق اور مخلوق میں کسی صفت کا اشتراک نہیں، جو اشتراک نظر آتا ہے وہ محض لفظی ہے، ورنہ سمیع و بصیر کی حقیقت دونوں جگہ مختلف ہے اور شافی تو خاص خدا کی حقیقت ہے، شافی کے معنی شفا بخشنے والا، شفا بخش صرف خدا کی حقیقت ہے، وإذا مرضت فهو يشفين ،اور حدیث میں'' ولا شافي إلا أنت '' البتہ تدبیر، حصول شفا حکیم وڈاکٹر بتاتے ہیں، مگر شفا نہیں بخشتے اور نہ بخش سکتے ہیں۔(۳)

مسئلہ تحکیم کی حقیقت:

خوارج نے إن الحكم إلا لله کا نعرہ جو بلند کیا تھا اس میں حکم سے ان کی مراد فیصلہ اور ثالثی ہے، حضرت علیؓ نے چونکہ حضرت موسیٰؓ کو اپنی طرف سے حکم اور امیر معاویہؓ نے اپنی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ کو حکم بنایا تھا، اسی کو واقعہ تحکیم کہتے ہیں، خوارج اس حکم بنانے کی کارروائی کو ضلالت بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ کتاب اللہ کے سوا کوئی حکم نہیں، اور اس پر اس آیت سے استدلال کرتے تھے، حضرت علیؓ نے اسی کے متعلق فرمایا کہ كلمة حق أريد به الباطل فیصلہ تو کتاب اللہ ہی سے ہوگا، مگر کتاب تو خود نہیں بولے گی، اس کی طرف سے کوئی انسان ہی بولے گا، اور معنی اور حکم کی تشریح کرے گا۔(۴)

(۱)(ایضاج ۲/۶۹) (۲)ج ۲/۳۹
(۳)مکتوبات سلیمانی ج ۲/۲۰۱
(۴)مکتوبات سلیمانی ج ۲/۲۰۲

مولانا دریابادیؒ کی مرجعیت:

اب تو ماشاء اللہ آپ کی ذات مرجع بن رہی ہے، امید ہے کہ مدت کے ساتھی فراموش نہ ہوں گے، اور بحکم "كونوا مع الصادقين "[توبہ:۱۱۹] یعنی صدق والے کے ساتھ رہنے کی سعادت ملے گی۔(۱)

قیاسات کو حقائق بنایا:

آپ کے'' صدق'' میں ایک ممتاز اولڈ بوائے کا خط پڑھ کر افسوس ہوا کہ وہ سراسر "إن بعض الظن اثم" [حجرات:۱۲] پر مبنی ہے، اور جس میں قیاسات کو حقائق بنانے کی کوشش کی گئی ہے(۲)

اصول مواسات کا خیال:

''مولوی صاحب معلوم'' کو یہ شکایت ہے کہ آپ ان کی شکایت اتنے دن تک خاموشی سے سنتے رہے، آپ نے ان ہی سے دوستانہ تحقیق کیوں نہ فرمائی اور اب جب مجھ سے آپ کو جو معلوم ہوا اس کی بنا پر غلط فہمی ظاہر فرماتے، وان جنحوا للسلم فاجنح لها[انفال:۶۱] کا اصول مواسات آپ سے بعید نہیں۔(۳)

معارف کی شاہ راہ کامیابی:

جولائی سے معارف کے معاوضہ مضامین کا مسئلہ بالتصریح طے ہو جانا چاہیے " اللّٰه لا يستحي من الحق [احزاب:۵۳]، خدا کرے، معارف کی شاہ راہ کامیابی آپ کے زیر ہدایت ہموار و وسیع ہوتی رہے۔(۴)

(۱)مکتوبات سلیمانی ۲/۱۲۲
(۲)ایضا:۲/۱۳۵
(۳)مکتوبات سلیمانی:۲/۱۰۸
(۴)ایضا:۱/۱۲۳

درسگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں قیام:

مجاور حرم کا نامۂ والا ملا، یہ إذ واعدنا موسی أربعین لیلة[بقرہ:۵۱]. دیکھئے کب تمام ہو۔ نوٹ: مولانا دریابادی فرماتے ہیں کہ اس وقت میرا طویل قیام درسگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں تھا۔ اس وقت عقیدت اس خاص آستانے سے بڑھی ہوئی تھی، مدتِ قیام چالیس دن کی رکھی، آیت کا اشارہ اسی طرف ہے۔(۱)

استقامت کی نعمت:

اللہ اکبر:۔ مجھ مور ضعیف کے کلبۂ احزاں کو دربار سلیمانی کا لقب عطا ہوتا ہے، میں توجادۂ نیازمندی پر قائم رہوں گا، بحکم قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا[فصلت:۳۰]. (۲)

قدر افزائی کا نمونہ:

مقالہ مبارکہ کا انتظار کب تک رہے، ''چلپی آفندی'' کے فتوحات قلمی دیکھتا ہوں، میرے خیال میں پی، سی رے پرلے دے شاید صحیح نہیں، دنیا ایک نقطۂ نظر پر جمع نہیں ہوسکتی، **ولذلک خلقناھم** پیش نظر رہے۔(۳)

کمی کا احساس:

آپ نے اپنے رقعات کے ذریعہ کئی دفعہ یاد فرمایا، مگر میں جواب نہ دے سکا، صحت کی خرابی مغموم وافسردہ رکھتی ہے، مجھ سے زیادہ خسر الدنیا و الآخرة کون ہوگا ربنا آتنا فی الدنیا حسنةً وفی الآخرة حسنةً وقنا عذاب النار. [بقرہ:۲۰۱].(۴)

---

(۱) مکتوبات سلیمانی ج۱/۱۹۳-۱۹۴

(۲) مکتوبات سلیمانی ج۱/۲۰۲-۲۰۳)

(۳) نوٹ: اشارہ ہے مولانا دریابادی کے قلمی نام ''چلپی'' بعنوان ''فیہ مافیہ'' الناظر ماہنامہ لکھنؤ کی طرف۔

(۴) ۱/۲۵۶

قرآن اور سائنس:

قرآن وسائنس کے نوٹ پر میں اپنی غلطی نہ سمجھ سکا، یعنی کیا یہ کہ قرآن پاک کی آیتیں جن عجائبات قدرت کا ذکر موعظت واعتبار اور تدبر وتفکر کیلئے کرتی ہیں، ان جیسے مختلف علوم اور سائنس کا اشارہ سمجھنا غلطی ہے، یہ ایک غلطی ہے جو تیسری صدی سے آج تک ہوتی آئی ہے، اس قدر متشدد نہ بنئے۔

نوٹ: اب تفصیل یاد نہیں، بہرحال زندگی کے اس دور میں سید صاحب نے مجھے میرے مولویانہ تشدد پر ایک سے زائد بار ٹوکا تھا۔(دریابادی)(۱)۔

---

(۱) مکتوبات سلیمانی ج۱/۲۵۷۔

تذکرۂ سلیمان

(مرتبہ ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادیؒ)

سید صاحبؒ کے معتقدین خاص میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادی کا ہے، آپ نے سید صاحب کو جلوت وخلوت میں دیکھا اور کسب فیض کیا، مزید آپ نے سید صاحب سے بیعت وارشاد کا تعلق قائم رکھا اور ان کے ارشاد فرمودہ معمولات ووظائف کی پابندی کی، بعد مکانی کے پیش نظر مراسلت سے اس تعلق خاطر کو باقی رکھا، جب بھی آپ نے کوئی مسئلہ دریافت کیا یا اپنی پریشانی ذکر کی تو سید صاحب نے مطابق حال مشورہ دیا اور آیات قرآنی کی روشنی میں ان کی رہنمائی فرمائی، ذیل میں ڈاکٹر صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''تذکرۂ سلیمان'' میں مذکور قرآنی آیات کے برمحل استعمالات سے لبریز خطوط کے اقتباسات نقل کئے جارہے ہیں۔

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے:

۱۹؍نومبر ۱۹۵۳ء کو سفیر شام اپنے مشیر ثقافت اور دو افراد کے ساتھ تشریف لائے، حضرت والا اٹھ بیٹھے، مگر سفیر صاحب نے باصرار لیٹے رہنے کی درخواست کی اور خود سرہانے کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے، مزاج پرسی کے بعد سفیر صاحب نے فرمایا کہ مجھ کو ایک علمی الجھن ہے جو کئی علماء سے حل نہ ہوسکی، وہ یہ ہے کہ یہودیوں کے متعلق قرآن پاک میں یہ تصریح موجود ہے کہ ضربت علیهم الذلة والمسكنة [بقرہ:۶۱] (دے ماری گئی ان پر رسوائی اور فقیری)، اور احادیث نبوی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کبھی دنیا میں باآبرو حاکم قوم نہیں رہے گی، پھر آج فلسطین میں ان کی حکومت کیسے قائم ہے؟ حضرت والا نے

ایک لمحہ تأمل کے بعد فرمایا کہ اس کا جواب تو قرآن مجید ہی میں خود موجود ہے، راقم حقیر نے اشارہ پاکر حمائل شریف پیش کردی اور حضرت والا نے فوراً سورۂ آل عمران کی یہ آیت پاک نکال کر سنادی، ضربت عليهم الذلة أين ماثقفوا إلا بحبل من الله و حبل من الناس [آل عمران:۱۱۲] (ماری گئی ان پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے بجز اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رسی تھام لیں یا الناس کی رسی)، اور اس کی تشریح میں فرمایا کہ ''حبل اللہ'' تو دین اسلام ہے اور ''حبل الناس'' سے مراد ورلڈ پاور (عالمی طاقت) ہے یعنی وہ دین میں داخل ہوجائیں یا کسی عالمی طاقت کا سہارا لے لیں، تو البتہ ان کی ذلت دور ہوسکتی ہے، چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کی حکومت محض انگریز وامریکہ کے بل بوتے پر قائم ہے، اس جواب سے سفیر شام اچھل پڑے اور فرمایا کہ واللہ! آج تک کسی نے اس آیت پاک کی طرف رہبری نہیں کی تھی، آج پوری طرح تشفی ہوگئی۔(۱)

سید صاحب کے حسنِ ذوق کا آئینہ:

(۱) حضرت والا کی ایک ایک ادا ذوق جمال کی شاہد تھی اور ان کی ہر چیز ان کے حسن ذوق کا آئینہ، لیٹر پیڈ کو دیکھئے تو سرورق کے داہنی طرف نہایت خوبصورتی کے ساتھ یہ آیت پاک چھپی ہوئی ملے گی۔(إنه من سليمن وإنه بسم الله الرحمن الرحيم)[نمل:۳۰](۲)

(۲) اسی طرح گھر میں ریڈیو کیلئے ایک عمدہ غلاف تیار کیا گیا، حضرت سے درخواست کی گئی کہ اس پر کاڑھنے کے لئے کوئی عبارت تجویز فرمادیں، موزونیت اور حسن ذوق کا کمال دیکھئے کہ فوراً یہ آیت لکھ دی: أنطقنا الله الذى أنطق كل شيئ.(۱)[فصلت:۲۱](۳)

---

(۱) تذکرۂ سلیمان ص:۲۸۲
(۲) (تذکرہ سلیمان:۳۴۷)
(۳) تذکرہ سلیمان:۳۴۷

(۳) ایک صاحب ارادت نے جوفونٹن پن کے تاجر تھے، اپنے کاروبار میں برکت کیلئے دعا کی درخواست کی، حضرت نے دعا فرمادی اور ساتھ مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اپنی دوکان میں یہ آیت لکھ کر آویزاں کردیجئے نٓ والقلم ومایسطرون، مذاق کا یہی نکھار بچوں کے ناموں کی تجویز میں بھی نمایاں رہتا تھا، بالعموم لڑکیوں کے نام والدہ کے اور لڑکوں کے نام والد کے نام کے ہم قافیہ تجویز فرماتے یا کبھی اس میں صرف آغاز حرف کی رعایت ملحوظ ہوتی، مگر بہرصورت صوت ومعنی کا امتزاج نہایت دلکش ہوتا تھا۔(۱)

قرآن فہمی کے لئے عربی میں مہارت:

ایک روز راقم کی موجودگی میں دومنکرین حدیث حضرت والا کی خدمت میں آئے اور اپنے مسلک کی گفتگو کا آغاز کیا، دعوی یہ کیا کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہت آسان بھی ہے اور تائید میں یہ آیت پڑھ دی کہ " ولقد یسّرنا القرآن للذکر فھل من مدکر[قمر:۲۲] "حضرت والا مخاطب کی لیاقت کو تاڑ گئے دریافت فرمایا کہ آیا عربی سے واقفیت ہے، جواب اثبات میں ملا، تو فرمایا: اس آیت کا ترجمہ کردیجئے، مخاطب نے مفہوم بیان کیا، حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے تو ترجمہ پوچھا تھا، پھر فرمایا کہ خیر یہی بتادیجئے، کہ یہ لفظ ''مدّکر'' کیا ہے اور اس کا مادہ کیا ہے؟ مسئول نے فوراً کہا کہ یہ لفظ ''درک'' سے بنا ہے اور اس کے معنی سمجھنے کے ہیں، حضرت والا نے فرمایا کہ مجھ کو ٹھیک اسی جواب کی توقع تھی، یہ تو آپ حضرات کی عربی دانی ہے اور اس قرآن فہمی کا دعوی! پھر ان دونوں کو حضرت نے نہایت شفقت سے سمجھایا کہ یہ لفظ ''ذکر'' سے مشتق ہے اور فلاں قاعدہ کے تحت ''ذ'' ''د'' سے بدل گئی وغیرہ، اس کے بعد نصیحت فرمائی کہ پہلے عربی زبان پھر متعلقہ علوم قرآنی کے حصول کی طرف توجہ کی جائے، اور پھر قرآن پاک میں غور وفکر کریں، اس گفتگو سے بظاہر وہ دونوں حضرات متأثر اور پشیمان بلکہ ممنون ہوکر گئے۔(۲)

(۱) تذکرۂ سلیمان ص:۲۴۸

(۲) تذکرۂ سلیمان ص:۳۴۸۔۳۴۹

اپنا کام کوشش کرنا:

نماز میں دل لگنا یا نہ لگنا اپنے اختیار کی بات نہیں، اور جو چیز بندہ کی اختیاری نہیں وہ اس کا مامور بھی نہیں، (یہ زریں اصول ذہن میں رہے تو بیسوں اشکالات اور الجھنوں سے خود بخود نجات مل جائے) بندہ پر اپنی طرف سے دل لگانے کی کوشش ہے جو اختیاری ہے، جس طرح مریض کا کام دوا کا پینا ہے جو اس کے اختیار میں ہے شفا کا حصول نہیں، جو اختیار سے باہر ہے، نماز میں استحضار اور خشوع وخضوع کے حصول کیلئے کوشش چاہیئے اور اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ معانی ادعیہ وسور قرآنی جو پڑھے ان پر نظر رہے اور ہر لفظ ارادہ سے نکلے، دوسری بات یہ ہے کہ بتوجہ کثرت ذکر کا اہتمام رہے، اس سے انشاء اللہ مطلوب حاصل ہوگا، یعنی یہ نسخہ ہے جس سے شفا کی امید ہے، مگر شفا کا ہوجانا یہ اللہ تعالی کے اختیار اور بخشش کی بات ہے، مگر جس طرح عبادت الٰہی یہ جاری ہے کہ عموماً صحیح نسخہ کے استعمال کے بعد وہ شفا عنایت فرماتے ہیں، ایسے ہی اس طریقہ سے نماز میں استحضار وخضوع بفضلہٖ حاصل ہوجاتا ہے اور اگر کوشش کے بعد بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ محرومی انشاء اللہ مضر نہیں، طمانیت رکھیں، لایکلف اللّٰہ نفسا إلا وسعھا[بقرہ:۲۸۶](۱)

''یقتل'' کا صحیح مفہوم:

مولانا غلام صاحب نے سوال کیا کہ ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللّٰہ أموات، بل أحیاء، ولکن لا تشعرون [بقرہ:۱۵۴]، اس آیت شریفہ میں "یقتل" کا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ کیا اس کے مفہوم میں اللہ تعالی کے وہ نیک بندے بھی داخل ہیں جو تلوار سے قتل تو نہیں ہوتے، لیکن اگر موقعہ ملتا تو حصول رضاء الٰہی میں اس سے ہرگز گریز نہ کرتے؟

(۱) ایضا:۴۳۴۔۴۳۵

جواب سلیمان: جی نہیں! آیت پاک صرف ان مقتولین فی سبیل اللہ تعالی کیلئے ہے، جنہوں نے اپنی جان خدا کی راہ میں دے دی، اور وہ مارے گئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر اس مجاہد کو یہ آیت شامل ہوتی جو بہ نیت جہاد وغزاوات میں شریک، مگر مارا نہ گیا ہو، اس کو نیت بھی اپنی جان دینے کی ہو، لیکن اس کو یہ شہادت حاصل نہیں۔(۱)

اللہ کی تجلیات کو برداشت کرنا:

ایک دوسرا سوال ہے: دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن مجید میں لو أنزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته [حشر:۲۱] والی آیت شریفہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالی کی تجلیات کو برداشت کرنے کی قوت انسان میں بہ نسبت دوسری مخلوقات کے کہیں زیادہ ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی آیت: قال لن ترانی ولكن انظر إلى الجبل فإن استقر مكانه فسو ف ترانی [اعراف:۱۴۳] سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہاڑ کی قوت برداشت زیادہ ہے انسان کی قوت سے، حالانکہ اول الذکر آیت میں تجلی صفت (یعنی نزول کلام الٰہی) کا ذکر اور یہاں تو تجلی ذات کا، جو مخلوق تجلی صفت کو نہ برداشت کر سکتی تھی، اس کے متعلق یہ ارشاد کیا مفہوم رکھتا ہے کہ اگر یہ تجلی ذات کو برداشت کر سکے تو موسی بھی دیکھ سکیں؟

جواب:۔ ان آیتوں کا صحیح مطلب آپ کے ذہن میں نہیں ہے، پہلی آیت لو أنزلنا باعتبار تعقل کے ہے کہ اگر پہاڑ پر بھی یہ قرآن اترتا تو باوجود لایعقل اور نا قابل تأثر ہونے کے ٹکڑے ہو جاتا، پھر تعجب ہے کہ انسان کا دل اس سے متأثر کیوں نہیں ہوتا، دوسری آیت باعتبار تحمل کے ہے، اللہ تعالی کی رؤیت تجلی ہی کی شکل میں جنت کے باہر ہو سکتی ہے، یہ تجلی جس شئی میں ہو کر ظاہر ہوگی اس شئی کا اس تجلی کا تحمل کر کے اپنی جگہ پر رہنا دشوار ہے اور جب یہ تجلی اس طرح نہیں ہو سکتی تو انسان اس کو دنیا میں دیکھ بھی نہیں سکتا۔(۲)

(۱) تذکرۂ سلیمان:۴۴

(۲) تذکرۂ سلیمان:۴۵۸

ذکر ہر حال میں کرنا چاہئے:

ذکر ہر حال میں کرنا چاہیے، اگر لذت ملے تو نعمت، ورنہ ادائے فرض کی نعمت تو بہر حال ہے۔

بہر حال بندہ پہ ہے بندگی
کرم ہے جو ذوق عبادت ملے

(سلیمان)

ذکر کا خاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق "فاذكرونی أذكركم" [بقرہ:۱۵۲] (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا)، اس سے بڑھ کر نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ ذاکر کو بوقت ذکر حق تعالی یاد کرتے ہیں، ذرا اس کا تصور تو کیجئے، اور جب "اللہ" کہئے تو تصور کے کان سے سنئے کہ "عبدی" کی آواز آتی ہے، خود سمجھ لیجئے کہ تصور ایک منصوص حقیقت کو مستحضر کرنے کیلئے باندھا جا رہا ہے، یہ کوئی نرا تصور نہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لئے انعام ہے
آپ خود سنتے ہیں آکر جو میرا پیغام ہے

کیا دوا کے استعمال سے غرض طلب صحت ہے یا لذت کام و دہن؟ اگر یہ میسر آجائے تو فبہا، ورنہ دوا سے انکار تو نہیں کیا جائے گا۔ ذکر میں انتشار خیال سے پریشان نہ ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے قلب و دماغ ایسا ہی بنایا ہے کہ اس میں حرکت فطری ہوتی رہے، یہ شاہی شاہ راہ ہے، آپ کون اس کا پہرہ بٹھانے والے کہ اس شاہی شاہراہ پر چوہڑے چمار نہ چلنے پائیں، آپ الٰہی راہ چلئے، وہ اپنی راہ چلیں، حسب تجویز اعلی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ یہ خیال کیجئے کہ اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کی بھی قدرت ہے کہ دل کے ایک قطرہ میں خیالات کا سمندر بھر دیا ہے، اللہ رے اس کی عظمت و کبریائی! اس تصور سے یہ خیالات پریشاں معرفت کے آیات بن جائیں گے، ایسے وقت یہ شعر پڑھ لیا کیجئے۔

دور باش، افکار باطل ، دور باش اغیارِ دل
سج رہا ہے شاہِ خوباں کیلئے دربارِ دل
(سلیمان)

بہرحال آپ مضطر نہ ہوں،کام میں لگے رہیں،اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں گے،ان کا وعدہ ہے۔(۱)

دعا براہ راست اللہ تعالیٰ سے کی جائے:

کیا دعا واسطہ سے کی جائے تو زیادہ مؤثر ہوتی ہے؟

جواب:جی نہیں۔شاید ایک آدھ مقام پر ہو،اس لئے اگر توسل بالعمل ہو تو جائز ہے،اور اشخاص سے توسل بھی ان کے اعمال ہی سے ہوتا ہے۔جب حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں: أدعو نـي أستجـب لكم [غافر:٦٠] (مجھ سے مانگو میں دوں گا، مجھے پکارو میں جواب دوں گا،تو پھر واسطہ کی کیا ضرورت رہی؟)۔(۲)

حسد کا علاج:

اس گنہگار کا حال برا ہے،حسد گھر کر گیا ہے؟

جواب:حسد کی ایک تو کیفیت نفسانیہ ہے،جس میں انسان معذور ہے،ایک اس کے مقتضی پر عمل ہے،اس میں انسان مازور (گنہگار) ہے اور ایک مخالفت ہے اس مقتضی کی،اس پر انسان ماجور ہے یعنی حسد کے غلبہ سے کسی کی مذمت کا تقاضا ہو تو اس کی مدح کرو،اس سے اعراض کو دل چاہے تو اس سے ملو،اس کی تعظیم کرو،ابتداءً سلام کرو،غرض نفس کیفیت حسد پر مؤاخذہ نہیں،اس کے مقتضی پر عمل کرنے پر مواخذہ ہے،حدیث میں ہے: حسد نیکیوں کو اسی طرح کھاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو،حسد سے غیبت،عداوت،کذب گوئی ،افترا پردازی،بہت سی برائیاں پیدا ہوتی ہیں،آپ یہ تصور کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے ،اگر مجھے کم اور اسے زیادہ ملا تو اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی۔

(۱) تذکرۂ سلیمان ص:۴۷۲-۴۷۳
(۲) تذکرہ سلیمان ج ۴۷۵/

حسد اور رشک (غبطہ) دو چیزیں ہیں،حسد یہ ہے کہ جس پر ہو (محسود)،اس سے اس کی نعمت کے زوال کی تمنا ہو،یہ مذموم ہے،اور رشک اور غبطہ یہ ہے کہ اس نعمت کی اس سے زوال کی تمنا کئے بغیر اپنے لئے اس کے حصول کی تمنا ہو،یہ برا نہیں تو آپ کو بحمد اللہ مرض حسد نہیں ، بلکہ رشک آتا ہے کہ آپ بھی ایسے ہوتے،تو ایسی تمنا اور مسابقت کا جذبہ تو رضائے الٰہی کا باعث ہے: وفـي ذلك فـليتـنـافـس المتنافسون [مطففين:٢٦]،اور دوسری جگہ فاستبقوا الخيرات[بقرہ:۱۴۸] (۱)

نقائص کا نظر آنا مبارک:

اپنے میں نقائص کا نظر آنا مبارک ہے،جب تک مرض کی تشخیص نہ ہو،علاج کیسے ہو، اب آپ کو اپنے اندر جو عیوب معلوم ہوتے ہیں،دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے ان کے ازالہ کی درخواست کیجئے،اور پھر کوشش کر کے ان کے مقتضیات پر عمل سے احتراز کیجئے،یہی ہے مجاہدہ " وأمـا مـن خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى ، فإن الجنة هي المأوى[نازعات:۴۰]"(۲)

غصہ دبایئے:

خلاف طبیعت امور پر غصہ بہت ہے؟

جواب:غصہ کو دبایئے:'والـكـاظمين الغيظ [آل عمران:۱۳۴] میں بنئے اور جس وقت غصہ آئے تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ہم پر بہت زیادہ اختیار ہے پھر بھی تو معاف فرماتا ہے تو ہم کو بھی ایسا ہی چاہیے۔(۳)

حرص دنیا میں نہیں دین میں ہونی چاہیئے:

حرص دنیا کافی ہے گو اس کو دبانے کی کوشش کرتا ہوں؟

(۱) تذکرۂ سلیمان:۴۸۸
(۲) ایضا:۵۰۸
(۳) تذکرۂ سلیمان۵۰۹

جواب: حرص دنیا میں یہ غور کیجئے کہ جس کی حرص ہے وہ کہاں تک ضروری ہے، ع

آنچہ مادر کار داریم اکثر ش درکار نیست

پھر اس کی جواب دہی بھی ہے، جس قدر زیادہ ہے اسی قدر مواخذہ ہے "ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم" [تکاثر:۸] (ہر نعمت کی باز پرس ہوگی،) حرص، دنیا میں نہیں دین میں ہونی چاہئے کہ قرب الٰہی علم حقیقی اور نعیم جنت کی حرص میں ترقی ہو(۱)۔

جو کچھ یہ علم اور یہ بیان ہے وہ سب محض فضل الٰہی ہے:

ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے لکھا کہ مولانا عبدالجبار صاحب کے مشورہ اور اصرار پر بعد نماز مغرب سیرت طیبہ کا بیان کر رہا ہوں، ورنہ ویسے کچھ بولنے یا بیان کرنے سے طبیعت گریز کرتی ہے۔

جواب: کچھ حرج نہیں، مگر بیان کے وقت یہ مستحضر رہے کہ جو کچھ یہ علم اور یہ بیان ہے وہ سب محض فضل الٰہی ہے، میں کچھ نہیں، اور یہ نیت ہو کہ اس سے میرا قصد اپنی بڑائی نہیں، بلکہ نفع پہنچانا ہے: فذکر إن نفعت الذکری [اعلیٰ:۹]، اس کا علاج یہ ہے کہ آپ حاضرین کو صاف صاف بتا دیا کریں کہ یہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ فلاں کتاب سے ماخوذ ہے، میں دائمی طور سے تو جاہل ہوں۔(۲)

حالت اضطرار کی دعا اثر رکھتی ہے:

سوال:۔ الحمدللہ کہ دعا کی تأثیر محسوس ہونے لگی ہے، لیکن اس وقت کا احساس یہ ہے کہ جب کام مایوسی کی نوبت کو پہنچتا ہے تب دعا اثر دکھاتی ہے اور اسباب فلاح مہیا ہوتے ہیں۔

جواب:۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کیجئے، بے شبہ اضطرار کی حالت کی دعا یہی اثر رکھتی

(۱) ایضا:۵۰۸۔۵۰۹

(۲) ایضا:۵۰۹۔۵۱۰

ہے: أمن یجیب المضطر اذادعاہ [نمل:۶۲]، اور دوسری جگہ من بعد ما قنطوا [شوریٰ:۲۸]. (۱)

ایمان کی پہچان:

سوال:۔ کسی روز نماز تہجد قضا ہو جاتی ہے یا ذکر جھوٹ جاتا ہے تو دن بھر طبیعت اداس رہتی ہے، بلکہ اکثر دیکھا کہ بنتا کام بگڑ جاتا ہے، ناامیدی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں، اس لئے اب پابندی کی طرف توجہ زیادہ رہتی ہے!

جواب:۔ بارک اللہ، ایمان کی پہچان حدیث میں یہ بھی آئی ہے کہ جس کو اپنے گناہ وخطا سے قلبی تکلیف محسوس رہے، قرآن پاک میں ہے: وکرّہ إلیہم الکفر والفسوق العصیان [حجرات:۷]، کفر وفسق سے کراہت ہوتی ہے(۲)

آفاق وانفس میں تدبر وتفکر:

سوال:۔ قرآن مجید میں جہاں مظاہر قدرت میں تدبر وتفکر کی دعوت دی گئی ہے وہ کہیں ''آفاق'' اور کہیں ''أنفس'' کا ذکر ہے اس میں کیا خاص بات پوشیدہ ہے، دونوں قسم کی چند آیات کو پیش نظر رکھ کر احقر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اقرار الوہیت کیلئے آفاق کو پیش فرمایا گیا ہے اور ''مشاہدۂ حق'' کیلئے انفس میں فکر کی دعوت دی گی ہے مثلاً:

(۱) أفلا ینظرون إلی الإبل کیف خلقت .[غاشیہ:۱۷]

(۲) و فی أنفسکم أفلاتبصرون .[زاریات:۲۱]

جواب:۔ یہ تفسیر میرے دل کو نہیں لگتی، سنریھم آیا تنا فی الآفاق وفی أنفسھم حتی یتبین لھم أنہ الحق أولم یکف بربك أنہ علی کل شیئ شھید [فصلت:۵۳] اس میں دونوں یکجا ہیں۔(۳)

(۱) تذکرۂ سلیمان ص:۵۳۶۔

(۲) ایضا:۵۳۶۔ (۳) ایضاً:۵۴۲۔

حسن خاتمہ کی دعا:

سوال :جی چاہتا ہے کہ جب اس دنیا سے جانا ہوتو کوئی دنیوی آرزو دل میں موجود نہ رہے، اعمال کی تقصیر عیاں، مگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو کیا بعید ہے:

مجھے مشکل سے مشکل ہے، انھیں آساں سے آساں ہے

حضرت والا اس ناکارہ کے حسن خاتمہ کیلئے دعا فرمائیں

جواب:۔ بالکل صحیح ہے، دعا کیا کیجئے: فاطر السموات والأرض، أنت ولي في الدنيا والآخرة ،تو فني مسلما وألحقني بالصالحين[یوسف:۱۰۱] (۱)

حضور کی محبت بھی واجب بلکہ فرض ہے

سوال: ایک کیفیت ابتداء سے آج تک محسوس ہوتی رہی ہے، مگر عرض کی جسارت آج کر رہا ہوں، وہ یہ کہ بعضے بزرگ کے پاس بیٹھا تو اولیاء اللہ اور ان کے قصص سے دلچسپی پیدا ہوئی، بعضے بزرگ کی صحبت سے دل کا میلان آنحضرت ﷺ کے احوال وواقعات سننے کی طرف زیادہ ہوا، لیکن حضرت والا کی صحبت میں خواہ وہ جسمانی حاضری کے ذریعہ ہو یا بذریعہ خط وکتابت، ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے راست کشش محسوس ہوتی ہے اور اب احقر کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ بدعتی اور قبر پرست کو توحید کا کچھ مزہ ملتا بھی ہوگا۔ توجہ کا طالب غلام محمد۔

جواب :۔ یہ احوال وکیفیات ہیں اور ان میں سے ہر ایک صحیح اور درست ہے، رسول کریم ﷺ سے محبت بھی اللہ ہی کی خاطر ہے، حضور انور ﷺ وسیلہ ہیں مقصود نہیں ہیں، إني وجهت وجهي للذي فطر السموات والأرض حنيفا، وماأنامن المشر كين [انعام:۷۹]، حضور کی محبت بھی واجب بلکہ فرض ہے، بلکہ اس کی حیثیت وضو کی فرضیت کی ہے، جس کے بغیر نماز درست نہیں، لیکن وضو مقصود نہیں، مقصود نماز ہے، اس بات کو زبان سے ظاہر کرنے میں اکثر

(۱) تذکرۂ سلیمان ص:۵۶۵

غلطی کا اندیشہ ہے، اس لئے اس کا مذاکرہ نہ کیا جائے۔(۱)

حب طبعی نہیں حب عقلی:

مولانا غلام محمد صاحب رقمطراز ہیں: حضرت والا حب طبعی نہیں حب عقلی کے قائل تھے جو اعمال صالحہ کا محرک ہو اور دلیل قرآنی میں یہ آیت شریفہ تلاوت فرماتے تھے کہ إن كنتم تحبون الله فاتبعوني. [آل عمران:۳۱]

کمزور حافظے کی دعا:

سوال: احقر کی اہلیہ کا حافظہ کمزور ہے، دوا جاری ہے، کوئی دعا یا ورد بھی اس سلسلہ میں ہدایت فرمایا جائے تو زیادہ تقویت ہو؟

جواب:۔ حافظہ کی قوت کیلئے دوا کیجئے اور یہ تسبیح بھی پڑھ لیں، فالله خير حافظا وهو أرحم الراحمين.[یوسف:۶۴] (۲)

خطرہ کا ذہن میں خود بخود آجانا:

گو حضرت والا کے ارشاد کے مطابق اپنے نقائص پر نظر رکھنے کی سعی کرتا ہوں، لیکن پھر بھی دوسروں کے دینی نقائص پر نظر بہت جاتی ہے، اور بالخصوص اہل علم حضرات کی بے عملیوں پر کہ علم کے باوجود یہ عملا دین کی جانب متوجہ نہیں ہوتے، ہر چند یہ خیال کرتا ہوں کہ نہ میں محتسب، نہ اس فکر سے حاصل، پھر بھی یہ بدنظری نہیں جاتی، اس سے نجات کی کوئی صورت تجویز فرمائی جائے تو بڑا کرم ہوگا۔

جواب :۔ خیر اگر بطور خطرہ کے ذہن میں خود بخود آجائے تو حرج نہیں، مگر اس کے مطابق عمل نہ کریں، میر کا ایک مصرع حضرتؒ نے اس موقع پر لکھا ہے ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

(۱) ایضا:۵۶۵۔۵۶۶

(۲) تذکرۂ سلیمان ص:۵۸۳

قرآن پاک میں ہے: علیکم أنفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم،[مائدہ:۱۰۵] اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔(۱)

دعوت میں تبشیر کا پہلو:

تبلیغی کام میں تفہیم وتقریر کیلئے احقر ہی کو مجبور کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ احقر کا رجحان تو تبشیر سے زیادہ تنذیر کی طرف مائل ہے، مگر فی زمانہ کس پہلو کو غالب رکھنا اولیٰ ہے؟

جواب:۔کوئی حرج نہیں، مگر" ان أجری الا علی اللّٰہ'[یونس:۷۲]' کے سوا کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہ ہو، تصحیح نیت ہر کارِ خیر کی جان ہے، اور حضرات صوفیاء سے زیادہ اس کی نزاکت کو پہچاننے والا کوئی نہیں، تبشیر اور انذار کا کلیہ قاعدہ کوئی نہیں، اشخاص زیر دعوت کے حالات پر منحصر ہے، بہر حال تبشیر کو ترجیح ہے(۲)

استقامت کی دعا:

سوال۔بحمداللہ حضرت والا کی دعاؤں کی برکت سے معمولات پر پابند ہوں

جواب۔مبارک کہ استقامت بڑی نعمت ہے: قل اللّٰہ ثم استقم، (صوفیا کے مقولہ الاستقامة فوق الکرامة "کی قرآنی اصل بتادی ہے: ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکةألا تخافوا ولا تحزنوا وأبشروا بالجنة التی کنتم توعدون [حم السجدہ:۳۰]. غلام محمد)(۳)

رسوخ ایمان:

سوال:حضرت والا سے التجا ہے کہ احقر کے رسوخ ایمان کے لئے بطور خاص دعا فرمائیں؟

(۱)ایضا:۵۸۶
(۲)تذکرۂ سلیمان:۵۹۱
(۳)ایضا:۵۹۲۔۵۹۳

جواب: دل سے آپ کے لئے درگاہ باری تعالی میں دعا ہے: إنه سمیع قریب مجیب[سبا:۵۰].(۱)

سر کے بال سفید ہونا:

سوال: پرسوں اہلیہ نے دیکھا کہ ان کے سر کے بال سب سفید ہو گئے ہیں؟

جواب: شاید کہ اولاد کی بشارت ہو:واشتعل الرأس شیبا.[مریم:۴](۲)

وقت کی اہم پکار:

خود مسلمان بننا، دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی اہم پکار ہے اور اس فرض کو نفرت کے بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے، جس کے سامنے آپ دعوت پیش کرتے ہیں۔اس پر شفقت اور اس سے محبت دعوت کا محرک ہو تب ہی وہ کامیاب ہوسکتی ہے، جیسا حضور انور ﷺ کی سیرت میں ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی شہادت ہے:**لاتحزن**[توبہ:۴۰] اور" **ولا یحزنک قولھم**[یونس:۶۵] "اور"**ولاتکن في ضیق مما یمکرون**[نحل:۱۲۷] "اور" **عزیز علیه ماعنتم**" [توبہ:۱۲۸]وغیرہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ منشائے دعوت شفقت برکفار تھی کہ داعی اور مدعو نہ ملیں گے اور ایک کو دوسرے سے دلی لگاؤ نہ ہوگا تو ایک دل سے دوسرے دل کی طرف تأثیر منتقل نہیں ہوسکتی۔(۳)

ذکر سے مقصود:

ذکر جہری اور سری دونوں مشروع ہیں، اب جس کو جس سے مناسبت ہو، جہری کے معنی یہ ہیں کہ جس کی آواز اپنے کانوں کو سنا دے، جس کو قرآن پاک میں "**دون الجھر من القول**"[اعراف:۲۰۵] کہا گیا ہے، اس کی تفسیر میں حضرت ابوبکر اور

(۱)(ایضا :۵۹۹
(۲)ایضا:۶۰۶
(۳)تذکرۂ سلیمان:۶۰۶

حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر جہرا اور حضرت ابوبکر سرا تہجد پڑھتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا گیا کہ ذرا آہستہ پڑھو اور حضرت ابوبکرؓ کو کہا گیا کہ ذرا زور سے پڑھو، ذکر سے اصل مقصود تو مذکور یعنی اللہ کا استحضار ہے، یہ نہ ہو تو ''ذکر'' کا، یہ بھی نہ ہو تو ذاکر یعنی قلب کا، جہر میں یہ فائدہ ہے کہ اگر یہ تینوں نہ ہوں تو بھی ذکر لسانی کے برکات تو حاصل ہوں گے، ذکر سری میں زبان کو حرکت نہیں ہوتی صرف قلب سے تصور میں ذکر ہوتا ہے، اس لئے اس کے لئے قلب کی توجہ اور بیداری کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، تسبیح سے اس توجہ میں کمی آجاتی ہے، کیونکہ توجہ تسبیح کے دانوں اور مقدار پر ہوجاتی ہے، ذکر میں مقصود کمیت نہیں، کیفیت ہے۔(۱)

صبر وشکر اور اپنے مقام پر قیام:

غلام محمد صاحب نے ہندوستان کے ناگفتہ بہ حالات کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ:۔ میری رائے میں صبر وشکر کے ساتھ اپنے مقام پر قیام مفید ہے، اور یہ دعا پڑھی جائے '' ربنا اغفر لنا ذنو بنا وإسرافنا فی أمرنا و ثبت أقد امنا وانصر نا علی القوم الکافرین''[آل عمران:۱۴۷](۲)

سوال: حضرت والا کیا یہ ابتدائی دور ہے یا عذاب ہے؟

جواب: عذاب مطلق نہیں! مسلمان کے پچھلے جرائم کی پاداش میں تنبیہی سزا ہے کہ'' **لعلهم یرجعون**''[اعراف:۱۶۸]. (۳)

بزرگوں کا حسن ظن نعمت بھی اور ابتلاء بھی:

غلام صاحب نے حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ مولوی عبدالرحیم صاحب کے متعلق عرض کیا تو فرمایا: کہ بزرگوں کا حسن ظن اس بے استحقاق کے ساتھ میرے لئے نعمت

(۱) تذکرۂ سلیمان ۶۱۵
(۲) تذکرۂ سلیمان:۶۱۵
(۳) ایضا:۶۱۵

بھی ہے اور ابتلاء بھی، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں (یہ ہے عملی تفسیر ''انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء''[فاطر:۲۸] کی)(۱)

تذبذب کا کوئی فائدہ:

قیام وطن یا ترک وطن کے تعلق سے مشورہ کیا تو فرمایا کہ:۔ اب تذبذب سے کوئی فائدہ نہیں، ''اذا عزمت فتو کل علی اللّٰہ''[آل عمران:۱۵۹]، رویا ہر قسم کے ہوتے ہیں، بہر حال آپ جو کچھ فیصلہ کر چکے، اس پر جمے رہئے اور تذبذب کو دل سے نکال دیجئے(۲)

مسابقت إلی الخیر بہتر:

مسابقت الی الخیر جس میں غیر کی تحقیر اور اپنی بزرگی کا خیال نہ ہو بہتر ہے، ''وسابقوا إلیٰ مغفرۃ'' [حدید:۲۱]، اور وفي ذلك فلیتنافس المتنافسون، [مطففین:۲۶] لیکن بجائے اہل اللہ کی نظر اور شیخ کی نظر میں مقام کے حصول کے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں قبول کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ یہ بھی غیر اللہ ہیں(۳)

مخلصانہ تعلقات موجب برکت:

غلام محمد صاحب نے علامہ موصوف سے اپنے غایت درجہ تعلق کا اظہار کیا تو فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی زندگی کو آپ کے اہل بیت کیلئے اور زیادہ موجب برکت بنائے واجعلنا للمتقین إماماً[فرقان:۷۴](۴)

اللہ کی رضا کا حصول:

گزشتہ ڈیڑھ مہینے میں بعض مرتبہ یکا یک یہ حالت ہوجاتی ہے کہ خود متحیر ہوجاتا ہوں کہ اللہ میاں کو کیسے پاؤں؟ کہاں پاؤں؟

(۱) ایضا:۶۲۸ (۲) ایضا:۶۳۲
(۳) ایضا:۶۵۴
(۴) ۶۵۸

جواب: یہ تحیر خود ایک منزل ہے، جس سے بہر حال گزرنا پڑتا ہے اور اس سوال کا پیدا ہونا خود دلیل طلب ہے، اللہ تعالی کے پانے کے معنی اللہ کی رضا کے حصول کے سوا کچھ اور نہیں، بندہ پر رضائے الٰہی کی طلب اور اس کے لئے سعی ومحنت فرض ہے لیکن اس کا حصول بندہ کے اختیار میں نہیں، اس لئے وہ اس کا مکلّف نہیں، حضرت مہاجر مکیؒ کی زبان میں اس کا ڈھونڈنا شرط ہے، اس کا پانا شرط نہیں ہے فرمایا:

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہیں پر تجھ کو چاہئے کہ تگاپو لگی رہے

احکام الٰہی کی طاعت اور عبادت کئے جائیے، یہی آپ کا فرض ہے، اس کی فکر نہ کیجئے کہ قبول ہوئی یا نہیں ہوئی، گو حضرت مہاجر مکیؒ کے قول کے مطابق جب ایک وقت کی نماز کے بعد دوسرے وقت کی نماز کی توفیق عطا ہوتی ہے تو پہلے وقت کی نماز یہ قبولیت کی علامت ہے، اور یہی منشا "والذین اهتدوا زادهم هدى" [محمد:۱۷] کا ہوسکتا ہے، پھر آپ کو تحیر کیوں ہو۔(۱)

اصل چیز مخالفت ہوائے نفس ہے:

اس ناکارہ کا عجیب حال ہے، رہ رہ کر داعیات معصیت ابھر آتے ہیں اور ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ.....یہی نہیں بلکہ ایمانیات میں تک خدشات لاحق ہوتے ہیں؟

جواب: داعیات معصیت کا ابھرنا برا نہیں، انسان سے معصیت کی قوت مسلوب نہیں ہوتی، اگر مسلوب ہوجائے تو مجاہدہ کہاں رہے جس کا حاصل مخالفت ہوائے نفس ہے، البتہ قوت مضمحل ہوجاتی ہے اور یہی اضمحلال غایت طریق ہے، ان داعیات کے ابھرنے سے غم ہونا سالک کو اس کے مومن ہونے کی دلیل ہے، اگر خدانخواستہ ان سے انشراح ہو تو بے شبہ وہ کفر کی نشانی ہے، اس لئے آپ کو جو داعیات وتنبیہات محسوس ومتخیل ہوتے ہیں وہ وسوسۂ شیطانی ہیں، جب ایسا وسوسہ پیدا ہو، وسوسہ کی طرف سے ترک التفات اور اعراض

(۱) تذکرۂ سلیمان:۶۶۷

کر کے اللہ کی پناہ میں آجائیے جو أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم کا ماحصل ہے، اور یہ دعا پڑھئے: ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة إنك أنت الوهاب، [آل عمران:۸] یا حدیث کی یہ دعا پڑھئے: يا مقلب القلوب ثبت قلبي على دينك، مغیبات کا ایمان مطلوب ہے، باقی طمأنیت تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، حضرت ابراھیم علیہ السلام کا سوال "كيف تحي الموتى" خلاف ایمان نہیں، اسی لئے جب سوال ہوا "أولم تؤمن" تو جواب میں فرمایا "بلى ولكن ليطمئن قلبي" [بقرة:۲۶۰] یہ طمانیت معائنہ ہر ایک کو کہاں میسر ہے إلا مارحم ربي. [یوسف:۵۳](۱)

کلمۂ طیبہ میں اثبات ونفی کے پہلو:

لا إله إلا اللّٰه کے دو جزء ہیں، ایک لا إله یعنی ہر حادث کی نفی (لا أحب الآفلين) [انعام:۷۶] اور دوسرے إلا اللّٰه یعنی صرف ذات الٰہی کا اثبات، چونکہ اس کلمہ کے دو جز ہیں اس لئے ابتداءً اس کا کلی تصور قائم ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لئے مبتدی کو چاہئے کہ لا إله إلا اللّٰه کے ذکر کے وقت اولاً صرف لا إله کا تصور کرنے کی کوشش کرے کہ دل سے ہر ایک محبوب شی کی نفی ہو رہی ہے اور پھر "لا إله" کہتے وقت اثباتی تصور قائم کرے۔(۲)

"لا إله إلا اللّٰه" میں "إله" لفظ ساری صفات الٰہیہ کا جامع ہے، جب کبھی اس کے مفہوم کو کسی ایک صفت کے ساتھ خاص کر کے اس کلمہ کی توجیہ کی گئی تو گمراہی کا دروازہ کھل گیا، جیسے صوفیاء نے "لا إله" کی تعبیر "لا موجود" سے کی، اس کا نتیجہ وحدۃ الوجود اور اسکی موشگافیوں کی صورت میں ظاہر ہوا"۔

"بدعتیوں نے اللہ میاں کی حکومت کو بھی بس شاہ انگلستان کی حکومت سمجھ رکھا ہے کہ نام بادشاہ کا اور اختیارات پارلیمان کے، زبان پر "لا إله إلا اللّٰه" باقی جو مانگنا ہے وہ بڑے پیر صاحبؒ سے، خواجہ اجمیری اور دوسرے اولیاء اللہ سے"۔(۳)

(۱) تذکرۂ سلیمان:۶۷۲-۶۷۳
(۲) تذکرۂ سلیمان:۳۷۳
(۴) تذکرۂ سلیمان ۳۳۷-۳۳۸

قلب کی اصلاح:

شروع سے آخر تک تمام تر توجہ ''لطیفہ قلب'' ہی کی اصلاح پر مرتکز رہنی چاہئے، کیونکہ یہی لطیفہ منصوص ہے اور اسی کی اصلاح مقصود، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے: من أتى الله بقلب سليم[شعراء:۸۹] اور حدیث " ألا وهي القلب". (۱)

عمل کی تصحیح کرنا

إن اللّٰه عليم بذات الصدور [آل عمران:۱۱۹] کا استحضار ایسے وقت میں کر کے تصحیح اپنے عمل کی کرلیں، (آیات قرآنی سے بیش از بیش تذکیری وعلمی فائدہ اٹھانا علمائے عارفین ہی کا حصہ ہے، ورنہ علمائے قشر تو محض نظری بحثوں میں مگن رہتے ہیں مثلاً وہ اسی پر نازاں ہیں کہ اس آیت سے انہوں نے فلاسفۂ یونان کا رد کر کے ثابت کر دکھایا کہ حق تعالی کا علم کلیات تک محدود نہیں بلکہ جزئیات کو بھی حاوی ہے.....مگر ذرا غور کیجئے کہ اس جواب سے حاصل کیا ہوگا جب تک کہ اس کے منشاء کو سمجھ کر اس سے اصلاح وتقویتِ عمل میں مدد نہ لی جائے) (۲)

کوشش پر انحصار:

"قلب العبد بين اصبعين من أصابع الرحمن" اس حدیث شریف سے بظاہر احوال قلبیہ کا غیر اختیاری ہونا معلوم ہوتا ہے، اگر ایسا ہو تو پھر اعمال بھی غیر اختیاری ہو جائیں گے، نیک وبد بننا بندے کی اختیاری بات نہ ہوگی، براہ کرم توضیح فرما کر تشفی فرمائی جائے؟

جواب: جی ہاں، ایسا ہی ہے، مگر اللہ تعالی نے اس کے بھی قواعد مبنی بر حکمت بنا رکھے ہیں، اس لئے یہ شبہ غلط ہے: والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا، والذين اهتدوا زادهم هدى. [محمد:۱۷] (۳)

(۱) تذکرہ سلیمان ج۱/۳۷۳
(۲) ج۱/۴۴۶
(۳) ج۱/۴۸۰

امانت کا متعین مفہوم:

"إنا عرضنا الأمانة" [احزاب:۷۲] والی آیت پاک میں ''امانت'' کا متعین مفہوم کیا ہے؟

جواب: امانت، اللہ تعالی کی صفات کاملہ کے وہ عکوس وظلال ہیں جو بندہ کو بطور خلافت ملے ہیں، پوری وضاحت راندیروالے خطبہ " الجهد والجهاد لعلمي المعاش والمعاد " میں کی جا چکی ہے۔(۱)

دولت سے نوازے جانے کا مقصد:

اللہ تعالی جب کسی کو دولت وثروت سے نوازتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تعالی چاہتا ہے کہ اس کو تقسیم دولت کا ذریعہ بنائے اور اس کے ہاتھ سے بانٹے، یہ انسان کے لئے کچھ کم شرف نہیں ہے، (مولانا غلام محمد صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت کا یہ ارشاد ٹھیک اس قرآنی ہدایت کا آئینہ دار ہے جو قارون کے قصے میں اہل علم ومعرفت کی زبان سے نقل فرمائی گئی ہے کہ انہوں نے قارون سے کہا: ولا تنس نصيبك من الدنيا وأحسن كما أحسن اللّٰه إليك [قصص:۷۷] (۲)

صبر وصلاۃ نسخۂ شفا:

حیدرآباد کا مستقبل قریب نازک تر دکھائی دے رہا ہے؟

جواب: اس نزاکت احوال کا دفعیہ اور علاج کیا آپ کے اختیار میں ہے، اگر نہیں تو پھر یہ اضطراب قلبی وایمانی کیوں؟ اضطراب طبعی میں حرج نہیں، اس کا علاج "واستعينوا بالصبر والصلاة" [بقرۃ:۴۵] ہے، حیدرآباد کو اپنے دو برس کی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہے، اس میں دینداری اور اشاعت رسوم وبدعات اور پھر تشیع کے ساتھ تو معموری

(۱) ج۱/۵۱۴
(۲) ج۱/۵۲۲

ممکن نہیں (مولانا غلام محمد فرماتے ہیں کہ باتیں کس قدر صاف وصریح اور نتائج کا ذکر کس قدر یقینی پیرایہ میں ہے، سچ کہا جس کسی نے کہا ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید (۱)

سوال: قنوطی خیالات غالب، لہٰذا یاس زیادہ آس کم!

جواب: مؤمن قانط نہیں ہوسکتا، لاتقنطوا من رحمة الله [زمر:۵۳] اور انه لاييأس من روح الله الا القوم الكافرون ،[یوسف:۸۷] بظاہر جو یاس مومن پر ہوتی ہے، وہ عدم ظہور اسباب سے ہے، تو خوب سمجھ لیجئے کہ مسبب الاسباب پر نظر ہو تو عدم ظہور اسباب سے دل پر قنوط راہ نہ پائے، پس ہمیشہ "فتوكل على الحي الذي لا يموت" [فرقان:۵۸] پر نظر رکھئے، یہ کیفیت انشاءاللہ دور ہوجائے گی۔(۲)

(۱) ج۱/۵۲۲
(۲) تذکرۂ سلیمان ۴۴۵

خطوط سلیمان (مخطوطہ)

(مرتبہ مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ)

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ ندوۃ العلماء کے ممتاز مفسر، کامیاب استاد اور تجربہ کار مربی ہیں، آپ کی پیدائش ۱۹۱۴ء اور انتقال ۱۹۷۶ھ میں ہوا، ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی، ۱۹۲۷ء کو ندوہ کے درجہ چہارم عربی میں داخلہ لیا، اور ۱۹۳۲ء میں فضیلت سے فارغ ہوئے، چند دنوں کے لئے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے استفادہ کی غرض سے دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں کچھ کتابیں پڑھیں، ۱۹۳۶ء میں دارالمصنفین تشریف لے گئے، جہاں ۱۹۴۶ء تک قیام کیا، اس مدت میں علامہ سید سلیمان ندویؒ سے تیس پارے قرآن مجید کی تفسیر، الفوز الکبیر، کشف الدولۃ مولفہ ابن رشد اور میبذی پڑھی اور انہی کی رہنمائی میں علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا، اور ابن قیم کے تفسیری افادات کو "التفسیر القیم" کے نام سے مرتب کیا، قرآنی علوم سے فطری شغف کی بنیاد پر دارالعلوم میں قرآنیات کے استاد مقرر ہوئے، پھر ندوۃ العلماء کے مسند شیخ التفسیر کو زینت بخشا، دوران قیام ندوۃ العلماء آپ کی سید صاحبؒ سے مراسلت بھی رہی، ذیل میں قرآنی مباحث سے متعلق مراسلت کے قرآنی تراشے پیش کئے جارہے ہیں، واضح رہے کہ یہ خطوط کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔

"مصدقاً لما بين يديه" کا مفہوم:

قرآن پاک میں "مصدقا لمابين يديه [بقرۃ:۹۷] "یا" لما معكم [بقرۃ:۴۱] "بار بار آیا ہے، جس سے مقصود تورات وانجیل ہی ہے، تورات وانجیل کی

تحریف کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہے، مگر اس تحریف کے معنی تحریف بالقصد کے نہیں، بلکہ مترجمین نے ترجموں میں مطالب کی توضیح وتشریح کی خاطر اپنی اپنی فہم کے مطابق کچھ سے کچھ کر دیا، جس سے صحت استدلال اور صحت معانی کی طرف سے امان اٹھ گیا، مگر بایں ہمہ ان کے جوہری مطالب ہیں، مثال یہ ہے کہ ابھی قرآن پاک کے اردو اور انگریزی ترجموں کے آغاز کو چند سال ہی گزرے ہیں، اس اثنا میں جو ترجمے ہوئے ہیں ان کو باہم ملا کر دیکھیں تو آپ کو قرآن پاک میں اضافہ وتحریف معلوم ہوگی، جس سے کہیں مفہوم میں تنگی آ گئی ہے، کہیں اصل مفہوم میں تعمیم پیدا ہوگئی ہے، کہیں مسئلہ کی صحیح صورت بگڑ گئی ہے، مگر بایں ہمہ جوہری امور میں یہ ترجمہ مختلف نہیں اور وہ سب صحیح ہیں، اس طور سے قرآن جوہری میں ان کے مصدق ہونے کے ساتھ امور ومسائل کے اصل معانی اور استدلال کی صحت میں ان کے تراجم کو محرف سمجھتا ہے (تورات اور انجیل میں تحریف لفظی ہوئی ہے یا معنوی؟ اس مسئلہ پر اہل علم کے درمیان کچھ عالمانہ بحثیں ہیں، اس مقام پر سید صاحب نے جس کی ترجمانی فرمائی ہے اس کا رجحان تحریف معنوی کی طرف ہے، مگر یہ سید صاحب کی آخری اور مختتم رائے نہ تھی اس لئے کہ درس قرآن میں سید صاحب نے ''تفسیر فتح العزیز'' کی ان عبارتوں کی طرف مخصوص طور سے متوجہ فرمایا تھا جن میں تحریف لفظی پر زور دیا گیا ہے۔ (اویس)

تحریف کا مفہوم:

ایک بات اور ذہن میں رہے '' **یحرفون الکلم عن مواضعه** ''[نساء:۴۶] کا یہی مطلب نہیں کہ وہ تورات وانجیل میں تحریف کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ قرآن کی سیدھی سی بات کا غلط مطلب قرار دے کر اس پر معترض ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جو باتیں وہ سنتے ہیں اس کو غلط سمجھ کر یا بالقصد اس کو بگاڑ کر دوسروں کو سمجھاتے ہیں۔

کلمۃ اللہ کا مفہوم:

کلمۃ: خاص حضرت عیسی کیلئے نہیں بلکہ ہر حادثہ کیلئے ہے، ہر مخلوق کیلئے ہے، کلمۃ کے معنی قرآن پاک کی اصطلاح میں ''امر مقدر'' کے ہیں، اب دیکھ لیجئے کہ قرآن پاک میں ''کلمۃ'' ان معنوں میں کتنی جگہ آیا ہے: **ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین** [صافات:۱۷۱] **ولولا کلمة سبقت من ربک** [یونس:۱۹] حضرت عیسی کے غیر معمولی پیدائش کا مفہوم ''امر مقدر'' یعنی کلمہ سے ادا ہوا ہے۔

حواری کے معنی:

حواری کے معنی حبشی میں دھوبی اور مچھیرے کے ہیں، عربی میں حور کے معنی سپیدی کے ہیں، جس سے حوراء اور حور کے لفظ نکلے ہیں چونکہ حضرت عیسی کے ابتدائی ساتھی دھوبی اور مچھیرے تھے، اس لئے ان کا نام مشہور ہوگا۔

اناجیل کا تضاد:

حضرت عیسٰی کے اپنی ماں کی عزت نہ کرنے کا حوالہ متی ۱۲۔۴۶ سے ۵۰ تک میں ہے، فرمایا کہ میری کون ماں اور کون بھائی! حضرتؑ کے نماز اور روزہ پر زیادہ زور نہ دینے کا ذکر لوقا ۵۔۳۳ میں ہے

ہر زندہ چیز پانی سے بنی ہے:

سورۂ انبیاء رکوع ۳ میں جو آیت ہے وہ پوری یوں ہے:۔ **وجعلنا من الماء کل شئی حیی** [انبیاء:۳۰] (ہر زندہ چیز پانی سے بنی ہے)، تورات پیدائش بھی دیکھ لیجئے کہ دنیا پانی سے کیسے بنی، آج کل کے سائنس داں بھی زندہ مخلوقات کا آغاز پانی سے کرتے ہیں، بہر حال یہ آغاز مخلوقات کا ذکر ہے '' **وکان عرشه علی الماء** '' [ھود:۷] اس وقت دوسرے عناصر کا وجود نہ تھا۔ نور (۴۵) میں **واللّٰه خلق کل دابة من ماء** میں

ہر جاندار کے ایک خاص پانی سے پیدائش کا جو ذکر ہے، اس سے مراد نطفہ ہے، اسی لئے پہلی آیت میں الماء ہے اور دوسری آیت میں ماء (ایک پانی) ہے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ذکر فرمایا ہے، نطفہ سے یعنی پانی کے چند قطروں سے پیدائش ہوتی ہے، مگر عجائب کاری دیکھئے کہ کوئی بے پاؤں کا، کوئی دو پاؤں کا، کوئی چار پیروں کا، **إن اللّٰہ علی کل شیئ قدیر**، [بقرۃ:۲۰] یہ وہ ماء ہے جس کے بارے میں ہے **فالینظر الانسان مم خلق خلق من ماء دافق یخرج من بین الصلب والترائب**" [طارق:۷].

شکر کی حقیقت:

یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اس سال قرآن پاک کی ایک اور خدمت کی تکمیل کی توفیق پائی، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے آپ سے یہ کام لیا، اور اس لئے اسی کا شکریہ ادا کیجئے، شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کی اپنے طرف نسبت کرنے کے بجائے خالص اللہ تعالیٰ کا فضل وعطا سمجھا جائے اور اس کے شکریہ میں مزید خدمت انجام دی جائے، تاکہ مزید فضل ہو: **لئن شکرتم لأزیدنکم** .[ابراہیم:۷] (۳۰ ذی الحجہ ۱۹۳۹ء بھوپال)

معیت الٰہی:

مسئلہ معیت الٰہی میں تین قسم کی آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ایک میں بدلالت قرینہ معیت رحمت ونصرت مقصود ہے جیسے **إن اللّٰہ مع الصابرین**، [بقرۃ:۱۵۳] **إن اللّٰہ لمع المحسنین**، [عنکبوت:۶۹] **إن اللّٰہ مع الذین اتقوا** [نحل:۱۲۸] وغیرہ، دوسری وہ آیتیں ہیں جن میں معیت علمی مقصود ہے، **وھو معکم أینما کنتم** [حدید:۴]. **وما یکون من نجوی ثلاثۃ إلاھو رابعھم ولاخمسۃ إلاھو سادسھم، ولاأدنی من ذلک ولا أکثر إلاھو معھم** [مجادلۃ:۷] وغیرہ، تیسری وہ آیات ہیں جن میں اطلاق ہے، جیسے **أینماتولوا فثم وجہ اللّٰہ** [بقرۃ:۱۱۵]، **ونحن أقرب إلیہ من حبل الورید** [ق:۱۶]، **نحن أقرب إلیہ منکم ولکن لاتبصرون** [واقعۃ:۸۵]،

اب سوال یہ ہے کہ ان آیات میں کون سا قرب اور معیت مراد ہے، ایک گروہ معیت علمی کی آیتوں کے قیاس پر ان سے معیت وقرب علمی سمجھتا ہے، جبکہ قرآن پاک کی ان آیتوں کا منشا ہے **وسع ربنا کل شئی علما**، [اعراف:۸۹] **إن اللّٰہ أحاط بکل شئی علما**، [طلاق:۱۲] **وأحصی کل شئی عددا** [جن:۲۸]، اور بعض صاحبوں نے لغت پر اعتبار کر کے قرب ومعیت ذاتی کو مراد لیا، لیکن چونکہ قرب ومعیت ذاتی کے ماننے پر بعض اشکالات پیش آتے ہیں اور وحدۃ الوجود کے بجائے بہتوں نے وحدۃ الموجود کا عقیدہ اختیار کر لیا، اس لئے متکلمین نے قرب ومعیت ذاتی سے انکار کیا، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی کتاب "مبدأ ومعاد" میں اس معیت کو متشابہات میں قرار دیا ہے، غرض یہ ہے کہ معیت وقرب پر اجمالاً عقیدہ رکھا جائے اور اسکی تفصیل وتشریح کے پیچھے نہ پڑا جائے۔
(۹ فروری ۱۹۴۷ء بھوپال)

علمی تحقیقات:

مسرت ہوئی کہ علمی تحقیقات کا شوق ہے، تم نے شہد اور مکڑی کا حال پڑھا، شہد کی مکھی جب پھولوں کا رس چوستی ہے تو شہد بناتی ہے، مکڑی کے پیٹ میں جتنا لعاب ہوتا ہے اتنی ہی جالا تنتی، پہلے پھولوں کے رس اور پیٹ کے لعاب کی ضرورت، پھر شہد خود بن جائے گا اور جالا خود ہی تن جائے گا۔

قصص کی اہمیت شاہ صاحب کی نظر میں:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قصص کو بجا حیثیت دی ہے، بات یہ ہے کہ انسان ماجریات زمانہ کا جن کا قصص نام ہے، فطرۃً عاشق ہے کہ وہ خود اس کی روداد ہوتی ہے، قصہ، قصّ سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی اگلے نقش قدم پر قدم رکھنا جیسا کہ قرآن میں حضرت موسیٰ وہارون کے مقام حوت تک واپس پھرنے کے موقع پر ہی **فارتدا علی اثار ھماقصصا** [کہف:۶۴] تو قصہ تام ہوا، اس نقش زندگی کا جو پہلے ایک دفعہ

رقم ہو چکا اور پھر تم اس کو قولاً یا عملاً دھراؤ۔ دلیل کی بنیاد قیاس پر ہے، قیاس اس کا نام ہے کہ ایک ہم جنس پر جو حکم ثابت ہو چکا ہے ہم جنسی کی بنا پر اس کے ہم جنس پر تم وہی حکم لگاؤ، اس بنا پر قصہ بھی ایک قسم کا استدلال قیاسی ہے۔

استدلال کا اصل مقصد سامع کو متاثر بنا کر اعتراف پر آمادہ کرنا ہے، قصہ میں یہ چیز نہایت خوبی سے پائی جاتی ہی، یہی وجوہ ہیں کہ اکثر علماء نے خصوصا یونان اور ہندستان کے علماء نے انبیاء بنی اسرائیل نے بھی اس سے کام لیا اور حیوانات کے ذریعہ حکیمانہ قصے بیان کئے۔ حضرت عیسیٰ کی تمثیلات کا بھی یہی درجہ ہے۔ کلیہ دمنہ، بوذ ایوسف، ویلوہر، اور الف لیلہ کے صدہا زبانوں میں ترجموں کا یہی راز ہے، ایساپ حکیم کے قصص بھی اسی طرح ہیں، مواعظ لقمان بھی اسی رنگ میں ہیں، بعض لوگ لقمان اور ایساپ کو ایک ہی جانتے ہیں۔

(۲۷ ستمبر ۱۹۳۲ء)

اذان میں مقام محمود کی دعا امت کے لئے:

اذان کے بعد جو دعا مانگی جاتی ہے اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات کے لئے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے لیکن درحقیقت حضور ﷺ کیلئے اس میں جو دعا مانگی جاتی ہے یعنی ''مقام محمود'' وہ امت ہی کے لئے ہے۔ حضور ﷺ کا مقام محمود تک پہونچنا اور شفاعت کے منصب سے سرفراز ہونا امت ہی کی بھلائی کے لیے ہے۔

محبوبیت کا حصول:

حضرت سرور کونین ﷺ کی بارگاہ الٰہی میں محبوبیت قرآن پاک کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ قل إن كنتم تحبون الله فاتبعو نى يحببكم الله، [آل عمران:۳۱] یعنی ہم کو بارگاہ الٰہی میں محبوبیت اس سے حاصل ہوگی کہ اسوۂ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں، تو جس ذات کا اسوہ اتنا محبوب ہو کہ جو اس کو اختیار کرے وہ محبوب ہو جائے تو خود اس ذات کی محبوبیت کا کیا ٹھکانا؟

جذبات کے مقتضی پر عمل ہو:

علم اخلاق کا ایک مسئلہ ہے کہ انسانی طبائع میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اصلاح میں یہ کوشش نہ کرنا چاہیے کہ وہ جذبات ہی نہ پیدا ہوں، بلکہ یہ کوشش ہونا چاہئے کہ ان جذبات کے مقتضیٰ پر عمل نہ کیا جائے۔ قرآن پاک کی ایک آیت میں اس مسئلہ کا پورا اشارہ موجود ہے فرمایا:۔ ولن تستطيعو ا أن تعدلو ا بين النساء ولو حرصتم [نساء :۱۲۹] معلوم ہوا کہ یہ تو انسان کے بس میں نہیں ہے، البتہ اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرنا انسان کے بس میں ہے۔ اس لئے حکم فرمایا: فلاتميلوا كل الميل فتذروها كالمعلقة: [نساء:۱۲۹]

سبحان اللہ اور الحمد للہ اور اللہ أکبر کے معنی:

سبحان اللہ میں وہ تمام امور جو باری تعالیٰ کی شان میں مناسب نہیں ہیں ان سے تنزیہہ مقصود ہے، الحمد للہ میں خدا کے لئے تمام صفات کاملہ کا اثبات ہے، اللہ اکبر میں صفات الٰہیہ کا کسی غیر اللہ میں پائے جانے سے انکار ہے۔

وضع میزان کا مطلب:

قرآن پاک میں وضع میزان سے مقصود فطرت سلیمہ ہے جو خیر کی طرف طبعًا راغب اور شر سے طبعا متنفر ہے۔ (تفسیر طبری سورۂ رحمٰن)

قنوت نازلہ کا ماٰخذ:

سورہ نوح رکوع آخر میں قنوت نازلہ کا ماٰخذ موجود ہے۔

مسجد سے نکلنے والی دعا کا ماٰخذ:

مسجد سے نکلنے کی دعا: اللّٰهم إنى أسئلك من فضلك العظيم کا ماخذ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔ فإذا قضيت الصلا ة فانتشروا فى الأرض وابتغوا من

فضل اللہ۔ [جمعہ:۱۰]

توبہ کرنے کی ایک دعا:

آیت لاإلـه إلا أنت سبحانك إني كنت من الظلمين [انبیاء:۸۷] کے سلسلہ میں فرمایا کہ: حضرت یونس علیہ السلام قوم کے ایمان سے ناامید ہوکر، یا عذاب الٰہی کے خیال سے نینوا سے چلے گئے، راستہ میں ان کو بیحد مشکلات پیش آئیں ،تو فرمایا کہ: خداوند! جو کچھ ہوا اس کا میں ذمہ دار ہوں "إني كنت من الظالمين" تو پاک ہے "سبحانك"

صلاح بیت مطلوب ہے:

"واجعلنا للمتقين إماما" [فرقان:۷۴] میں اشارہ ہے صلاح بیت کی طرف، یعنی میرے اہل خاندان صاحب صلاح وتقویٰ ہوں، یہی چیز آنکھ کی ٹھنڈک کا باعث ہے۔

"ذات ألواح ودسر" کا مطلب:

سورۂ قمر میں حضرت نوح علیہ السلام کے سلسلہ میں 'ذات ألواح ودسر [۱۳]' آیا ہے، خیال ہوتا تھا کہ ان الفاظ کے استعمال میں کیا مصلحت ہے؟ اصل یہ ہے کہ اس سورہ میں آیات الٰہیہ کا ذکر ہے، دکھلانا یہ ہے کہ طوفان اتنا عظیم الشان آیا: کیا ان میں ان تختوں سے کام لیا جاسکتا تھا؟ مگر ہماری عظمت وقدرت کا تماشا دیکھو کہ انھیں تختوں پر نجات دیدی!

"کواعب أترابا" کا مطلب:

آیت "کواعب أترابا" [نبأ:۳۳] کے سلسلہ میں فرمایا کہ: یہ منجملہ نعمتہائے جنت کے ہے، اس سے استنباط کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی قوی مانع نہ ہو تو زوجین میں ہم سنی ہونا چاہیے۔

الأسماء کا مفہوم:

علم آدم الآسماء [بقرہ۳۱] کے سلسلہ میں فرمایا کہ: آدم علیہ السلام کو اسماء

یعنی صفات اور خواص کا علم دیا گیا، اب تک انسان کا علم اس سے آگے نہیں بڑھا۔

نماز کی انتقالات کی وجہ:

بعض غیر مسلمین نماز میں بار بار کے انتقالات پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے یکسوئی قائم نہیں رہتی ہے، اس کا جواب یہ کہ بار بار انتقالات کی وجہ سے برابر تنبہ ہوتا رہتا ہے، ورنہ ایک نشست میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خیال کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے اور توجہ دور پڑ جاتی ہے، لیکن تنبہ نہیں ہوتا رہتا ہے۔

نماز میں درحقیقت حمد باری ہے:

نماز میں درحقیقت حمد باری تعالیٰ ہے، جب بندہ خلوص نیت سے حمد کرتا ہے اور اظہار عجز کیلئے رکوع کرتا ہے، اس کی حمد قبول ہوتی ہے اور وہ "سمع الله لمن حمده" کہتا ہوا سر اٹھاتا ہے، پھر اس قبولیت حمد کے شکریہ میں وہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔

تعوذ ما سوی اللہ کے لئے ایک قسم کا حصار

نماز کے شروع میں یا تلاوت قرآن کے وقت تعوذ کرتے ہیں، اس کی مثال بالکل ایسی ہی جیسے سلیٹ پر لکھتے وقت اس کو بالکل صاف کرڈالتے ہیں، اسی طرح ہمارے قلوب پر ہر قسم کے اچھے اور برے خیالات آتے رہتے ہیں، ان کو صاف کرنے کی ضرورت ہے، اسی ضرورت کو تعوذ سے پورا کیا جاتا ہے، گویا تعوذ ما سویٰ اللہ کے لئے ایک قسم کا حصار ہے۔

جذبۂ شرافت ابھارنا:

آیت 'أعوذ بالرحمن منک إن کنت تقیا' [مریم:۱۸] میں إن کنت تقیا کہہ کر جذبہ شرافت ابھارنا مقصود ہے۔

ایک مفہوم کی دو آیتوں کا مفہوم:

آیت اتقوا الله حق تقاته "[آل عمران:۱۰۲] اور اتقوا لله ما ستطعتم"

[تغابن:۱۶] میں تعارض نہیں ہے، بلکہ "اتقو اللّٰہ حق تقا تہ "[آل عمران:۱۰۲] نصب العین ہے اور "اتقو االلّٰہ مااستطعتم" ہر انسان کی عملی قدرت اور استطاعت کے لحاظ سے ہے۔

جن وانس کا ہر کام عبادت بشرطیکہ اللہ کے لئے ہو:

قرآن پاک میں ہے کہ تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت فرشتوں نے کہا تھا کہ ہم تو تسبیح وتقدیس کرتے ہیں، اس کے جواب میں فرمایا: "**إنی أعلم مالاتعلمون**" [بقرۃ:۳۰] معلوم ہوا کہ جن وانس وہ مخلوق ہے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے لئے اعمال کریں، تو ان کا ہر کام عبادت بن سکتا ہے، سونا، جاگنا، کھانا، پینا اور اسی قسم کے تمام امور، اس کے برخلاف فرشتے ان امور کے محل ہی نہیں ہیں۔

تسبیح وتقدیس فرشتوں کی جبلت:

" نسبِّح بحمد ك ونقدِّ س لك" [بقرۃ:۳۰] کی ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تسبیح وتقدیس فرشتوں کی جبلت ہے، اس کے برخلاف عبادت انسان کی جبلت نہیں ہے، بلکہ اس کا کام تحصیل معرفت ہے۔

نجم کا مفہوم:

سورۂ والنجم میں "نجم" سے بعض لوگوں نے زہرہ مراد لیا ہے، بعض نے ثریا، عرب میں لوگ محاورۃً "نجم" بول کر "ثریا" مراد لیتے تھے، اس کے طلوع، غروب سے موسم بدلتے تھے، لیکن میرے خیال میں اس سے مراد عطارد ہے، وجہ یہ ہے کہ عطارد کو صابئین علم کا فرشتہ مانتے تھے، اس لئے اس کو "دبیر فلک" "منشی فلک" وغیرہ کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اس کو "نبیو" کہتے تھے، اس لئے وہ نبی کو نابی بمعنی پیش گو کہتے تھے، بخت نصر کا انتساب بھی اسی طرف ہے اصل نام "بنوخذا" ہے۔

ہر سال زکوٰۃ دینا ضروری:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس مال پر ایک بار زکوٰۃ دی گئی، اب اس پر دوبارہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جمہور اس کے خلاف ہیں، جمہور کے مسلک کی ایک یہ دلیل بھی ذہن میں آتی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک عورت سے ارشاد فرمایا تھا: **تؤدی زکوتھا**، اگر ہر بار زکوٰۃ نہ ہوتی تو "اُدیت" ارشاد فرماتے! اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أقیموا الصلاۃ وآتوا الزکاۃ [بقرۃ:۴۳].

ہجرت روحانی تربیت کا ذریعہ:

جو لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے، وہ زیادہ تر صاحبان ثروت تھے، اگر محض آلام ومصائب کی وجہ سے جانا تھا، تو وہ جاتے جن کے پاس نہ ثروت تھی، اور نہ حمایت قومی حاصل تھی؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس زادسفر تھا وہ گئے! لیکن دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ غنی نہ تھے، وہ شدائد وآلام کی وجہ سے تربیت یافتہ ہو چکے تھے، دوسروں کے لئے ضرورت تھی کہ ان کی بھی روحانی تربیت ہو، اس لئے انھوں نے ہجرت کی!

صوفیہ کی نسبت کا حاصل:

صوفیہ کی نسبت کا حاصل یہ ہے کہ نسبت بالرضاء (**رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ**) [البینۃ:۸] حاصل ہو جائے، مسلمان جس قدر **ابتغاء لمرضات اللّٰہ** [بقرۃ:۲۰۷] کرے گا گویا حصول نسبت کی کوشش کرے گا۔

برکات کا فیضان:

آیت "الذین اھتدوا زادھم ھدی" [محمد:۱۷] کے سلسلہ میں فرمایا کہ: جب انسان راہ خدا میں قدم رکھتا ہے اور اعمال میں ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے تو ان اعمال پر استمرار ومداومت کرنا چاہئے کہ اس کا نتیجہ "زدنا ھم ھدی" ہے، اس وقت برکات کا فیضان ہوتا ہے۔

معیت الٰہی:

قرآن پاک میں ہے کہ "إننی أناالله" [طه: ١٤] اس سے لوگ کہتے ہیں کہ اللہ جو ہے وہ وجود ہے، حالانکہ اس آیت میں وجود کو حقیقت حق نہیں بتلایا گیا ہے، بلکہ وہ اعم الاشیاء، جو اس موقع پر تعمیر کا ذریعہ بن سکتی تھی، اس کا ذکر فرمایا۔

معجزے کی نافرمانی کے نتیجے میں قوم ہلاک کردی جاتی ہے:

قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے حضرت نبی کریم ﷺ سے معجزات طلب کئے اور بار بار مطالبہ کیا کہ اگر یہ پیغمبر برحق ہیں تو معجزات کیوں نہیں دکھلاتے ہیں؟ کفار کے اس مطالبہ کے جواب میں پیغمبر ﷺ کی طرف سے اعراض برتا جارہا ہے، اس موقع پر بعض نافہم یہ شبہ کرتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ کے پاس معجزات ہی نہ تھے، ورنہ کفار کے اصرار کے بعد تاخیر یا انکار کی کیا وجہ تھی؟ سید صاحب نے پوری تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کی تمام متعلقہ آیات کو پیش فرما کر ثابت کیا کہ معجزات کی تاخیر یا انکار کا سبب یہ نہ تھا کہ نعوذ باللہ حضور ﷺ کے پاس معجزات نہ تھے، بلکہ سات اسباب ہیں جو معجزہ میں تاخیر یا انکار کا باعث تھے، ان ساتوں اسباب کو قرآن مجید سے مدلل فرمایا، ان میں سے ایک سبب یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب قوم معجزہ کا مطالبہ کرتی ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام اس معجزہ کو خدا کے حکم سے ظاہر فرماتے ہیں، پھر بھی اگر قوم ایمان نہیں لاتی ہے تو اس نافرمانی کے نتیجہ میں وہ ہلاک کردی جاتی ہے، اس لئے پیغمبر ﷺ کا معجزہ میں تاخیر کرنا یا اس سے اعراض کرنا امت پر شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے، اس تحقیق کے بعد غور فرمائیے کہ شبہ کا کیا موقع رہ جاتا ہے۔

آیت وصیت اور آیت وراثت کی تفسیر:

اسی طرح قرآن مجید میں جب تک وارثوں کے حقوق کی تعیین نہیں کی گئی تھی،

مسلمان آیت وصیت پر عمل کرتے تھے، وہ جن کو مناسب سمجھتے تھے، ان کے حق میں اپنے مال واسباب کے متعلق وصیت کردیتے تھے، آیت میراث کے نازل ہونے کے بعد یہ صورت باقی نہ رہی، اس لئے عموماً مفسرین آیت وصیت کو آیت میراث سے منسوخ پاتے ہیں۔

سید صاحب فرماتے ہیں کہ: اصل یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کا کوئی خاندانی نظام نہ تھا، باپ مسلمان ہے تو بیٹا غیر مسلم، شوہر مسلمان ہے تو بیوی غیر مسلمہ، وقس علی ھذا، اس صورت میں میراث کی تعیین ممکن نہ تھی، جب مسلمان مدینہ آئے تو مواخاۃ کی بنیاد پر میراث تقسیم ہونے لگی، مگر جب جمعیت بڑھی اور خاندانی نظام قائم ہوگیا تو آیت میراث نازل ہوئی اور اس پر عمل آسان ہوگیا، اس لئے آیت وصیت کو منسوخ ماننے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق حالات سے ہے، خدانخواستہ اگر اب بھی ایسے حالات پیدا ہوجائیں گے کہ کہیں مسلمانوں کا نظام عائلی باقی نہ رہے تو ان کے لئے آیت وصیت سے استفادہ اب بھی ممکن ہے، ورنہ آیت میراث تو موجود ہی ہے، اور یوں بھی آیت وصیت محجوب الارث کے حق میں مفید ہے اس لئے آیت وصیت کو منسوخ ماننا ضروری نہیں ہے۔

ایمان باللہ ایک قرآنی اصطلاح ہے:

سورۂ بقرہ کی ایک آیت ہے: إن الذین آمنوا والذین هادوا والنصاری والصابئین من آمن بالله والیوم الآخر وعمل صالحا فلهم أجرهم عندربهم ولا خوف علیهم ولاهم یحزنون. [بقرہ :٦٢] (بیشک جو لوگ مسلمان ہوئے، اور جو لوگ یہودی ہوئے، اور نصاری اور صائبین ان سب میں جو ایمان لائے اللہ اور قیامت کے دن پر، اور نیک کام کئے، تو ان کے لئے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، ان پر کچھ خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہوں گے)، اس مفہوم کی ایک آیت سورۂ مائدہ میں بھی ہے۔

اس آیت کے آخری ٹکڑے سے بعض نافہموں کو یہ شبہ ہوا کہ یہود، نصاری اور صابئین اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اگر خدا اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہیں اور اعمال صالحہ بھی کرتے ہیں تو وہ نجات پائیں گے، ابھی چند سال ہوئے اس موضوع پر بڑی بحثیں ہوچکی ہیں، سید صاحب اس آیت کی تشریح فرماتے تھے کہ گنجائش ہی نہیں باقی رہتی ہے،

فرماتے تھے کہ ایمان باللہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، اس میں ایمان بالملائکہ، ایمان بالرسل سب داخل ہیں، مقام اجمال میں صرف ایمان باللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور مراد پورا سلسلہء ایمانیات ہوتا ہے اور مقام تفصیل میں ایمانیات کے ہر جزو کو ظاہر فرمادیا جاتا ہے، اس تحقیق میں سورۂ تغابن رکوع [۸] اور سورۂ نساء [۲۱] سے استدلال فرماتے تھے، اسی کی تائید میں حدیث وفد عبدالقیس کو بھی پیش فرماتے تھے کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ کیا تم جانتے ہو کہ ایمان باللہ کا مطلب کیا ہے؟ عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے، حضورﷺ نے فرمایا کہ ایمان باللہ نام ہے **لاإلہ إلااللہ** اور **محمد رسول اللہ** کی شہادت دینے کا، میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب ابن العربی اندلسی کو بھی احکام القرآن سورۂ حم سجدہ میں آیت **إن الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا** [فصلت:۳۰] کے ذیل میں سید صاحب کا ہم خیال پایا۔

صوفیہ کی نسبت قرآن کی کس آیت سے مستنبط ہے؟

(سید صاحب کو) قرآن مجید کی آیات کے باہمی ربط کا خاص خیال تھا، اور جب طبع سلیم کا علمی رجحان تصوف کی طرف ہوا تو علمی طرز کے صوفیانہ لطائف ونکات کی طرف بھی ذہن برابر منتقل ہوتا رہتا تھا، ایک دن ارشاد فرمایا کہ: بتلایئے! حضرات صوفیہ کی نسبت مصطلحہ کا قرآن کی کس آیت سے استنباط ہوسکتا ہے؟ پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ میرے خیال میں آیت: **رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ** سے اس کو نسبت حاصل ہے۔(۱)

(۱) (تعمیر حیات: ۱۹۶۴ء)

مشاہیر علمائے ہند کے علمی مراسلے

(مرتبہ مفتی ظفیر الدین مفتاحی)

مفتی ظفیر الدین مفتاحی ایک جلیل القدر عالم، مفتی دارالعلوم دیوبند اور اردو کے ممتاز اہل قلم، بیسوں کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کی تاریخ ولادت ۷/مارچ ۱۹۲۶ء اور تاریخ وفات ۳۱/مارچ ۲۰۱۱ء وطن ''پورہ نوڈیہہ'' ضلع دربھنگہ (بہار) ہے، ۱۹۴۴ء میں مفتاح العلوم مئو سے فارغ ہوئے، جب آپ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے در پر جا پڑے کہ خدمتِ دین کے میدان بتائے جائیں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مفتی صاحب کی نوعمری کو دیکھتے ہوئے دارالمصنفین اعظم گڈھ سید صاحب کے یہاں بھیجا تاکہ ان کی صحبت میں رہ کر علم وتحقیق کا ذوق پیدا ہوجائے، یہ ہے مفتی صاحب کے سید صاحب سے تعلقات کی ابتدا، پھر انہوں نے سید صاحب کی رہنمائی میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، اور ہر موقع پر مشورہ طلب کیا، سید صاحب نے مطابق حال مشورے اور قیمتی آراء سے نوازا، ذیل کے کچھ خطوط اسی پہلو کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

طلب ہی فرض ہے:

انسان پر، طلبۂ مومن پر، طلب ہی فرض ہے، اصول بندے کے اختیار میں نہیں، یہ موہبت الٰہی ہے، مگر موعود ہے، '' **ویھدی إلیہ من ینیب**'' [شوریٰ:۱۳] شرط انابت ہے، **والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا** ،[عنکبوت:۶۹] مجاہدہ یہاں بھی شرط ہے، **ومن یؤمن باللہ یھدقلبہ**، [تغابن:۱۱] ایمان بھی یہاں شرط ہے اور عطائے ہدایت کا وعدہ ہے، دین

اور دنیا دونوں حال میں ہے، اور علم وعمل میں بھی اپنی طرف سے کوتاہی نہ ہو، اور اس پر بھی نہ ہو تو استغفار اور پھر سعی مزید وعزم شدید، اور یہی کامیابی کی کلید ہے: **یعلّمھم الکتاب والحکمۃ** کے ساتھ **یزکیھم** بھی نبی ﷺ اور جانشینان نبی ﷺ کا فریضہ ہے: "**أعوذ باللّٰہ من علم لاینفع**" کو اہل مدارس بھول گئے۔(۱)

اس مکتوب پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ سید صاحب نے کس طرح اثنائے خط، قرآنی آیات کو استعمال کیا ہے، یہاں صرف ان آیات کو استعمال نہیں کیا، بلکہ صحیح معنوں میں ایسے لعل وگہر جڑے ہیں جن سے کلام کا حسن دوبالا ہوگیا ہے، اور مکتوب نگار کی شخصیت کا عکس پوری طرح اس میں ہویدا ہے، مزید علمی استفادہ کے لئے چند اور خطوط کے اقتباسات پر نظر کریں:

وسوسوں کا علاج:

آپ کو جو کھٹک آخرت کے متعلق ہوتی ہے، یہی وہ سچ ہے جو انشاء اللہ صحیح آبیاری سے نشوونما پائے گا، آپ بعض اوقات مقررہ "**ألم یعلم بأن اللّٰہ یری**" [علق:۱۴] کا مراقبہ کیا کریں۔(۲)

اللہ تعالیٰ کی صفت لطیف کے معنی:

آپ دیکھیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلسلہ بہ سلسلہ نگرام پہونچادیا، اللہ کی صفت لطیف کے یہی معنی ہیں "**ویرزقہ من حیث لایحتسب**" [طلاق:۳] دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم نافع اور عمل صالح کی بیش از بیش توفیق عنایت فرمائیں۔(۳)

تقدیر کا مطلب:

قدر سے مقصود غالبا تقدیر ہے، تقدیر کے معنی خلق سے پہلے عالم مخلوق کے ذرہ

(۱) (مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص:۲۰)
(۲) ایضاً ص:۲۱
(۳) ایضاً ص:۲۳

ذرہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ شدہ اندازہ اور علم ہے، جیسے انجینئر مکان بننے سے پہلے مکان کا پورا نقشہ پہلے اپنے ذہن میں اور پھر کاغذ پر کھینچ لیتے ہیں، اور اسی کے مطابق مکان بناتے ہیں۔ **ذلک تقدیر العزیز العلیم**۔[یٰس:۳۵](۱)

سب سے پہلے پانی مخلوق ہوا:

نیست کے بعد عالم مادی میں سب سے پہلے پانی مخلوق ہوا، اور اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، حکومت مادی میں صرف پانی ہی پانی تھا، "**وکان عرشہ علی الماء**" [ہود:۷] اس کے بعد تنوعات مادی کا آغاز ہوا۔(۲)

ابتلاء وامتحان کے دور سے گذرنا ضروری ہے:

ابتلاء وامتحان کے دور سے گذرنا ضروری ہے "أم حسبتم أن تدخلوا الجنة و لما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم" [بقرۃ:۲۱۴] ابتلاء وامتحان کی آگ سے تپ کر ہی سونا خالص معلوم ہوتا ہے، سو اس پر خدا کا شکر ادا کیجئے، اور استغفار اور طلب توفیق میں مصروف رہیے۔(۳)

صبر وشکر:

ایسے واقعات دنیا میں نئے نہیں، آپ کی والدہ کی وفات کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائیں، اور آپ کو سکینت بخشیں، آپ صبر وشکر سے دنیا کی تکلیفوں کو برداشت کریں، کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا، وہ دھوکہ خود اپنے ہی کو دیتا ہے، **ولا یحیق المکر السئی إلا بأھلہ** [فاطر:۴۳](۴)

(۱) ایضاً ص:۲۵
(۲) ایضاً ص:۲۵
(۳) ایضاً ص:۳۱
(۴) ایضاً ص:۳۷

دعا واستغفار کے سوا چارہ نہیں:

آج تلاوت میں یہ بات آئی "أویذیق بعضکم بأس بعض"[انعام:۶۵] فوراخیال آیا کہ یہی عذاب تو مسلمانوں پر آج نہیں، دعا اور استغفار کے سوا چارہ نہیں، ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمین ،[یونس:۸۵] ملک کی بدامنی اور راہ کی مسدودی و خطرناکی سے حج کی امید منقطع ہوتی جارہی ہے واللہ اعلم۔(۱)

قرآن ہدایت کی کتاب:

قرآن پاک ہیئت کی کتاب نہیں، ہدایت کی کتاب ہے، علمائے ہیئت نے اپنے اپنے مذاق سے حرکت زمین بھی استنباط کیا ہے، اور سکون بھی "وتری الجبال تحسبها جامدة ، وهی تمرمر السحاب صنع اللّٰه الذی أتقن کل شئی"[نمل:۸۸] سے دونوں کا استدلال ہے۔(۲)

تبلیغ ودعوت کے اصول:

ادع إلی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة[نحل:۱۲۵] کے اصول ہی سے تبلیغ ودعوت چاہیے، ورنہ اثر الٹا ہوگا، البتہ صاحب قدرت کیلئے زجر وتوعید کرنا اپنے ماتحت کے ساتھ مناسب ہے، والدین اولاد کیساتھ کریں یا امیر اپنی رعایا کے ساتھ یا افسر اپنے ماتحتوں کے ساتھ یا آقا اپنے غلاموں اور ملازموں کے ساتھ، جیسا کہ حدیث میں ہے کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته یا حدیث" مروا صبیانکم اذابلغو اسبعا واضربو هم اذابلغوا عشرا.(۳)

ذکر کے مقاصد:

ذکر کی غرضیں دو ہیں، ایک طرف ثواب کی نیت ہے، اور دوسری ثواب کے

(۱) مشاہیر علمائے ہند کے علمی مراسلے ص:۳۵۔
(۲) ایضاً ص:۴۱۔ (۳) ایضاص:۴۳۔

ساتھ رسوخ ذکر الٰہی کے لئے، پہلی غرض کے لئے آپ کا دستور کافی ہے، لیکن دوسری غرض کے لئے دوسرے طریقے ہیں، کیا آپ نے ہمارے حضرت والا کا رسالہ "قصد السبیل" ملاحظہ کیا ہے، ضرور دیکھیں پھر تبلیغ دیں بعد ازاں تعلیم الدین عمل اور انتفاع کی خاطر پڑھیں اور جامع ترمذی کی کتاب الزہد والرقاق پڑھتے رہیں، تہجد کا معمول صالحین کی نشانی ہے، إن ناشئة اللیل هی أشد وطأً وأقوم قیلا[مزمل:۶](۱)

مولیٰ کی رضا میں ساعی رہنا:

یار زندہ صحبت باقی، انشاء اللہ تعالیٰ کبھی ملاقات طرفین حاصل ہوگا، الحمد للہ کہ لوگ خوش ہیں، آپ مولی کی رضا میں ساعی رہیں، بندگان الٰہی آپ کی رضا میں ساعی رہیں گے ع

تو از حکم داور نہ گردن مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

درس قرآن دیں، سیدھے سادے طریقہ سے بیان کردیں، اللہ تعالیٰ انشاء اللہ فائدہ دیں گے، ترجمہ اور تسہیل مطالب پر اکتفا کریں، حلال وحرام اور احکام بیان کریں اور قناعت اور استغناء عن الخلق پیش کریں، وهو الرزاق ذو القوة المتین.[ذاریات:۵۸](۲)

ربنا لا تجعلنا فتنةً للقوم الظالمین:

بہار کے حالات اخباروں اور خطوط سے معلوم ہوتے رہے، بس دعا ہے: ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمین[یونس:۸۵] و نجنا من القوم الظالمین،[مؤمنون:۲۸] فانصرنا علی القوم الکافرین.[آل عمران:۱۴۷](۳)

(۱) (ایضاً ص:۲۳۔۲۴)
(۲) (ص/۳۹)
(۳)(ایضاً ص:۲۸)

دوسروں کے گلہ میں وقت ضائع نہ کرنا:

آپ نے جن دو باتوں کے سبب سے اپنے انتشار اور اذیت قلبی کا ذکر کیا ہے۔ان کے معالجہ اور اصلاح کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے، اگر نہیں تو پھر اس کی فکر میں اپنے امور اختیاری میں بے علمی کو راہ کیوں دی جائے، **لست علهيم بمصيطر** ،[غاشیہ:۲۲] آپ اپنا کام کیجئے ،دوسروں کے گلہ میں وقت کو ضائع کیوں کیجئے ،آپ دین کی خدمت میں مصروف رہیں، دوسروں کے عدم خدمت اور عدم توجہ کی فکر میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔(۱)

سوء تعبیر اور غلو کے اثرات:

جس پرچے کے جس مضمون کا حوالہ آپ نے دیا ہے اس کی نسبت کیا ہوں، بعض باتیں صحیح ہوتی ہیں، مگر سوء تعبیر اور غلو اس کو مقام انکار تک پہونچا دیتا ہے(**لكل مقام كلام**) آپ دوسروں کو نہ دیکھیں، صرف اپنی طرف دیکھیں، **يأيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم لايضركم من ضل اذا اهتديتم** [مائدہ:۱۰۵](۲)

مسجدوں کو ہنگاموں سے پاک رکھنا بہتر ہے:

مولانا مدنی اکثر لکھنؤ آتے رہتے ہیں ، ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کے یہاں ٹھہرتے ہیں، ان سے پتہ وقت کا لگتا رہے گا، آپ کی فلاح دین و دنیا کے لئے دلی دعا ہے، مسجدوں کو ان ہنگاموں سے پاک رکھنا بہتر ہے، **وأن المساجد لله**. [جن:۱۸](۳)

---

(۱) ایضاص:۳۷
(۲) ایضاً ص:۴۲
(۳) ایضاص:۳۰

خطوط سلیمانی

(مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری پاکستان کے معروف مصنف ہیں، شاہ جہان پور میں ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے ، والد ماجد کا نام محمد حسین خاں تھا، آپ کے والد قیام پاکستان کے تقریبا تین سال بعد مئی ۱۹۵۰ء میں مع اہل خانہ پاکستان منتقل ہوگئے، ۱۹۶۲ء میں میٹرک اور ۱۹۶۸ء میں بی، اے اور ۱۹۷۰ء میں سندھ یونیورسٹی میں ایم، اے (اردو) پاس کیا، اس کے دس سال بعد ۱۹۸۰ء میں سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ، بقول جناب اسحاق بھٹی ''اب تک ادب، تاریخ، مذہب، سیاست، سوانح، صحافت وغیرہ موضوعات سے متعلق پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں'' برصغیر ہندو پاک کی قومی وانقلابی شخصیات اور سیاسی تحریکات سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے، اور اس موضوع پر کام بھی کیا ہے، لیکن حجم اور ضخامت کے اعتبار سے ان کا زیادہ تر کام مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ہے، اسی وجہ سے ماہر آزادیات کے نام سے آپ کی شہرت ہے، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ سید سلیمان ندوی کے مابین اچھے تعلقات تھے، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اس تعلق کو دیکھتے ہوئے علامہ موصوف کے مکاتیب بنام مختلف شخصیات وعمائدین کو'' خطوط سلیمانی '' کے نام سے مرتب کیا، سطور ذیل میں اسی کے قرآنی شہ پارے نقل کئے جارہے ہیں۔

عزیمت وتوبہ پر قائم رہنا :

اپنی اس عزیمت وتوبہ پر قائم رہئے کہ آج سے میری نئی زندگی شروع ہوتی ہے،

التائب من الذنب کمن لا ذنب له، اوراس کے بعد الحمد اور قل ھو اللہ احد تین بار اول وآخر درود پاک کے ساتھ بزرگان چشتیہ صابریہ پر علی العموم اور خصوصیت کے ساتھ نام لے کر حضرت حاجی مولانا امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کو اس کا ثواب بخشیں، اور زبان سے عہد کریں کہ آج سے میں اپنے شیخ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر صداقت سے بغیر تغافل کے عمل کروں گا، پھر یہ آیت کریمہ پڑھیں: إن الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق أیدیھم، فمن نکث فإنما ینکث علی نفسه، ومن أوفی بما عاھد علیه اللہ فسیؤتیه اجرا عظیما. [فتح:۱۰](۱)

محبت کے کرشمے:

یہ سب محبت کے کرشمے ہیں، قرآن پاک کی آیت إن الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودا. [مریم:۹۶] کے معنی پر غور فرمائیں۔(۲)

انابت الی اللہ:

دست بدعا رہئے اور انابت الی اللہ سے قوت حاصل کیجئے اور مشکلات پر صبر۔ واستعینوا بالصبر والصلاۃ[بقرۃ:۱۵۴](۳)

یہ فرار من الزحف ہے:

لفظ ''ہجرت'' کا استعمال غلط ہے (مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ دل نہیں چاہتا کہ حیدرآباد (دکن) میں بقیہ زندگی گزارے اور ہجرت کے لئے حالات بھی مساعد نہیں، حضرت سید صاحب نے یہ جواب فرمایا) یہ ہجرت نہیں، یہ فرار من الزحف ہے، جو جہاں ہے وہیں رہے اور غزوۂ احد کے تیر اندازوں کی طرح اپنی جگہ نہ چھوڑے۔ وکان

(۱) خطوط سلیمانی مکتوب بنام محمد علی حیدرآبادی ص:۲۰۳۔
(۲) ایضاص:۲۱۰۔
(۳) ایضاً ص:۲۱۰۔

الإنسان عجولا. [اسراء:۱۱] حالانکہ إن یوما عند ربک کألف سنة مما تعدون. [حج:۴۷] دعاء واستغفار میں مصروف رہئے۔(۱)

اللہ تعالیٰ صناع مطلق ہیں:

اللہ تعالیٰ صناع مطلق ہیں، ہم افراد اور جماعت اس کے اوزار ہیں، صناع اپنے کام میں کسی متعین اوزار کا محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ دین کی بقا اور اسلام کی حیات کا وعدہ فرما چکے ہیں: إنا له لحافظون[یوسف:۱۲]۔(۲)

فہم دین کی دولت:

بڑی ہی خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ (مولانا محمد علی حیدرآبادی) کو فہم دین عنایت فرما کر صراط مستقیم کی ہدایت فرمائی، ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم. [مائدۃ:۵۴](۳)

ذکر کا مفہوم:

اللہ کا نام رٹا جائے اور اس کے کمالات وقدرت وعظمت ورحمت واحسان پر غور کیا جائے، یہی ذکر وفکر ہے، جو صوفیاء کے یہاں مروج ہے، اور قرآن پاک میں ان دونوں کی طرف اشارات ہیں: یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم اور ویتفکرون فی خلق السماوات والأرض ربنا ما خلقت ھذا باطلا [آل عمران:۱۹۱] وغیرہ، تعلیمات تصوف حقیقی وحسبنا اللہ وسنة رسوله الگ نہیں، آپ نے اس حیثیت سے ابھی ان مسائل پر شاید غور نہیں فرمایا، اعبد ربک کأنک تراہ مطلوب ہے، یہ مطلوب کیونکر حاصل ہو، في صلاتھم خاشعون مقصود ہے، اس کا حصول

(۱) ایضاً ص:۲۱۱۔
(۲) ایضاً ص:۲۱۳۔
(۳) ایضاً ص:۱۹۸۔

کیسے ہو؟ والذین آمنوا أشد حبا للہ [بقرۃ:۱۶۵] یہ محبت مراد ہے۔(۱)

خود مسلمان بننا اور دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا:

مکی زندگی سے پہلے مدنی زندگی بمشکل کامیاب ہوسکتی ہے، اور پچھلے فرسودہ نظام زندگی کی بنیاد پر تجدید کی دیواریں کھڑی نہیں ہوسکتیں، خود مسلمان بننا، دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی ایک اہم پکار ہے، اور اس فرض کو نفرت کے بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے، جس کے سامنے آپ دعوت پیش کرتے ہیں۔ اس پر شفقت اور اس سے محبت دعوت کا محرک ہو، تب ہی وہ کامیاب ہوسکتی ہے، جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں اور قرآن پاک میں بھی اس کی شہادت ہے، **لا تحزن** [توبۃ:۴۰] اور **لا یحزنک قولھم** [یونس:۶۵] اور **ولا تک فی ضیق مما یمکرون** [نحل:۱۲۷] اور **عزیز علیہ ما عنتم** [توبۃ:۱۲۸] وغیرہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ منشائے دعوت شفقت بر کفار تھی کہ داعی اور مدعو نہیں ملیں گے اور ایک کو دوسرے سے دلی لگاؤ پیدا نہ ہوگا، تو ایک دل سے دوسرے دل کی طرف تاثیر منتقل نہیں ہوسکتی۔(۲)

نفس کو آلائش سے بچائیں:

نفس کو آلائش سے بچائیں، سوائے رضائے حق کے کوئی دوسرا مقصد نہ ہو، اس کو نصب العین بنا کر ہمیشہ پیش نظر رکھیں **إنما یتقبل اللہ من المتقین** [مائدۃ:۲۷](۳)

شکر ترقی کا زینہ:

یہ حال بہت اچھا ہے، اس پر شکر کیجئے کہ اور ترقی ہو، **لئن شکرتم لأزیدنکم** [ابراہیم:۷](۴)

(۱) ایضاً ص:۱۹۸۔
(۲) ایضاً ص:۱۹۰۔
(۳) ایضاص:۲۱۷۔
(۴) مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ فرائض اور واجبات اور سنن موکدہ پر عمل ''کم'' گراں گزرتا ہے۔

روزہ کی حدت میں ثواب بھی ہے:

روزہ کی حدت بعضوں کو زیادہ محسوس ہوتی ہے لیکن ثواب بھی ہے، و نھی النفس عن الھوی [نازعات:۴۰] اور رضی علی المکابرۃ کے اصول اسی مرتبہ کے ساتھ ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔(۱)

تحقیقی ذوق:

رسالۂ تسہیل کو پڑھ کر سب سے پہلا اثر جو دل پر ہوا، یہ تھا کہ یہ راہ سخت مشکل ہے، دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ ان جزئیات فقہیہ کا جن کا اس میں ذکر ہے میرے لئے تحقیق طلب تھے، میں نے بات صفائی سے لکھ دی'' و اللہ لا یستحی من الحق '' [أحزاب:۵۳](۲)

فوت شدہ فرائض کی قضا:

جو فرائض فوت ہوئے ہیں ان کی قضا کی جائے، جو حقوق عباد تلف ہوئے ہوں یا آپ کے ذمہ باقی ہوں ان کو ممکن ہو تو ادا کیجئے یا صاحب حق سے معاف کرائیے، اگر مر گیا ہو تو اس کے ورثہ سے معاف کرائیں اور اس کے لئے دعائے خیر کریں، غرض تلافی مافات کا تہیا اور سابقہ ذنوب سے استغفار ضروری ہے، توبہ اس راہ کا پہلا قدم ہے پھر اصلاح إلا الذین تابو و أصلحو ا. [بقرہ:۱۶۰](۳)

تبلیغ کی قسمیں:

تبلیغ مختلف نوعیّتوں کی ہوسکتی ہے، ان میں سے جس نوعیت کی آپ استطاعت رکھتے ہوں اس کی تبلیغ کریں اللہ تعالیٰ ثواب دے گا۔ مگر تجربہ یہ ہے کہ جب تک نفسانیت اور خود غرضی اور حب جاہ فنا نہیں ہوتی تبلیغ مؤثر نہیں ہوتی۔(۴)

(۱) ایضاص:۱۷۰۔
(۲) ایضاص:۱۱۴۔۱۱۵۔
(۳) ایضاص:۲۰۰۔
(۴) ایضاص:۲۰۶۔

جنت کا دروازہ جہادِ نفس سے کھلتا ہے:

فذکر ان نفعت الذکری[أعلی:۹] (۲)وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین[ذاریات:۵۵] (۳) لعلك باخع نفسك ألا یکونوا مؤمنین [شعراء:۳](٤)لا تحزن علیهم [حجر:۸۸](۱)

بے شبہ جہادِ نفس بہت بڑا کام، مگر جنت کا دروازہ اسی جہادِ نفس سے کھلتا ہے "وأما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوی فإن الجنة هي المأوی [نازعات:۴۱] وکماجاء فی الحدیث یکون هواه تبعا لما جئت به.(۲)

حصولِ طمأنیت کا نسخہ:

جو امور انسان کے اختیار میں نہیں ان میں حصولِ طمأنیت کا نسخہ یہ ہے کہ جو کچھ پیش آئے، اس پر اپنی رضا ظاہر کی جائے، رضا بالقضا طمانیت کی کیمیا ہے، پھر یہ یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں اس میں حکمت و مصلحت ہے، اس کی حقیقت ہم کو فوراً معلوم نہ ہو، دیکھئے ممالک عرب کے ٹرکی سے علیحدہ ہو جانے پر مسلمانوں کو کتنا غم تھا، مگر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے تیس برسوں میں کیا دکھلایا:۔ لاتیأسوا من روح اللّٰه [یوسف:۸۳](۳)

اطاعت کی اہمیت:

جس وقت داخلہ سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ ہونے کا عزم راسخ ہو یہ سمجھ کر داخل ہوں کہ اب اسی منہاج پر زندگی کے اخیر لمحہ تک گزارنا ہے توفنی مسلما و ألحقنی بالصالحین ،[یوسف:۱۰۱] فلا تموتن إلاو أنتم مسلمون [آل عمران:۱۳۲]، واعبد ربك حتی یأتیك الیقین[حجر:۹۹] کی آیتیں پیش نظر رہیں۔(۴)

(۱)ایضاص:۲۰۶
(۲)ایضاص:۱۰۸
(۳)ایضاص:۲۱۰
(۴)ایضاص:۱۹۹

کثرتِ ذکر کی عادت بڑھ جائے:

ذکر ایک نشست میں مؤثر زیادہ ہوتا ہے، اگر کئی نشستوں میں ہو تو بھی خیر، اور اگر سرے سے اس میں جی نہ لگتا ہو تو فکر اور تسبیح سے کام لیں، مقصود یہ ہے کہ کثرتِ ذکر کی عادت پڑ جائے "والذاکرین اللّٰه کثیرا [احزاب:۳۵] اور اذکروا اللّٰه ذکرا کثیرا،[احزاب:۴۱] رجال لا تلهیم تجارة ولا بیع عن ذکر اللّٰه [نور:۳۷] کے تحت ذکر لسانی قلبی ہو جائے۔

فکر و مراقبہ کی صورت یہ ہے کہ باوضو کسی وقت میں آنکھ بند کر کے ہاتھ باندھ کر کسی اطمینان کے مقام میں بیٹھ کر کسی معنی پر اتنا غور کریں کہ وہ آپ میں رہ جائے اور آپ اس میں رنگ جائیں اور اس کا یقین قلب میں پیوست ہو جائے، قرآن پاک میں "اللّٰه نور السموات والأرض" [نور:۳۵] حدیث ہے هو نور اور رضا بالقضا سے چارہ نہیں، لیکن گو چارہ نہ ہو، تاہم ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ گو ہماری مرضی کے خلاف ہو، لیکن ہمارے لئے مصلحت بھی اسی میں ہے جو قضائے الٰہی ہے: عسی أن تکرهوا شیأ وهو خیر لکم ، عسی أن تحبوا شیئا وهو شرلکم واللّٰه یعلم وأنتم لاتعلمون.[بقرة:۲۱۶]

آپ صاحبوں کو وہ گفتگو یاد ہوگی جو بمبئی میں کئی گئی تھی "أم حسبتم أن تدخلوا الجنة ولما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم "[بقرة:۲۱۶](۱)

صبر نام ہے ناگوار باتوں کے پیش آنے پر بھی حق پر قائم رہنے کا:

صبر کی بڑی اہمیت ہے، صبر نام ہے ناگوار باتوں کے پیش آنے پر بھی حق پر قائم رہنے کا، واستعینوا بالصبر و الصلاة، وإنها لکبیرة إلا علی الخاشعین، الذین

(۱)ایضاص:۲۰۲۔

یظنو ن أنهم ملاقوا ربهم [بقرۃ:۴۵] پھر فرمایا"إذ ا أصابتهم مصيبة قالوا إنا لله وإنا إليه راجعون " [بقرۃ:۱۵۶] ہم اللہ کے مملوک، اور مالک کو اپنے مملوک میں ہر طرح کے تصرفات کا حق حاصل ہے، مملوک کو خیر ہو یا شر شکایت کا حق نہیں (۱)۔

حالات بدل رہے ہیں:

حالات بدل رہے ہیں، اب لوگوں کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے۔ ع

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کل یوم ھو فی شأن، دیکھئے کہ اگر کسی کی زندگی سے جو کام نہیں نکل رہا تھا وہ کام اس کی موت سے نکالا گیا، **سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شئی** [یٰس:۸۳]، **ولا یشرک فی حکمہ أحدا** [کہف:۲۶] (ایضاص:۲۱۲)

اللہ کا نور:

انت نور السموات والأرض ومن فيهن " آپ اس کا مراقبہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کا نور آپ میں اور تمام آسمان وزمین میں پھیلا ہے، قلب کی طرف دھیان کریں کہ اس میں اللہ کا نور یا لفظ اللہ بخط نورانی لکھا ہے۔ (۲)

(۱) (ایضاص:۲۱۵)

(۲) (ایضاص:۲۰۲)

برید فرنگ

(مؤلفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی اور ایک وفد کے ساتھ لندن کا سفر کیا، یہ سفر یکم فروری ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر اواخر ستمبر ۱۹۲۰ء کو آٹھ ماہ میں تمام ہوا، اس عرصہ میں آپ کا زیادہ تر قیام لندن میں رہا۔ پیرس بھی کئی بار تشریف لے گئے، پھر سوئزرلینڈ میں چند دن اور اٹلی میں آتے اور جاتے کئی روز قیام فرمایا، سید صاحب لکھتے ہیں: میرے ذمہ یہ کام تھا کہ مذہبی اور تاریخی حیثیت سے انگریزی اخباروں میں ہمارے خلاف جو مضمون نکلیں ان کا جواب لکھنا اور اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ان کو اس تحریک سے آگاہ کرنا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا، ان کے علاوہ دو اور کام بھی میں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے: ایک یہ کہ روزانہ انگریزی اخباروں کو پڑھ کر قابل لحاظ مضامین اور خبروں پر سرخ نشان لگانا، دوسرا یہ کہ ہر ہفتہ، ہفتہ بھر کی رفتار کار اور کاموں کی روداد لکھ کر ہندوستان بھیجنا جو خصوصیت کے ساتھ شوکت علی صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کو وفد کے کاموں سے باخبر رکھنا۔ (۱)

مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری صاحب کے علاوہ جن کو خطوط لکھے گئے ان میں مولانا مسعود علی ندوی مہتمم دارالمصنفین اعظم گڑھ، مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر صدق لکھنؤ، مولوی عبدالحکیم صاحب دیسنوی (سید صاحب کے عم محترم) مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی (سید صاحب کے حقیقی بھتیجے ہیں)۔

(۱) مقدمہ برید فرنگ ص/۱۷

علامہ موصوف نے کتاب کا نام ''بریدفرنگ'' (یورپ کی ڈاک) رکھا ہے، خود تحریر فرماتے ہیں: ''برید عربی میں ڈاک کو کہتے ہیں، اور فرنگ فارسی میں یورپ کو، چونکہ یہ خط یورپ سے لکھے گئے ہیں اس لئے بریدفرنگ اس کا موزوں نام نظر آیا۔(۱)

مندرجہ ذیل سطور میں اسی کتاب کی قرآنی تحریریں نذر قارئین ہیں:

للّٰہ الأمر من قبل و من بعد:

سیاست ایک دھوپ چھاؤں ہے، وہ دم بدم بوقلموں کی طرح رنگ بدلتی ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ کل جو صحیح نظر آرہا تھا وہ آج کہاں تک صحیح باقی رہا، اور جو صحیح نظر آرہا ہے وہ کہاں تک صحیح باقی رہے گا۔ **وللّٰہ الأمر من قبل و من بعد**[روم:۴] (۲)

مسلمانوں کی ہمت وعزیمت:

مسلمانوں کے قلوب میں مزید ہمت وعزیمت اور اعتماد اور توکل پیدا ہونا چاہئے، اور یقین رکھنا چاہیے کہ آج ہم کو جہاں شر نظر آرہا ہے، کیا عجب وہاں کل خیر ہی نظر آئے، وما ذلك على اللّٰہ بعزيز.[ابراہیم:۲۰] ع

چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

ہمت کی بلندی اور عزیمت کی استواری قوموں کی زندگی کے اصل عناصر ہیں۔

ہمت بلند دار کہ پیش خدا وخلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو(۳)

سفر سمندر کی خوفناکی:

اکثر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا سفر کسی خوفناک سمندر کے اندر ہے، جس کی

(۱) مقدمۂ بریدفرنگ:۱۹
(۲) مقدمہ بریدفرنگ ۱۹
(۳) بریدفرنگ ص:۲۰

ایک موج تلاطم ہماری زندگی ختم کرسکتی ہے، سبحان الذی سخّر لنا هذا، وما كنا له مقرنين [زخرف:۱۳](۱)

لعنة اللّٰہ على الكاذبين:

اٹلی نے علانیہ ترکوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اعلان کردیا، مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا جو سب سے بڑی اسلامی حکومت کا اپنے کو مالک بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''ہم تو ترک کے ساتھ مہربانی کرنے کو تیار ہیں، لیکن کیا کریں، اتحادی ہمارا ساتھ نہیں دیتے، **لعنة اللّٰہ على الكاذبين**[آل عمران:۶۱] (۲)

اللہ کا بے لاگ قانون:

لائڈ جارج وکرزن وبرائس وغیرھم کو ادھر اشارہ ہے کہ تم جوتے لگاؤ، ادھر یہ دوست بن کر سر سہلاتے ہیں کہ جانے دیجئے، انتقام کا خیال دل میں نہ لائیے، ان کو مارنے دیجئے، آپ اپنا ہاتھ نہ اٹھائیے، اتحاد دینی کیجئے، اتحاد انسانی کیجئے، ان کے کینوں کو خاطر میں نہ لائیے، آپ محبت کا برتاؤ کیجئے، لیکن ہم تو مسلمان ہیں ''**جزاء سيئة سيئة مثلها**'' [شوریٰ:۴۰] کا قانون جانتے ہیں، ان کو کیوں نہ منتر پڑھ کر پھونکئے، جن کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی پھیر دو، انجمن اتحاد دینی قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، انجمن قتل دروغ گویاں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔(۳)

اللہ کی عجیب قدرت:

یہاں چشمہ ہائے شور کے گرد مردم ومور ومرغ کا مجمع ہے، البتہ ان شور چشموں کی تقریب سے ''زندہ اور رواں شیریں چشمے'' ہر جگہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، '' **فتبارک**

(۱) بریدفرنگ ص۲۴
(۲) ایضا:۱۴۸
(۳) ایضا۱۳۴

اللّٰہ أحسن الخالقین" [مومنون:۱۴] مسافروں کے اس عارضی شہر میں دماغی، علمی تفریح گاہ سے لے کر جسمانی عیش وعشرت گاہ تک پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور یہی فرانسیسی تمدن کے خصائص ہیں۔(۱)

ثابت قدمی کی ضرورت:

دنیا منتظر ہے کہ مسلمان کس ثبات اور استحکام کے ساتھ اپنے الفاظ ودعاوی پر قائم رہتے ہیں، ٹرکی کا یہ معاہدہ وحی آسمانی نہیں جو بدل نہ سکے، صرف استقلال اور صبر علی الحق درکار ہے "ربنا افرغ علینا صبراً و ثبت أقدامنا "[بقرۃ:۲۵۰](۲)

وفد خلافت کی کوشش:

مسئلہ خلافت کا آخری پہلو خواہ کچھ ہو وفد خلافت نے اپنی کوششوں کو اس انسانی حد استطاعت تک پہونچا دیا، جس سے زیادہ ناممکن ہے اور ضمنی طور سے اس سے ممالک اسلامیہ کے روح ومعنی کو وہ فوائد پہونچے جن کا تخیل بھی ہمارے ہم وطن اور ہم مذہب نہیں کر سکتے، فغشیھم من الیمّ ماغشی[طٰہٰ:۷۸] (۳)

ہر دین اور ملت کے لئے ایک الگ تمدن:

آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ ہم انگلستان اور فرانس یا اور دوسری حکومتوں کے ان مساعی جمیلہ سے جو وہ یورپ میں تمدن اور علوم وفنون کے پھیلانے میں صرف کر رہے ہیں ناواقف نہیں ہیں، لیکن مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، اور ہر دین اور ملت کیلئے ایک الگ تمدن اور مخصوص آداب معاشرت ہیں، ان میں سے کوئی بھی یہ پسند نہ کرے گا کہ اپنے دین کو دوسرے دین سے، اپنے تمدن کو دوسرے تمدن سے، اپنے آداب معاشرت کو دوسرے

(۱) ایضا ۱۸۹
(۲) برید فرنگ ۱۷۶
(۳) ایضا: ۱۸۹

آداب معاشرت سے اور اپنی زبان کو دوسری زبان سے اور اپنے علوم کو دوسرے علوم سے بدل دے، وَکُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَیْھِمْ فَرِحُوْن[مومنون:۵۳] (ہر جماعت جو کچھ اس کے پاس ہے اسی میں خوش ہے۔)"(۱)

ہر چیز کا جوڑا:

آج کے خط میں، میں آپ کو اپنے گھر کا اور سامنے کے منظر کا نقشہ کھینچتا ہوں۔ ایڈورڈ ہفتم کے باپ پرنس البرٹ کا تو نام آپ نے سنا ہوگا، جس مکان میں ہم لوگ مقیم ہیں اس کا نام البرٹ ہال مینشن ہے، البرٹ ہال انگلینڈ کا سب سے بڑا اور مشہور ترین ہال ہے جس میں دس ہزار آدمیوں کی نشست ہے، یہ ہال ہمارے مکان کے پیچھے ہے، ہال کے ایک طرف میں البرٹ ہال مینشن ہے، یعنی بعض عظیم الشان عمارتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کے اندر چھ سات منزلیں ہیں، میری سکونت چوتھی منزل پر ہے جو ۱۱۲ زینے کی مسافت قطع کرتی ہے، اگر لفٹ (کل کا زینہ) نہ ہو تو اترنا چڑھنا مشکل ہو جائے، البرٹ ہال کے فلیٹ (درجۂ عمارات) کا نمبر ۷۵ سے زیادہ ہے، ہمارے فلیٹ کا نمبر ۸ ہے، مکان کے سامنے باغ ہے، اس باغ میں البرٹ میموریل ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عظیم الشان چبوترہ پر اسٹیچو قائم ہے، چبوترہ کے چاروں طرف گوشوں پر دنیا کے چار براعظم ایشیا، افریقہ، امریکہ اور یورپ کے باشندوں کے مع ان کی اقلیمی خصوصیتوں کے مجسمے ہیں، ہندوستان ہاتھی پر سوار ہے، افریقہ اونٹ پر، امریکہ بھینس پر اور یورپ گائے پر، اس باغ کو طے کیجئے تو دوسرا باغ شروع ہوگا، جس کا نام نامی واسم گرامی ہائڈ پارک ہے اور جو چار دانگ عالم میں اپنی خصوصیات کے لئے مشہور ہے، یہاں اکثر اوقات لوگوں کو بے حجاب جلوے نظر آتے ہیں، جابجا میدانوں میں، درختوں کی جڑوں میں، کنج باغ میں، جھاڑیوں میں دو دو کرسیاں بچھی ہوئی ملیں گی، قرآن کی آیت پاک ومن کل شئ خلقنا زوجین[زاریات:۴۹] کی تفسیر کا عملی مشاہدہ آپ کو یہیں ہوگا، اس کے بیچ میں ایک نہر جاری ہے، جس میں سینکڑوں کشتیاں

(۱) ایضا: ۲۲۴

پڑی ہیں، ہر کشتی کسی مرد یا صنف نازک کی انگلیوں سے حرکت کرتی ہوئی کسی نہ کسی جھاڑی کے سایہ میں پہنچ کر گھنٹوں آرام کرتی ہے اور انواع واقسام کے لذائذ روحانی کا منظر دکھاتی ہے ہر کس وناکس چلتے پھرتے یہ منظر دیکھ سکتا ہے، مگر آپ یہ نہ سمجھئے کہ بداخلاقی کے ان مرتکبوں کی گرفت ملک کے اعلیٰ متمدن حکومت کے طرف سے قانونا نہیں ہوتی، نہیں جنات باغ کے صدر دروازے پر آپ کو جلی حرفوں میں یہ قانون تختیوں پر لکھا نظر آئے گا کہ پبلک منظر کو شرمناک واقعہ کے عملی مشاہدہ سے متاثر نہ کیا جائے، مگر اس قانون کی عملی تفسیر یہ ہے کہ ہر ممکن طریق وانداز وعمل سے ہر رہرو کو دعوت نظر دی جائے، ارضی جنت کے اس احاطہ میں آکر فرشتۂ غیب کی جو پہلی آواز آپ کے کانوں میں آئے گی وہ اعملوا ما شئتم ہے، انگریزوں کو فخر ہے کہ ان کے اور صرف ان کے ملک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں قانونا فاحشہ کا وجود نہیں، لیکن عملا ان کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ ان کے ملک کا کوئی راستہ، گلی، چوراہا، باغ دریا، غرض ہر وہ مقام جہاں کوئی مادی جسم رہگزر پا سکتا ہو اس ''شریف طبقہ'' کے وجود سے محروم ہے۔

میں نے روزہ کے حالت میں اس منظر کی تفصیل کی، اس سے روزہ الگ خراب ہوا اور آپ کے خیالات کو اشتعال دینے کا الگ مرتکب ہوا، خدا آپ کو محفوظ اور مجھے محفوظ رکھے، پالیٹکس کا قصہ میں نے اس خط میں نہیں چھیڑا۔ والسلام۔(۱)

(۱) مکتوب مولانا مسعود عالم ندوی، بر یدفرنگ ص: ۱۲۵-۱۲۶۔

متفرق تحریروں میں قرآنی آیات کا برمحل استعمال

نسبت کا لحاظ:

شرمندہ ہوں کہ اس التباس نام میں دو دفعہ مجھ سے غلطی ہوئی، بات یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں ان سے خط وکتابت جاری تھی کہ آپ کا عنایت نامہ آیا، اس سے ذہن مشارکت اسم کے بجائے وحدت اسم کی طرف متوجہ ہوگیا، آئندہ آپ کی نسبت قریشی کو دھیان میں رکھوں گا، آج ہی قرآن پاک کی اس آیت وجعلنا کم شعوبا وقبا ئل لتعارفوا [حجرات:۱۳] کا امتیازی مطلب نمایاں ہوا۔(۱)

بہترین تعزیت:

مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کے انتقال پر اخیر میں تحریر فرمایا:۔''جانے والے تیری روح کو سلام! جب تو زندہ تھا تو تیری قوم نے تیری قدر نہ پہچانی، اب تو عالم ابد میں ہے، میرے کان غیب سے تیری زبان مجاز سے آواز سنتے ہیں۔ یالیت قومی یعلمو ن بماغفرلی ربی وجعلنی من المکر مین [یٰس:۲۶] (اے کاش کہ میری قوم جانتی کہ خدا نے مجھے بخشا اور مجھے ان میں داخل کیا جن پر اس کا کرم ہوا ہے)(۲)۔

(۱) نقوش لاہور مکاتیب نمبر ج۱/۴۹۸، اس خط کو لکھتے وقت دو لوگوں سے خط وکتابت جاری تھی، جن میں ایک جناب عبداللہ قریشی، اور دوسرے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مولانا نے دونوں کو ایک سمجھ لیا تھا۔
(۲) یادرفتگاں ص ر ۲۴۷

حیرت واستعجاب کا جملہ:

مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے راقم سے ایک مجلسی گفتگو میں فرمایا کہ ایک صاحب نے سید صاحب کے متعلق علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی، چنانچہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے سید صاحب کو بطور تنبیہ لکھا کہ سنا ہے کہ آپ سے فلاں حرکتیں سرزد ہورہی ہیں، اس پر سید صاحب نے علامہ شبلیؒ کے نام ایک مکتوب میں لکھا کہ:۔ سبحانك هذا بهتان عظيم. [نور:۱۶]

تحریک اہل حدیث کی بنیاد تین چیزوں پر:

اس تحریک (اہلحدیث) کی بنیاد تین چیزوں پر تھی، (۱) نصب امارت (۲) زکاۃ کی مرکزیت (۳) اسلام سے تمام بیرونی اثرات کو مٹا کر اس کو پھر اپنی اصلیت پر لوٹانا، گذرنے والے تو گزر گئے تلك أمة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون [بقرہ:۱۳۴] زمانہ کی گھڑی اب ہمارے ہاتھ میں ہے، دیکھنا ہے کہ ہم اس کی سوئی کو کدھر گھماتے ہیں۔(۱)

معارف کا آغاز:

معارف کا آغاز جولائی ۱۹۱۶ء سے ہوا، اور اب جولائی ۱۹۲۸ء ہے، اس نمبر سے اس کے سفر کی چودھویں منزل شروع ہوتی ہے، کہنے کو تو یہ ہلال اب بدر اور ماہ چہاردہم ہے، مگر ہمیں اعتراف ہے کہ جس اوج فلک پر اس کو چمکنا تھا ابھی یہ اس سے فروتر ہے، گذشتہ تیرہ برسوں میں اردو ادب کے آسمان پر کتنے ستارے نکلے اور ڈوبے، ان میں سے ہر ایک کی نسبت ادبی شرک پسندوں کا دعوی یہی تھا کہ هذا ربي هذا أكبر [انعام:۷۸]، مگر ان کو دیکھ کر شریعت ادب کے اہل ایمان یہی کہتے رہے کہ لا أحب الآفلين [انعام: ۷۹] (۲)

(۱) تراجم علمائے اہل حدیث ہند ص:۳۶
(۲) شذرات سلیمانی ج ۱۹۵/۲

موت کی حقیقت:

یہ سال مسلمان والیان ریاست کیلئے خاص طور سے اندوہ ناک ثابت ہوا، مرحومہ سرکار عالیہ بھوپال کے سانحہ وفات کے بعد ان کے پوتے نواب حبیب اللہ خاں پھر رام پور اسلامی ریاست کے مسند نشیں، پھر نواب صاحب والی ٹونک کی وفات کے سانحہ یکے بعد دیگرے پیش آئے، اور دنیا کے انقلابات کے نئے نقشے آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے، "كل من عليها فان، ويبقى وجه ربك ذو الجلال والإكرام" [رحمٰن:۲۶](۱)

تحریک سے پہلے تیاری:

مسلمانوں کے سامنے بغیر کافی تیاری کئے کوئی عام تحریک پیش نہ کی جائے، اور پیش کیجائے تو اہل تحریک کا فرض ہے کہ اس کو جس طرح بنے مسلمانوں سے پورا کرائیں، تاکہ ان کی اخلاقی قوت روز بروز بڑھے اور کسی کام کو ناندھ کر اس کے پورا کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہو، یہ ڈھائی لاکھ کی رقم کچھ زیادہ نہیں (جامعہ ملیہ کی تأسیس کے بعد اس کی ایک عمارت کی تعمیر وتکمیل کے لئے ایک خطیر رقم کی اپیل کی گئی تھی، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس جلسہ سنگ بنیاد تک ۳۲/ہزار چندہ ہوگیا تھا) اہل ثروت کو بھی تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں، وہ صرف غریبوں کے پیسے سے پوری ہوسکتی ہے، اس کے لئے صرف اسلامی عزم چاہیے ويرزقه من حيث لا يحتسب [طلاق:۳]. (۲)

حفاظت دین متین:

بہر حال جہاں تک ممکن ہے جس طرح سے ربع صدی قبل سے عیش وعشرت، کھیل کود اور مزخرفات کو محرم کے حدود سے خارج کر کے اس کو صحیح روشنی میں "دنیائے اسلام" کے سامنے کیا گیا ہے اسی طرح تمام بدعتوں کو بھی دکن کی حد تک ملیامیٹ کر کے صحیح معنوں

(۱) شذرات ج ۱۹۵/۲
(۲) شذرات سلیمانی ج ۱۹۸/۳

میں ''عظمت ایام عزا'' کو برقرار رکھا جانا ضروری ہے کہ منجملہ دیگر فرائض کے ہر مسلم فرمانروا کے ذمہ ''حفاظت دین متین'' بھی (از روئے بحرمتی) کی گئی ہے، جس کی گواہی نص قرآنی سے ملتی ہے، ومن یعظم شعائر اللّٰہ فإنھامن تقو ی القلوب [حج:۳۲].(۱)

ایمان اور عمل صالح:

دنیا کی قوموں نے جب کبھی ترقی کی ہے تو اس کی قوت پرواز کے دو ہی پر ہوتے ہیں، ایمان اور عمل، جب تک ہمارے نوجوان ان دونوں سے بے پرواہیں، وہ ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتے، گویا آیت کریمہ ''**یأیھاالذین آمنوا آمنوا**''[نساء:۱۳۶] (اے ایمان والو! ایمان لاؤ) کی تفسیر اور اقبال مرحوم کے اس شعر کی تشریح کی:

یقیں محکم عمل پیہم ،محبت فاتح عالم(۲)

معترض کا تسلی نہ پانا:

معترض کا کام کتنا آسان ہے کہ لوگ اس کو جواب دیتے جائیں اور وہ سب سن کر آخر میں یہ کہ دے کہ تسلی نہیں ہوئی، ایسے ہی لوگوں کے باب میں قرآن پاک کا یہ فتوی ہے:۔ ختم اللّٰہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی أبصارھم غشاوۃ.[بقرۃ:۷](۳)

جہالت کا جواب:

پچھلے پرچہ میں مصر کے تعلیمی فتنہ کی نسبت (اشارہ ہے اس طرف کہ ہندوستان سے کچھ طلباء مصر تکمیل کے لئے گئے تھے، وہ اس طرح بن کر نہیں آئے، جس کی توقع ان کے دوستوں اور بزرگوں نے کی تھی، سید صاحب نے معارف کے شمارہ جون ۱۹۳۲ء میں

(۱) شذرات ج ۳/۱۹۸
(۲) ایضاً ج ۳/۳۶۴
(۳) شذرات سلیمانی: ج ۳/۳۶۴

اس پر تبصرہ مذکورہ الفاظ میں کیا) ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو اگرچہ قوم کے اکثر بزرگوں نے پسند کیا، مگر ہمارے ایک ''عزیز اور دوست'' جو مصر سے تعلیم پا کر آئے ہیں، اور ایک روزنامہ کے اڈیٹر ہیں، سخت برہم ہوئے ہیں۔

یہاں تک کہ ہم کو جہالت اور نادانی اور رجعت پسندی کا ملزم قرار دیا ہے، اور بتایا کہ ہمارے خیالات جہلاء اور عوام کو خوش کریں گے، مگر اہل علم کی نظر میں ان کی وقعت نہ ہوگی ہم ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دے سکتے ہیں، مگر اس لیے نہیں دیتے کہ ہماری جہالت اور رجعت پسندی ہم کو یہ سبق نہیں بھولنے دیتی کہ **وإذا مرّوا باللغو مروا کراما** [فرقان:۷۲].

عزیز موصوف سے ہم کو اب بھی اسی طرح محبت ہے اور ان کے حق میں ہم اب بھی اسی طرح دعائے خیر کرتے ہیں اور ان کی اینٹ کے جواب میں ہم پتھر نہیں مارنا چاہتے کہ **واذارمیت یصیبنی سھمی** جہالت و نادانی تو خیر ایسی چیز ہے کہ اس کی نسبت خود خدا کا فیصلہ ہے کہ **وفوق کل ذی علم علیم** [یوسف:۷۶] البتہ رجعت پسندی سے مقصود اگر مذہبی قدامت پسندی ہے تو ہم اس الزام کو فخراً قبول کرتے ہیں، اور اگر سیاسی رجعت پسندی کی طرف اشارہ ہے تو یہ قطعاً بے بنیاد ہے **وإن بعض الظن اثم**.[حجرات:۱۲](۱)

دنیا کا سودا نہ کیجئے:

''**الجھد والجھاد**'' نامی رسالہ میں گجرات کے ساحل سمندر پر واقع ہونے کی خوشنما منظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ ایک طرف تجارت اور بیوپار کی رونق اور دوسری طرف دینداری اور دین پروری کے جذبات اب بھی نمایاں ہیں، مسجدیں پر رونق اور نمازیوں سے آباد، اور ہندوستان بھر کے مذہبی مدارس کے توجہات کے ممنون ہیں، اس وقت بھی رانڈیر، ڈابھیل اور سملک کے ادارے اور مدرسے ہمارے فخر کیلئے کافی ہیں، ماشاء اللہ یہاں کے

(۱) شذرات ج ۲/۲۸۸۔

مسلمان تاجر اور کاروباری دین کا درد رکھتے ہیں، علماء کی قدر پہچانتے ہیں اور اپنے مالک خدا کی راہ میں دے کر اِس دنیا کے ساتھ اُس دنیا کی نیکیاں بھی خریدتے ہیں اور ربنا آتنا فی الدینا حسنة وفی الآخرة حسنة [بقرة:۲۰۱] کے مظہر بنتے ہیں۔

ماأحسن الدین والدنیا اذااجتمعا

ماأقبح الکفر والإفلاس بالرجل

غرض معاش کے ساتھ معاد کی فکر سے بھی غافل نہیں رہتے، اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اسلام کو دوسرے موجودہ مذاہب سے ممتاز کرتی ہے، اس کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دنیا آئندہ دنیا کی خریداری کا بازار ہے: إن اللّٰہ اشتری من المؤمنین أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة. [توبة:۱۱۱]

جان کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جاں فزا سے سروبال دوش ہے

رضائے الٰہی کے باغستاں کی جس کا دوسرا نام جنت ہے "ورضوان من اللہ أکبر" کی قیمت کتنی ارزاں اور سستی بتائی گئی ہے، جان ومال کی بازی!

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یہ دنیا اسی لئے دی گئی ہے کہ یہاں رہ کر اس دنیا کا سودا کیجئے، آپ جس طرح افریقہ اور برما میں رہ کر رانڈیر کو آباد کرتے ہیں، اسی طرح دنیا میں سودا کر کے آخرت کی آبادی کی فکر میں رہیں، اس دنیا میں رہ کر اور اس دنیا کے کاروبار کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق انجام دے کر اور خواہشات دنیا سے بچ کر اطاعت الٰہی کی تعمیل کر کے معرفت الٰہی اور رضائے الٰہی کی جو سرفرازی پائیں، تو یہ وہی مجاہدہ ہے جو آدم اور بنی آدم کیلئے مخصوص ہوا ہے اور جو فرشتوں کے حدود سے خارج ہے۔(۱)

(۱) الجهد والجهاد لعلمی المعاش والمعاد.

امارت کے لئے نفوذ واقتدار ضروری:

جو لوگ اس حقیقت کی تسلیم سے اختلاف کرتے ہیں: کیا وہ امارت کے اصولی مسئلہ پر اعتقاد نہیں رکھتے، کیا ان کے نزدیک مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی میں کسی امارت کی ضرورت نہیں، یہ کہنا کہ امارت کیلئے نفوذ واقتدار ضروری چیز ہے صحیح ہے، لیکن یہ کامل امارت کی شرط ہے، مسئلہ کی صورت تو یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی امر واجب کے ادا کرنے کی کما حقہ اور اس کو پورے شرائط کے ساتھ ادا کرنے پر قادر نہیں ہے تو آیا وہ واجب اس سے ساقط ہو جائے گا یا حسب استطاعت جہاں تک اس کی وسعت وقدرت میں ہے کرنا ضروری ہے، نماز کیلئے قیام وقعود اور قرآن پڑھنا ضروری ہے، لیکن اگر کوئی بیمار اپاہج یا گونگا اس پر قدرت نہ رکھے تو اس سے نماز ساقط ہوگی یا نماز واجب رہے گی اور اس کو ادا کرنا اس کی طاقت اور اس وقت کے مطابق فرض ہوگا: ۔لایکلف اللّٰہ نفسا إلا وسعها [بقرہ:۲۸۶]۔(۱)

بھینٹ اور قربانی میں فرق:

بھینٹ اور قربانی میں بڑا فرق ہے، خدا قربانی کے متعلق فرماتا ہے: "لن ینال اللّٰہ لحومها ولا دماؤها ولکن یناله التقوی منکم" [حج:۳۷] (خدا کو قربانی کے ان جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہونچے گا، لیکن تمہاری پرہیزگاری اس تک پہنچے گی)۔

مشرکین کا خیال تھا اور ہے کہ اس بھینٹ کا خون دیوتاؤں کو بھاتا ہے اور لطف دیتا ہے، لیکن مسلمانوں کے خدا نے اس کو صرف قربانی کرنے والوں کی پاکی، پرہیزگاری اور تقوی کا ذریعہ بنایا ہے: لیذکروا اسم اللّٰہ علی ما رزقهم من بهیمة الأنعام فکلوا منها وأطعموا البائس الفقیر [حج:۲۸] (اور تاکہ ان خاص دنوں میں خدا کا نام اس شکریہ میں لیں کہ اس نے اس کو پہلے جانوروں کی روزی دی) تو اس میں ہم کو جس چیز کا سب سے پہلے خیال

(۱) ہماری ملی ذمہ داریاں۔

کرنا چاہئے وہ نیکی، پرہیزگاری، شکرگذاری اور غریبوں کی اعانت ہے۔(۱)

صوبۂ بنگال کی مذہبی حالت:

خدا کا ہزار شکر ہے کہ اس نے علمائے بنگال کو اپنے صوبے کی مذہبی حالت پر غور کرنے کی توفیق بخشی اور اپنی ایک مرکزی قوت کے مجتمع کرنے کا خیال ان میں پیدا کر دیا، ہم ان کی اسی مرکزی قوت کو انجمن علمائے بنگال کہتے ہیں، الحمدللہ کہ ان کو خداوند کا یہ بھولا ہوا پیام ولتكن منكم أمة يدعو ن إلى الخير ويأمرون بالمعروف ينهون عن المنكر[آل عمران:۱۰۴] یاد آیا۔(۲)

کوئی ہم نام نہیں:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ولم نجعل له سميا** [مریم: ۷]۔(اور ہم نے اس کا کوئی ہمنام پہلے نہیں بنایا)، شاعر کو اس ہمنامی کی سعادت میں یہ خصوصیت نصیب ہوئی کہ وہ ایسا شاعر ہے جس کا کوئی تخلص نہیں، حتی کہ اس کا نام بھی بعض شعراء کے ناموں کی طرح تخلص کی شرکت سے پاک ہے، اور اس وصف میں شاید کوئی اردو اور فارسی کا شاعر اس کا شریک نہیں، محض تخلص کے شاعر تو بہت دیکھنے میں آئے ہیں، لیکن تخلص کے بغیر محض شاعر شاید ہی دیکھنے میں آیا ہو۔(۳)

خدا پر اعتماد:

عزیزو! خدا پر اعتماد رکھو، وہی سب کا سہارا ہے، اسی سے مدد چاہو، انسان فانی، اسکی ہر چیز فانی: **كل من عليها فان** [رحمان: ۲۶]۔(۴)

(۱) حیات سلیمان ص:۱۸۔
(۲) خطبۂ صدارت اجلاس دوم انجمن علمائے بنگال کلکتہ ۱۹۱۷ء۔
(۳) مقدمہ نوائے حیات۔
(۴) ریاض کراچی ۱۹۵۴ء مکتوب بنام سید ابو عاصم ص:۱۵۱۔

جنگ جمل کے حالات:

جس وقت حضرت عثمانؓ محاصرہ میں تھے کہ حضرت عائشہؓ اپنے دستور کے مطابق حج کو چلی گئیں، واپس آرہی تھیں کہ راستہ ہی میں باغیوں کے ہاتھ سے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ملی آگے بڑھیں تو حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ ملے، جو مدینے بھاگے چلے آرہے تھے، انہوں نے کہا: ہم لوگ مدینہ سے لدے پھندے بدوؤں اور عوام الناس کے ہاتھوں سے بھاگے چلے آئے ہیں اور لوگوں کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ حیران وسرگرداں ہیں، نہ حق کو پہچان سکتے ہیں نہ باطل سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ اپنی حفاظت پر قادر ہیں۔(تاریخ طبری)

حضرت عائشہ نے فرمایا کہ باہم مشورہ کرو کہ اس موقع پر ہم کو کیا کرنا چاہئے، اس کے بعد وہ مکہ معظّمہ واپس چلی آئیں، عام لوگوں کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو لوگ ہر طرف سے سمٹ سمٹ کر ان کے پاس آنے لگے، انہوں نے طلب اصلاح کی دعوت دی، عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ ام المومنین نے فرمایا کہ اس قوم کی طرح کوئی قوم نہیں جو اس آیت کے حکم سے اعراض کرتی ہو۔

وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما فإن بغت إحداهما على الأخرى فقاتلوا التى تبغى حتى تفيئ إلى أمر الله فإن فاء ت فأصلحوا بينهما. [حجرات:۹]

(اگر دو مسلمان جماعت لڑ جائیں تو دونوں کے درمیان صلح کرادو، پس اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والی سے لڑو، یہاں تک کہ حکم الٰہی کی طرف وہ رجوع کرے اور جب رجوع کرے تو دونوں میں صلح کرادو)(۱)

حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ جمل کے موقع پر عمران اور ابوالاسود تحقیق حال کے لئے حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ایک تقریر فرمائی جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

(۱) سیرت عائشہ ص:۱۲۳۔۱۲۴۔

''میں مسلمانوں کو لے کر اس لئے نکلی ہوں تا کہ لوگوں کو بتاؤں کہ عام مسلمان کو جن کو میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں کیا نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ کن کن جرائم کے مرتکب ہیں، خدا فرماتا ہے: لاخیرفی کثیر من نجوا هم إلامن أمر بصدقة أومعروف أو إصلاح بین الناس [نساء: ۱۱۴] (یعنی ان کی سرگوشی میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں، لیکن یہ کہ یہ خیرات عام نیکی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرائیں)، ہم اصلاح کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں جس کا خدا اور رسول نے ہر چھوٹے بڑے اور زن و مرد کو حکم دیا ہے، وہ دونوں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے پاس گئے، رخصت ہوتے وقت پھر حضرت عائشہ کے پاس آئے، حضرت عائشہ نے ان میں سے ایک سے خطاب کر کے کہا: ابوالاسود! دیکھنا تمہارا نفس تم کو دوزخ کی طرف نہ لے چلے، پھر یہ آیت پڑھی، کونوا قوامین للّٰہ شهداء بالقسط [مائدہ/۸] (خدا کے کام کیلئے آمادہ و سرگرم رہو اور انصاف کے گواہ بنو) (۱)

ألم تر إلى الذين أوتوا نصيبا من الكتاب يدعون إلى كتاب اللّٰه ليحكم بينهم ثم يتولى فريق منهم وهم معرضون. [آل عمران/۲۳]

کیا ان کو نہیں دیکھتے جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا کہ کتاب الٰہی کی طرف ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ فیصلہ کرے، پھر یہ حال ہے کہ ان کا ایک فرقہ اعراضانہ اس سے منحرف ہوتا ہے۔ (۲)

ازواج مطہرات کے لئے دوسری شادی ممنوع :

ازواج مطہرات کیلئے دوسری شادی خدا نے ممنوع قرار دی تھی، عرب کے ایک رئیس نے کہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عائشہ سے میں عقد کروں گا، چونکہ یہ امر دینی و سیاسی مصالح اور شان نبوت کے خلاف تھا اس لئے خدائے پاک فرمایا:

النّبی أولی بالمؤمنین من أنفسهم وأزواجه أمهاتهم [احزاب:۶]

(۱) سیرت عائشہ ص: ۱۳۰۔۱۳۱۔
(۲) سیرت عائشہ: ۱۳۲۔

(پیغمبر مسلمانوں سے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہے۔ اور ان کی بیویاں ان کی مائیں ہیں)۔

وما كان لكم أن تؤذوا رسول اللّٰه ولا أن تنكحوا أزواجه من بعد أبدا، إن ذٰلكم كان عنداللّٰه عظيما [احزاب:۷]

(اور تمہیں مناسب نہیں کہ تم پیغمبر خدا کو اذیت دو، اور نہ کبھی ان کی بیویوں سے اسکے بعد بیاہ کرو، خدا کے نزدیک یہ بڑی بات ہے)۔

اصل یہ ہے کہ ازواج مطہرات جو ایک مدت تک حامل نبوت کی محرم اسرار ہیں، ان کی بقیہ زندگی صرف اس لئے تھی کہ مقدس شوہر کی تعلیمات اور اسباب عمل کو جب تک جیتی رہیں دہراتی رہیں، ان کی زندگی کا ہر لمحہ صرف اسی فرض کی بجا آوری میں صرف ہو، وہ مسلمانوں کی مائیں تھیں، ان کا فرض صرف بیٹوں کی تعلیم و تربیت تھی، چنانچہ ان کے فرائض خود اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں:

يا نساء النبی من يأت منكن سے و اذكرن مايتلى فی بيوتكن من آيات اللّٰه والحكمة إن اللّٰه لطيفاخبيرا [احزاب:۳۰۔۳۴] تک کا ترجمہ ذیل میں مرقوم ہے:

(اے پیغمبر کی بیویو! تم میں جو برا کرے گی اس کو دوگنا عذاب ملے گا، اور خدا کیلئے یہ آسان بات ہے، اور تم میں سے جو خدا اور رسول کی فرمانبردار ہوگی اور اچھے کام کرے گی، اس کو ثواب بھی دوبارہ ملے گا، اور اس کے لئے ہم نے قیامت میں اچھی اور پاک روزی مہیا کی ہے، اے پیغمبر کی بیویو! تم عام اور معمولی عورتوں میں نہیں ہو اگر پرہیز گار بنو، دب کر نہ بولا کرو کہ سیاہ دل والے (منافقین) حوصلہ کریں اور اچھی بات بولا کرو، اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہا کرو اور گذشتہ زمانہ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر نہ نکلا کرو، نمازیں پڑھا کرو، زکوٰۃ دیا کرو، اور خدا کی فرمانبرداری کیا کرو، خدا یہی چاہتا ہے، اے اہل بیت نبوت کہ تم سے میل کچیل دور کر دے اور تم کو بالکل پاک صاف کر دے،

تمھارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں پڑھ کر سنائی جارہی ہیں، ان کو یاد کرو، بیشک خدا پاک و دانا ہے)(۱)۔

حساب میں ہلاکت:

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ **من حوسب عذب**'' قیامت میں جس کا حساب ہوا اس پر عذاب ہو گیا، عرض کی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا نے) یا رسول اللہ! خدا تو فرماتا ہے: **فسوف یحاسب حسابا یسیرا** [انشقاق:۸](اس سے آسان حساب لیا جائے گا)، آپ نے فرمایا: ''یہ اعمال کی پیشی ہے، لیکن جس کے اعمال میں جرح وقدح شروع ہوئی وہ تو برباد ہوا''۔(۲)

قیامت کا منظر:

ایک دفعہ انہوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! خدا فرماتا ہے: **یوم تبدل الأرض غیر الأرض والسموات و برزوا للّٰہ الواحد القھار**[ابراھیم:۴۸](جس دن زمین وآسمان دوسری زمین سے بدل جائیں گے اور تمام مخلوق خدائے واحد وقہار کے روبرو ہو جائے گی''۔
ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت پڑھی جس میں **والأرض جمیعا قبضتہ یوم القیامۃ ، والسموات مطویات بیمینہ** [زمر:۶۷](تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے)''جب زمین وآسمان کچھ نہ ہوگا تو لوگ کہاں ہوں گے'' آپ نے فرمایا: ''صراط پر''۔(۳)

آیت کی تفسیر:

قرآن کریم کی ایک آیت ہے: والذین یؤتون ماآتوا وقلوبھم وجلۃ أنھم

(۱) سیرت عائشہ ۱۱۳۔۱۱۴۔
(۲) سیرت عائشہ: ۳۵۔
(۳) سیرت عائشہ ص: ۳۵۔

إلی ربھم راجعون [مومنون:۶۰](اور جب وہ لوگ جو کام کرتے ہیں اور ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کو اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کو شک تھا کہ جو چور ہے، بدکار ہے، شرابی ہے، لیکن خدا سے ڈرتا ہے کیا وہ اس سے مراد ہے، آپؐ نے فرمایا:۔نہیں عائشہ! اس سے وہ مراد ہے جو نمازی ہے، روزہ دار ہے اور پھر خدا سے ڈرتا ہے۔(۱)

صراط مستقیم:

اسلام کا صراط مستقیم افراط وتفریط کے وسط سے نکلا ہے وہ نہ عورت کو خدا جانتا ہے نہ زندگی کی راہ کو کانٹا سمجھتا ہے، اس نے عورت کی بہترین تعریف یہ کی ہے کہ وہ مرد کیلئے اس کشمکش گاہ عالم میں تسکین وتسلی کی روح ہے:۔ومن آیتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیھا و جعل و بینکم مودۃ ورحمۃ [روم:۲۱](اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے خود تمھارے جنس سے بیویاں پیدا کیں کہ تم ان کے پاس پہنچ کر تسلی پاؤ اور اسی نے تم دونوں کے درمیان لطف ومحبت پیدا کیا)۔(۲)

عورت کے متعلق مشرق ومغرب کا مذاق:

عورت کے متعلق مشرق ومغرب کا مذاق باہم نہایت مختلف ہے، مشرق میں عورت کی محبت دامن تقدس کا داغ ہے، وہ فقط ایوان عیش کی شمع دلفروز ہے، جس کی روشنی عزلت نشینان حریم قدس کے تنگ حجروں کو اور بھی تاریک کر دیتی ہے۔
دوسری طرف محبت کیش مغرب اس کو خدا سمجھتا ہے، یا خدا کے برابر جانتا ہے، اور کہتا ہے کہ ''جو عورت کی مرضی وہ خدا کی مرضی'' یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے معقول ہونے کی سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے عورت کا کیا درجہ قائم کیا ہے۔(۳)

(۱) سیرت عائشہ: ۳۷۔
(۲) سیرت عائشہ: ۴۶۔
(۳) سیرت عائشہ ص: ۴۶۔

منافقین کی شرارتیں:

سفر (بنی مصطلق) سے واپسی میں کئی بار منافقین نے شرارتیں کیں، ایک دفعہ قریب تھا کہ مہاجرین اور انصار تلواریں کھینچ کھینچ کر باہم کٹ مریں، آخر مشکل سے معاملہ رفع دفع کیا گیا، ان شریروں نے انصار کو سمجھایا کہ وہ اسلام کی مالی خدمت چھوڑ دیں، عبد اللہ بن اُبی نے جو ان کا رئیس تھا برملا کہا: لئن رجعنا إلى المدينة ليخرجن الأعز منها الأذل [منافقون:۸] (اگر ہم مدینہ واپس پہنچے تو معززین ان ذلیل لوگوں کو مدینہ سے نکال دیں گے)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو جمع کر کے اس واقعہ کی اطلاع دی گو وہ اس جرم میں شریک نہ تھے تاہم ان کو ندامت ہوئی اور عبداللہ بن اُبی کی طرف سے ایک عام نفرت پیدا ہوگئی، خود اس کے بیٹے نے جب یہ سنا تو باپ کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور کہا: ''جب تک تم یہ اقرار نہ کرلو کہ ذلیل تم ہو اور معزز محمد ہیں، میں تم کو نہیں چھوڑوں گا''۔ (ابن سعد جزء مغازی ص:۴۵، صحیح بخاری تفسیر سورۂ منافقین)(۱)

آیت کا مطلب:

ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا: ثم أورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخيرات [فاطر:۳۲] (پھر ہم نے کتاب الٰہی کی وراثت ان بندوں کو عطا کی جن کو ہم نے چن لیا، ان میں سے بعض اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض معتدل اور بعض نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں)۔ فرمایا کہ ''فرزند من! یہ تینوں فرقے جنت میں داخل ہوں گے'' یہ اس آیت کی طرف اشارہ تھا جو پہلی آیت کے بعد ہی واقعہ ہے، **جنات عدن يدخلونها** [رعد:۲۳] (یہ لوگ جنت عدن میں رہیں گے)، پھر فرمایا: **سابق بالخيرات** [فاطر:۳۲] تو وہ صحابہ ہیں جنھوں نے آپ کے سامنے وفات پائی اور آپ

(۱) سیرت عائشہ:۸۷۔

نے ان کو بشارت دی، متوسط وہ ہیں، جنھوں نے آپ کی پوری پوری پیروی کی، یہاں تک کہ وہ مر گئے، اور ظالم وہ ہیں جو ہماری تمھاری طرح ہیں۔(۱)

یزید کی جانشینی:

امیر معاویہ نے اپنے بعد یزید کو جانشین بنانا چاہا، مروان ان کی طرف سے مدینہ کا گورنر تھا، مجمع عام میں اس نے یزید کا نام پیش کیا، حضرت عائشہ کے بھائی عبدالرحمٰن نے اٹھ کر مخالفت کی، مروان نے ان کو گرفتار کرنا چاہا، وہ دوڑ کر حضرت عائشہ کے گھر میں گھس گئے، مروان اندر گھسنے کی جرأت نہ کر سکا، کھسیانہ ہو کر بولا، یہی وہ ہے جس کی شان میں یہ آیت اتری ہے :والذی قال لوالديه أف لكما، [احقاف:۱۷] حضرت عائشہؓ نے اوٹ کے پیچھے سے فرمایا ''ہم لوگوں کی شان میں خدا نے کوئی آیت نہیں اتاری، بجز اسکے کہ میری برأت فرمائی، (صحیح بخاری تفسیر سورۂ احقاف) اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ یزید کی جانشینی سے وہ خوش نہ تھیں۔(۲)

قرآن ۲۳/ سال میں نازل ہوا:

قرآن مجید تیئیس سال کے اندر نازل ہوا ہے، حضرت عائشہؓ بوت یا نزول قرآن کے چودھویں سال، نو برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آئیں، اس لئے ان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا زمانہ تقریباً دس سال ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ نزول قرآن کا نصف سے زیادہ حصہ ان کے ابتدائے ہوش سے پہلے کا واقعہ ہے، لیکن اس غیر معمولی دل و دماغ کی ہستی نے اس زمانہ کو بھی جو عموماً طفلانہ بے خبری اور لہو واجب اس کا عہد ہے رائیگاں نہیں کیا، فرماتی ہیں کہ جب یہ آیت اتری تھی: **بل الساعة موعدهم والساعة أدهىٰ وأمرّ** [قمر:۴۶] (بلکہ قیامت کا روز ان کے وعدہ کا دن ہے، وہ

(۱) سیرت عائشہ:۱۴۷
(۲) سیرت عائشہ:۱۵۳

گھڑی نہایت سخت اور تلخ ہوگی)، تو میں کھیل رہی تھی)۔(۱)

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی) عادت یہ تھی کہ جس آیت کریمہ کا مطلب سمجھ میں نہ آتا، خود آنحضرت ﷺ سے دریافت کرلیتیں، چنانچہ صحیح حدیثوں میں متعدد آیتوں کی نسبت آنحضرت ﷺ سے ان کا سوال مذکور ہے، امہات المومنین کو خدا کی طرف سے حکم تھا "واذ کرن مایتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللّٰہ والحکمۃ "[احزاب:۳۴] (تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد کیا کرو)۔(۲)

امام مالکؒ کے فضل وکمال کا اعتراف:

امام مالک کے فضل وکمال کا اعتراف منصور نے نہ صرف امام کے سامنے کیا بلکہ پیچھے بھی کرتا تھا، سفیان ثوری اور سلیمان خواص ایک بار منصور سے ملنے گئے، منصور نے خیمہ کے اندر بلایا، سفیان ثوری نے کہا کہ یہ فرش جب تک اٹھایا نہ جائے، میں نہیں آسکتا، فرش اٹھ گیا تو آیت منہا خلقنا کم وفیہا نعیدکم وفیہا نخرجکم تارۃ أخری [طہ:۵۵] (اسی خاک سے تم کو پیدا کیا، اور اسی خاک میں تم کو ملائیں گے، اور پھر اسی خاک سے تم کو اٹھائیں گے)، پڑھتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے، منصور آبدیدہ ہوگیا، سفیان ثوری دیر تک بالفاظ سخت نصیحت کرتے رہے پھر اٹھ کر چلے آئے، ابوعبیدہ جو دربار کا ایک عہدہ دار تھا، اس نے کہا: امیر المومنین ایسے زبان دراز شخص کے قتل کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ منصور نے کہا: خاموش! سفیان ثوری اور مالک بن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔(۳)

اگر کوئی فاسق تم کو خبر دے تو اس کی تحقیق کرلو:

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علماء کو میری حکومت سے ناراضی ہے، اس نے خلاف وقت شب کو ابن ابی ذئب وابن سمعان فقہائے حجاز اور امام مالک کو طلب کیا، امام

(۱) سیرت عائشہ:۱۷۸
(۲) سیرت عائشہ:۱۱۴
(۳) حیات مالک:۵۸

صاحب واقعہ سمجھ گئے، زندگی سے ناامید ہوکر غسل فرما کر کفن کے کپڑے پہن کر اور حنوط (مردوں کو لگایا جاتا ہے) مل کر دربار میں آگئے، منصور نے کہا: اے گروہ فقہاء! مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے جس سے افسوس ہے، حالانکہ تمہارا فرض تھا کہ سب سے پہلے تم میری اطاعت کرتے اور مجھ کو برا کہنے سے باز رہتے، اگر مجھ میں کچھ عیب ہوتا تو مجھ کو نصیحت کرتے، امام صاحب نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! خدائے پاک ارشاد فرماتا ہے:

یاأیہاالذین آمنوا إن جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین. [حجرات:۶] (مسلمانو! اگر کوئی فاسق تم کو خبر دے تو اس کی تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں بے گناہوں کو ستاؤ، پھر اپنے کئے پر تم کو ندامت ہو)۔(۱)

علمائے سلف کی بے باکی:

علمائے سلف کی مشترک صفت یہ تھی کہ وہ نطق حق میں بیباک ہوتے تھے، گذشتہ صفحات کے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ امام صاحب برابر خلفاء کے دربار میں آمد ورفت رکھتے تھے، بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، امام صاحب نے فرمایا کہ اگر نہ جاؤں تو نطق حق کا موقع کہاں ملے، تم نے پڑھا ہوگا کہ ایک بار منصور نے چند فقہاء کے ساتھ امام مالک کو بلا بھیجا، اور پوچھا کہ تم لوگ مجھ کو کیا سمجھتے ہو، سب سے دلیرانہ تقریر ابن ابی ذئب نے کی، امام صاحب نے فرمایا کہ مجھ کو اس کے جواب سے معاف کرو، یہ سکوت وتعلل بھی نطق بین سے کم نہیں، امام کو کوڑے مارے گئے، لیکن کیوں؟ اس لئے کہ حق کے اظہار میں انہوں نے حکومت کی پروانہ کی، ایک بار منصور نے مسجد نبوی میں زور شور سے مناظرہ شروع کیا، فرمایا کہ ادب ملحوظ رہے **لاترفعوا أصواتکم فوق صوت النبی** [حجرات:۲]۔ عباسیوں کے مقابلہ میں محمد نفس ذکیہ نے جب علم بلند کیا تو آپ نے علی الاعلان فتوی دیا

(۱) حیات مالک:۶۳

کہ خلافت محمد نفس ذکیہ کا حق ہے، عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔(۱)

آیتوں میں تطبیق:

سورہ بقرہ کے آخر میں ہے۔ وان تبدو ا مافی أنفسکم أو تخفوہ یحاسبکم بہ اللّٰہ[بقرۃ:۲۸۴] (جو تمہارے دل میں ہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا اس کا حساب لے گا) فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء [بقرہ:۲۸۴] (پھر جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دل تک میں جو خیالات اور اندیشے آتے ہیں، خدا ان کا بھی حساب لے گا، پھر اگر چاہے گا، تو بخش دے گا، اور چاہے گا تو ان پر سزا دے گا، لیکن دل میں بے ارادہ جو وسوسے اور خیالات آتے ہیں، اگر خدا ان پر بھی دار و گیر کرے تو انسان کے لئے جینا مشکل ہو جائے، حضرت علی اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت اپنے بعد کی اس آیت سے منسوخ ہے (جامع ترمذی تفسیر آیت مذکورہ صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ) لایکلف اللّٰہ نفسا إلا وسعھا لھا ماکسبت وعلیھا مااکتسبت [بقرہ:۲۸۶] (خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا وہ جو کچھ کرے گا اس کا نفع یا نقصان اس کو ملے گا)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بھی یہی رائے ہے، حضرت عائشہؓ سے کسی نے اس اوپر کی آیت کا مطلب پوچھا، تو اسی کے ساتھ اس کی ہم معنی ایک آیت پیش کی: **من یعمل سوء یجزبہ** [نساء:۱۲۳] (جو کوئی برائی کرے گا، اس کو اس کا بدلہ دیا جائے گا) سائل کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ سچ ہے تو مغفرت اور رحمت الٰہی کی شان کہاں ہے اور نجات کی کیوں کر امید ہے؟ فرمایا: میں نے جب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر پوچھی ہے، تم ہی پہلے شخص ہو جس نے اس کو مجھ سے دریافت کیا، خدا کا فرمانا سچ ہے، لیکن پروردگار اپنے بندے کے یہ چھوٹے چھوٹے گناہ ذرا ذرا سی مصیبت اور ابتلاء کے معاوضہ میں بخش

(۱) حیات مالک:۷۷

دیتا ہے، مومن جب بیمار ہوتا ہے، یا اس پر کوئی مصیبت آتی ہے، یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جاتا ہے اور اس کی تلاش میں اس کو پریشانی لاحق ہوتی ہے (یعنی ان ابتلاءات میں اس کی مغفرت اور رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے) پھر یہ حال ہوتا ہے کہ جس طرح سونا آگ سے خالص ہو کر نکلتا ہے، اسی طرح مؤمن دنیا سے پاک وصاف ہو کر نکلتا ہے۔(۱)

قرآن مجید میں ہیبت ناک منظر یا خوف کا مفہوم:

قرآن مجید میں جہاں کہیں ہیبت ناک منظر یا خوف کا ذکر ہے، مفسرین کا عام طرز یہ ہے کہ اس کو قیامت سے متعلق سمجھتے ہیں، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنھم چونکہ ہر آیت کے محمل کو جانتے تھے، اس لئے صحیح طریقہ سے اس کی تعیین کر سکتے تھے، ایک آیت میں ہے کہ جس دن آسمان دھواں لائے گا: "یوم تأتی السماء بدخان مبین" [دخان:۱۰] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے مکہ میں آنحضرت ﷺ کی بددعا سے جو قحط پڑا تھا، اس کے متعلق یہ آیت ہے اسی طرح قرآن میں ایک موقع پر ہے، إذ جاء وکم من فوقکم ومن أسفل منکم وإذزاغت الأبصار و بلغت القلوب الحناجر [احزاب:۱۰] (جب وہ تمہارے سامنے سے آئے اور تمہارے پیچھے سے آئے، اور جب نگاہیں ماند ہو گئیں اور کلیجے منھ کو آ گئے)۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ غزوہ خندق کا واقعہ ہے یعنی یہ غزوہ خندق کے موقع پر مسلمانوں کے اضطراب اور ابتلاء وامتحان کی تصویر ہے۔(۲)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو:

یورپ میں جہاں اور ہر قسم کی ترقیاں ہو رہی ہیں، نابیناؤں کی تعلیم بھی تیز قدمی کے

(۱) سیرت عائشہ:۱۸۷

(۲) سیرت عائشہ:۱۸۷

ساتھ روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور آنکھ والوں کی طرح یہ بھی علمی اور تمدنی لذتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے برابر کے حصہ دار ہیں، مگر افسوس ہے کہ آنکھ والے مسلمانوں کا حقیقی تعلیمی پایہ روز بروز پست نظر آتا ہے: **فاعتبروا یاأولی الأبصار** [حشر:۲]۔(۱)

انسان ظاہر پرست اور حقیقت فراموش:

جب ہندوستان آزاد ہوا اور ادھر پاکستان بنا تو ہزاروں لوگ اپنی جائدادیں چھوڑ کر فرار ہو گئے، اور ان کی متروکہ جائدادوں پر حکومتِ وقت نے قبضہ کر لیا، کچھ اس قسم کی زمین و جائداد کا قصہ تھا، عدالتی تحقیقات ہونا تھی اور سید سلیمان صاحب ندوی قاضی بھوپال کے نام بھی سمن جاری ہوا جس میں ایک مقررہ تاریخ پر موصوف کو حاضری عدالت کا پابند کیا گیا..... بھوپال کے تمام حساس مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ فضا مسموم ہے ہواؤں کا رخ بدلا ہوا ہے کہیں سید صاحب کے ساتھ کوئی توہین آمیز خطاب اور دل شکن طریق عمل نہ اختیار کیا جائے خود سید صاحب بھی متفکر تھے۔

بہر حال مقررہ تاریخ پر پیشی ہوگئی اس واقعہ کے چند روز بعد سید سلیمان صاحبؒ مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کے مکان پر تشریف فرما تھے چند عقیدت مند موجود تھے، میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

سید صاحب نے فرمایا کہ عدالت میں میری طلبی ہوئی، موتی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد میں نے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے جج سے مرعوب نہ فرمانا بلکہ جج کو مجھ سے مرعوب فرما دیجئے گا اور عدالت جانے کے لئے روانہ ہو گیا، میں نے کمرۂ عدالت میں قدم رکھا تھا کہ جج صاحب کھڑے ہو گئے، میرا استقبال کیا، فوراً کرسی منگائی، اپنے پاس مجھ کو بٹھلایا اور کہنے لگے کہ ناحق آپ کو تکلیف دی، آپ اطمینان رکھیں، معاملہ کی تحقیقات کے بعد آپ کو مطلع کر دیا جائے گا اور اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں، دل ہی دل میں خدا کا

(۱) الندوہ: ستمبر ۱۹۰۶ء

شکر ادا کرتے ہوئے میں بہت خوش اور بہت مطمئن واپس آ گیا، یہ فرمانے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا یہ کیا ہوا؟ میں نے سمجھا کہ تخاطب مجھ سے سہی لیکن سوال پوری مجلس سے ہوگا، اس لئے جواب میں عجلت نہ کی، مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ جج کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے توسط سے جواہر لال نہرو آپ سے تعلق رکھتے ہیں، سید صاحب نے اپنا سوال دوہرایا اور مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب نے ذرا تبدیلی کے ساتھ پھر فرمایا کہ ضرور جواہر لال نہرو نے جج صاحب کو کچھ ہدایت دے دی ہے، سید سلیمان صاحب نے تیسری بار مجھ کو مخاطب بنا کر فرمایا کہ یہ کیا ہوا؟ مجھے یقین ہو گیا کہ اس وقت میرا ہی امتحان مقصود ہے اور میں نے عرض کیا کہ آپ اللہ سے مانگ کر چلے تھے اللہ نے آپ کی لاج رکھ لی۔ اس کے بعد سید سلیمان صاحبؒ نے اپنا رخ پوری مجلس کی طرف فرما کر یہ ارشاد فرمایا کہ انسان ظاہر پرست اور حقیقت فراموش ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس ظاہر پرستی اور حقیقت فراموشی کو مختلف انداز میں بیان فرمایا ہے اسی سلسلے کی ایک آیت کریمہ یہ ہے: وإذا ركبوا في الفلك دعوا الله مخلصين له الدين ، فلما نجاهم الى البر اذا هم يشركون [عنکبوت:۶۵]. (جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو پکارتے ہیں اور خالص اسی کی عبادت کرتے ہیں لیکن جب وہ نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے، تو جھٹ شرک کرنے لگتے ہیں)۔

فرمایا کہ ساحل سے دور دریا کی موجوں میں خالص اللہ کو پکار رہے تھے لیکن جب امن وسلامتی کے ساتھ خشکی پر اتر آئے تو کہنے لگے کہ خیریت ہوگئی کہ تند و تیز ہواؤں سے واسطہ نہ پڑا اور ہم بخیریت پہونچ گئے، کسی نے کہا کہ جہاز کا کپتان بہت دانا بینا اور تجربہ کار ہے، کتنی خوبی سے یہ سفر طے ہو گیا، غرض یہ کہ خدا کو بھول گئے اور کامیابی دوسروں کی طرف منسوب کرنے لگے، اسی کو قرآن حکیم **اذا هم يشركون** فرما کر شرک قرار دے رہا ہے۔

خطاب عام تھا اور روئے سخن کسی خاص فرد کی طرف نہ تھا اور وہ قرآن حکیم کی روشنی میں اسی حقیقت کو آشکارا فرما رہے تھے کہ خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارنے والے بھی

کس طرح مبتلائے شرک ہوجاتے ہیں۔(۱)

معراج جسمانی کی دلیل:

اشاعرہ معراج جسمانی کی دلیل سبحان الذی أسری بعبدہ[اسراء:۱] سے دیتے ہیں کہ عبد جسم وروح کے مجموعہ کا نام ہے، لیکن اشاعرہ کی دلیل صحیح نہیں ہے، کیونکہ آیت قرآنی ہے: یأ یتھا النفس المطمئنة ارجعی إلی ربك راضیة مرضیة ، فادخلی في عبادي وادخلی جنّتی[فجر:۲۷] یہاں تنہا نفس کو بھی عبد کہا گیا ہے۔

اصل اشیاء میں اباحت ہے:

یہ جو فقہاء کا اصول ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یہ تو قیاس ہے، اور قیاس کی سند کتاب وسنت سے ہونی چاہئے، اس قیاس کی سند آیت قرآنی خلق لکم مافي الأرض جمیعا [بقرہ :۲۹] ہے، اس لئے جب کہ کہا جاتا ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے تو اشیاء سے مراد اعیان وذوات ہیں ، افعال واعمال نہیں ہیں ، ورنہ بدعات کو جو مسکوت عنہ ہیں جائز ماننا پڑے گا۔

مبذرین شیطان کے بھائی:

مبذرین کو شیطان کا بھائی کیوں کہا گیا ہے، اور پھر خود ہی جواب میں فرمایا کہ بعد کی آیت میں اس کی وجہ ہے ان المبذرین کانوا إخوان الشیاطین و کان الشیطان لربه کفورا ۔ (اسراء:۲۷)(فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اللہ تعالی کا ناشکر گزار ہے)اور مبذر ومسرف بھی اللہ تعالی کی دی ہوئی نعمت کو غلط جگہ میں صرف کر کے اس نعمت کا ناشکر گزار ہے۔(۲)

---

(۱) مطالعہ سلیمانی:۵۰۸۔۵۰۹

(۲) مضمون بعنوان دید وشنید مرتبہ مولانا ابوالعرفان ندوی مطالعہ سلیمانی ص:۵۰۲۔۵۰۳

باب سوم

قرآنی الفاظ

تحقیق ونکتہ آفرینی

باب سوم

قرآنی الفاظ: تحقیق ونکتہ آفرینی

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے قرآنی الفاظ کی تشریح اپنی کتابوں میں اچھے انداز میں کی ہے، اس میں قدیم وجدید مصادر سے استفادہ کے ساتھ قرآن میں جو لفظ جس جگہ پر استعمال ہوا ہے، اس کے برمحل معنی کی بھی وضاحت کی ہے، آئندہ صفحات میں ان کی تمام کتابوں سے قرآنی الفاظ کی تشریح، تحقیق، اور تفسیر درج کی جارہی ہے:

اسمائے حسنی

اللہ

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیرہ کا یہ خیال ہے کہ یہ وِلاہ سے نکلا ہے، ولاہ اور ولہ کے اصل معنی عربی میں ''غم''، ''محبت'' اور ''تعلق خاطر'' کے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد کو مطلق ''عشق ومحبت'' کے معنی پیدا ہوگئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے، اس لئے اللہ کے معنی ''محبوب اور پیارے'' کے ہیں، جس کے عشق ومحبت میں نہ صرف انسان بلکہ کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ

ہندی میں ''من موہن''، یعنی ''دلوں کا محبوب'' کیا کرتے تھے۔(۱)(۱) علامہ سید سلیمان ندوی کے چند نادر خطبات ورسائل کا مجموعہ: ص۔۱۰۶)

لفظ اللہ کے متعلق مارگولیتھ صاحب کی تحقیق کہ ''یہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا، اس لئے محمدؐ کی توحید پرستی کے یہ معنی ہیں کہ انہوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوایا'' (محمد: ص۱۹)، یورپ کے ''مشرقی تبحر علمی'' کی شرمناک مثال ہے، سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں ''حقیقی خدا'' کے مفہوم کے لئے کوئی لفظ موجود نہ تھا، تم کہتے ہو کہ محمدؐ سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے، بہتر ہے، لیکن کیا وہ اپنے خدا کے لئے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ پیش کرتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیان کے مطابق عرب میں عیسائی شعراء بکثرت پیدا ہوئے ہیں، بات سچ ہے، عرب میں عیسائی شعراء ہوئے ہیں، لیکن کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سنا؟ قرآن نے اللہ تعالی کی صفات خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کئے ہیں، وہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں؟ سب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل تو الالہ ہے، الٰہ تو صرف عربی میں نہیں، بلکہ تمام سامی زبانوں میں خدا تعالی ہی کے لئے مستعمل ہے، کم از کم اُلوہ اور اُلوہیم سے تو ناواقفیت نہ ہوگی، قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بنا کر پوجا کرتے تھے، کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں کوئی مجسمہ تھا؟(۱)

رحمان

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ ''رحمان'' اور ''رحیم'' ہیں، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں، یعنی رحم والا ''مہربان''، ''لطف وکرم والا'' اور پھر یہی اوصاف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (محبوب، مہربان، رحم والا) قرآن مجید کے ہر سورت کے آغاز میں پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالی کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۸۰۔۱۸۱)

کرنے کے لئے کوئی دلیل مطلوب ہے؟!۔

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا علم یہی لفظ ''رحمان'' ہے جو رحم وکرم اور لطف ومہربانی کے معنی میں صفت مبالغہ کا لفظ ہے: قل ادعو اللّٰہ أو ادعوا الرحمن أیاماً ماتدعوا فله الأسماء الحسنی [اسراء۱۱۰] (اس کو محبوب کہو یا مہربان کہو، جو کہہ کر اس کو پکارو، اس کے سب ہی نام اچھے ہیں)۔

قرآن مجید نے لفظ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳/ موقعوں پر خدا کو اس نام سے پکارا ہے(۱)۔

خدا کے لئے رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے عام طور سے مستعمل نہ تھا، اصل میں یہ عبرانی لفظ ہے، اور صرف یہود ونصاری اور بعض دیگر ارباب مذہب اس کو بولتے تھے، چنانچہ یمن کے آخری کتبات میں رحمٰن ہی کا نام ملتا ہے، (برٹانیکا کا مضمون سبا، طبع یازدہم)

سدعرم کے عیسائی کتبہ کا آغاز بنعمۃ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے جب ابتداءً رحمان کا نام لیا تو قریش کو اچنبھا ہوا کہ یہ کون نیا نام ہے، (سیرۃ ابن ہشام)۔ صلح حدیبیہ میں جب حضرت علیؓ نے عہد نامہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمان الرحیم لکھا تو قریش نے ماننے سے انکار کیا کہ ہم رحمان کو نہیں جانتے۔ (صحیح بخاری)

قرآن مجید میں قریش کے اس انکار کی تصریح مذکور ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوراً [فرقان:۶۰] (جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں: رحمان کیا ہے، کیا تو جس کو کہے گا، اس کو ہم سجدہ کریں گے، اس سے ان کی نفرت میں اور ترقی ہوتی ہے)۔

وَهُم بِذِكْرِ الرَّحْمَنِ هُمْ كَافِرُونَ:[انبیاء:۳۶] (رحمٰن کی یاد سے وہ منکر ہیں)۔

قرآن نے ان کو بتایا کہ خدا کے لئے تمام اچھے نام بولے جاسکتے ہیں، اللہ اور

(۱) ''علامہ سید سلیمان ندوی کے چند نادر خطبات ورسائل کا مجموعہ'' ۱۰۶۔۱۰۷

رحمان ایک ہی ذات کے مختلف نام ہیں: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى [بنی اسرائیل:۱۱۰] (کہہ دو کہ خدا کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر پکارو، اس کے لئے سب اچھے نام ہیں)۔

قرآن کے ہر سورہ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے، ہمارے مفسرین نے رحمان اور رحیم کی دو ہم معنی صفتوں کی یکجائی کی متعدد تاویلیں کی ہیں۔ اور ان دونوں الفاظ کے معانی کے درمیان نہایت نازک اور دقیق فرق نکالے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک سب کوہ کاوی وموشگافی ہے، قرآن کے استعمال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے رحمان کا استعمال بطور صفت کے نہیں، بلکہ بطور علم کے کیا ہے، چنانچہ تمام قرآن میں ۵۳/ دفعہ یہ نام خدا کے لئے آیا ہے، اس بنا پر اس کو صفت قرار دینا صحیح نہیں ہے، سورۂ بنی اسرائیل کی اوپر والی آیت سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ رحمان، خدا کی صفت نہیں، بلکہ علم ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عرب میں دو متضاد جماعتیں تھیں، جن میں سے ایک اپنے معبود کو اللہ اور دوسری رحمان کہتی تھی، اسلام ان دونوں کو یکجا کرتا ہے کہ (تم جس کو اللہ کہتے ہو اور وہ جس کو رحمان کہتے ہیں، درحقیقت ایک ہی ذات کی دو تعبیریں ہیں، اور یہ باہمی اختلاف محض نزاع لفظی ہے، اس بنا پر بسم اللہ الرحمان الرحیم کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں: ''ہم اپنا کام اس خدا کے نام سے شروع کرتے ہیں جس کا دوسرا نام رحمٰن ہے اور جو رحمت والا ہے'' (۱)

رب العالمین

ربوبیت (پرورش) عبد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہوسکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر موجودات کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، وہ ذرہ ہو یا ایتھر، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا مشت استخوان، شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۸۴/۲۔۱۸۵۔

جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ رب کے مہر وکرم اور لطف ومحبت سے استغنا اور بے نیازی نہیں ہوسکتی۔

تورات کے اسفار اور انجیل کے صحیفوں میں ایک ایک ورق ڈھونڈو، کیا اللہ تعالی کے لئے یہ پر محبت، یہ سراپا مہر وکرم، اسماء وصفات کی یہ کثرت، تم کو وہاں ملے گی؟ اسلام اللہ تعالی کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود ونصاری اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس لطف احساس اور مہر وکرم کے جذبات وعواطف سے وہ بے بہرہ نہیں، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایۂ روحانی سمجھتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک وکفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسان کو بچانا چاہتا ہے، جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر، پاک اور سرتاپا روحانی معانی کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس لئے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں۔

اسلام، متکلم ازل کا آخری پیغام ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ وہ اس قسم کی لغزشوں سے پاک ومبرا ہو، حقائق روحانی کی تعبیر کے لئے یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی مذہب کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو ان استعمالات کی غلطیوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے۔ اور خدا کے مہر وکرم اور عشق ومحبت کے تذکروں کے ساتھ ادب ولحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کر دیا ہے، قرآن مجید اور احادیث، روحانی عشق ومحبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ وہ انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا کہ عبد ومعبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اَب (باپ) کے بجائے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں، بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

''اب'' اور ''رب'' ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ

عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل، اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، ''اب'' یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص کیفیت اور مدت سے لے کر ایک محدود عرصہ تک رہتا ہے، اس کے وجود میں اس کو یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر اس کے قیام وبقاء، زندگی، ضروریات زندگی، سامان حیات، نشو ونما اور ارتقاء کسی چیز میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی، عہد طفلی تک شاید کچھ اور واسطہ ہو، اس کے بعد تو بچہ اپنے والدین سے الگ، مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو، کیا عبد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان جو ربط وتعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہوسکتا ہے؟ کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الأوقات ہے؟(۱)

فله الأسماء الحسنى:

قرآن مجید میں اللہ تعالی کے بیسیوں اوصافی نام ہیں، احادیث میں اس کے ننانوے نام گنائے گئے ہیں، ان ناموں میں اللہ تعالی کے ہر قسم کے جلالی وجمالی اوصاف آگئے ہیں، لیکن استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے، جن میں اللہ تعالی کے لطف وکرم اور مہر ومحبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورۂ ذات البروج میں) آیا ہے، جس کے معنی ''محبوب'' اور ''پیارے'' کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر ومحبت اور عشق اور پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الـولـي ہے، جس کے لفظی معنی ''یار'' اور ''دوست'' کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ الرؤوف ہے، ''رؤوف'' کا لفظ ''رأفت'' سے نکلا ہے، ''رأفت'' کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کے لئے قرآن مجید میں ایک اور نام حنان آیا ہے، جو ''حن'' سے مشتق ہے، ''حنّ'' اور ''حنین'' اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان حجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں، جو اسلام نے خالق ومخلوق اور عبد ومعبود

(۱) علامہ سید سلیمان ندویؒ کے چند نادر خطبات: ۱۰۷، ۱۱۰

کے ربط وتعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں، دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا ہے، لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے، اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معانی کی تلقین کررہا ہے۔ ان کے علاوہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں اللہ تعالی کے جو اسماء اور صفات مذکور ہیں، ان کو بھی اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہئے، اس کا نام غفّار (بخشش کرنے والا) غفور (بخشنے والا) سلام (امن وسلامتی) ہے کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لئے امن وسلامتی ہے، پھر وہ مؤمن (امن دینے والا ہے) وہ العدل یعنی سرتاپا انصاف ہے، العفوّ (معاف کرنے والا ہے) الوھّاب (عطا کرنے والا ہے) الحلیم (بردبار) الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) البر (نیک اور مجسم خیر) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے۔(۱)

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے، وہ جنت میں داخل ہوگا، خدا طاق ہے، وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے، آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے، پورے سو کیوں نہ مقرر کئے گئے، یہ اس لئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا، اور اس سے توحید کا رمز آشکارانہ ہوتا، صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے، ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے، لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں، پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں، جو قرآن مجید میں مذکور نہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں، اسی لئے علماء کا فیصلہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش وتفحص سے کیا ہے، اس

(۱) (علامہ سید سلیمان ندویؒ کے چند نادر خطبات: ۱۰۷، ۱۰۸)

لئے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں، بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰؒ، ابوبکر بن عربیؒ، امام نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ، خطابیؒ، ابن تیمیہؒ اور قرطبیؒ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفات الٰہی کی کوئی حد وپایاں نہیں ہے، (تمہید ابوشکور سالمی، الباب الخامس، القول الثالث فی عدد الأسماء ص ۶۱، یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے)

اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ(۱) کی روایتوں سے استدلال کیا ہے۔

بہرحال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور یا آنحضرت صلی اللہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے، ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہوسکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے، علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے، لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جن سے اس کے رحم وکرم، عفوودرگزر یعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال وجبروت اور حکومت واستیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو صفات جلالی کہتے ہیں، تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عائشہؓ کو آپؐ نے یہ دعا سکھائی: اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں، یہ روایت مسند ابن حنبل میں بھی بسند عبداللہ بن مسعود ہے)۔

الغرض خدا کے تمام اسماء وصفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی وکریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ وجلال کا اظہار ہوتا ہے، اور یا اس کی تنزیہہ وکمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفات جمالی

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کے رحم وکرم اور شفقت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ: یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں، جس کی پرستش کی جائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت ومعرفت میں عقل انسانی حیران وسرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں: وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

الرحمٰن: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے، اس کے معنی رحم والے کے ہیں، یہ گزر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا، عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا، قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے، بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے، مگر درحقیقت یہ بدل ومبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الٰہی کی دعوت دی گئی، جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّا مَّا

تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى [اسرائیل:۱۱۰] (اللہ کہو یا رحمٰن، جو چاہو کہو، اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں)۔

الرحیم: رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے، جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے، اس لئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے، الرحمٰن اور الرحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں، جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے، کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا، وہ اس کی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے، اس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور ہے، اور ہوگا۔

الرب: پرورش کرنے والا، یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشو ونما اور ظہور وترقی کا ذمہ دار۔

اللطیف:۔لطف والا مہربان

اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو لطیف فرمایا ہے، راغب اصفہانی لطیف کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں: وہ اپنے بندوں کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے، امام بیہقی کتاب الأسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں کہ: وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے، اور ان کے لئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے، لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے، جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا، اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے، جس کا گمان ان کو نہیں ہوتا، ابن الأعرابی کا قول ہے: لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہونچا دیتا ہے (۴۷) امام غزالیؒ کہتے ہیں: اس صفت کا مستحق وہی ہے، جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے سختی سے نہیں، اس تک پہونچاتا ہے، جس کے حق میں وہ مفید ہے، جس عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں، اور اس کمال کا تصور خدا کے لئے ہے (روح المعانی: تفسیر شوریٰ)۔

العفو:۔معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا

الودود:محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا

السلام:امن وسلامتی، صلح وآشتی، ہرعیب سے پاک وصاف

المحب:۔محبت والا، پیار کرنے والا، چاہنے والا

المؤمن :امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہرخوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا

الشکور:اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول، اور پسند کرنے والا۔

الغفور والغفار:۔معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگذر کرنے والا۔

الحفیظ والحافظ:۔حفاظت کرنے والا، نگہبان، بچانے والا۔

الوھاب:دینے والا،، عطا کرنے والا، بخشنے والا

الرازق، والرزاق:روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

الولی:دوست، حمایتی، طرف دار۔

الرؤوف:مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

المقسط:انصاف والا، عادل۔

الھادی:راہ دکھانے والا، رہنما

الکافی:اپنے بندوں کی ہرضرورت کے لئے کافی

المجیب:قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا

الحلیم:بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا

التواب وقابل التوب : توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگزر کرکے دوبارہ اس کی طرف رجوع کرنے والا

الحنان:ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا

المنان:احسان کرنے والا

النصیر: مدد کرنے والا

ذوالطول:کرم والا

ذوالفضل:فضل والا

الکفیل:بندوں کی کفالت کرنے والا

الوکیل:بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا

المقیت:روزی پہنچانے والا

المغیث:فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا

المجیر:پناہ دینے والا

المغنی:بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا

صفات جلالی

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔

الملك والمليك:بادشاہ، فرمانروا۔

العزیز:غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

القاھروالقھار :جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جاسکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

المنتقم:سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

الجبار :جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کرسکے۔

المھیمن:سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

المتکبر:اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شدیدالعقاب:سخت سزا والا۔

شدیدالبطش:بڑی گرفت والا، جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

صفات کمالی

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ یہ ہیں۔ صفات وحدانیت یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ یہ ہیں:

الواحد:۔ایک۔

الاحد:۔ایک۔

الوتر: طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

صفات وجودی

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقاء ودوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی۔

الموجود: وجود والا، ہست۔

الحی: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

القدیم: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

القیوم: جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الباقی: جس کو ہمیشہ بقا ہے

الدائم: ہمیشہ رہنے والا

الاول:۔ وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

الآخر: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

المقدم: جو سب سے آگے ہے۔

الموخر: جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

الظاھر: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)۔

الباطن: جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)۔

علم

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

الخبیر: خبر رکھنے والا۔

العلیم: جاننے والا۔

علام الغیوب: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

علیم بذات الصدور: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السمیع: سننے والا۔

البصیر: دیکھنے والا۔

المتکلم: بولنے والا، اور اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

الواجد: پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

الشھید: حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔

الحسیب: حساب کرنے والا، یعنی چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار، ان کا بھی جاننے والا۔

المحصی: گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد کا جاننے والا۔

المدبر: تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

الحكيم: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

المريد: ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

القريب: نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

الفاتح والفتاح: ہر مشکل کو کھولنے والا۔

القدير والقادر: قدرت والا۔

المقتدر: اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا۔

القوي: زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

المتين: مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

الجامع: جمع کرنے ولا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کا اکٹھا کرنے والا۔

الباعث: اٹھانے والا، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول۔

مالك الملك: سلطنت کا مالک، جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

البديع: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

الواسع: سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

المحيط: احاطہ کرنے والا، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

المحي والمميت: جلانے والا اور مارنے والا۔

القابض والباسط: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

المعز والمذل: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

الخافض والرافع: نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

المعطي والمانع: دینے والا اور روک لینے والا۔

النافع والضار: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا، یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

المبدئ والمعيد: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا، اور جو ہو کر فنا کر دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

تنزیہہ:

یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور عیب و نقصان سے اس کی براءت کو ظاہر کرتی ہیں:

العلي: مرتبہ والا۔

الكبير: بڑا۔

الجليل: بزرگ۔

الغني: بے نیاز۔

الماجد: عزت والا۔

القدوس: پاک۔

الجميل: اچھا۔

العدل: عادل۔

الصمد: بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔

العظيم: عظمت والا۔

الرفيع: بلند۔

الكريم: شریف۔

الصادق: سچا، راست باز۔

الحمید: تعریف والا۔

الحق: سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔

البر: نیک۔

سبوح: ہر عیب سے پاک۔

الرشید: ۔سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۲۶۱۔۲۶۷۔

اسماءِ قرآن

قرآن

قرآن کا مشہور تر اور حقیقی نام قرآن ہے اور خود قرآن کہتا ہے کہ میں قرآن ہوں: " إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ "[واقعہ:۷۷] (بے شک یہ کتاب بزرگ قرآن ہے)، بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ :[بروج:۲۱] (بلکہ یہ کتاب قرآن مجید ہے)۔اسی طرح قرآن مجید میں ساٹھ مرتبہ قرآن کا بلفظہ قرآن ذکر ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی نام قرآن ہے۔ جارج سیل صاحب جو مترجم قرآن ہیں کہتے ہیں کہ قرآن عبرانی لفظ ہے، یہود پہلے یحمیا نبی کی کتاب کو قراء یا مقراء کہتے تھے، اور پھر مجموعہ تورات کو قراہ، اور مقراہ کہنے لگے، قرآن اسی قراہ یا مقراہ سے بنایا گیا ہے۔(۱)

ہم کہتے ہیں کہ قراہ یا مقراہ کے عبرانی میں پڑھنے کے معنی ہیں، جس کے مقابل اور ہم جنس عربی میں لفظ قرأت ہے، اسی بناء پر قرآن مجید کا نام اگر عبرانی قراہ سے ماخوذ ہوتا تو اس کا نام قرآن نہ ہوتا۔ قراءۃ ہوتا۔ گو اس میں شک نہیں کہ بعض علمائے اسلام بھی قرآن کو قرأ کا مصدر کہتے ہیں، جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، لیکن یہاں بحث معنی سے نہیں لفظ سے ہے۔

عربی زبان کے ائمہ لغت لفظ قرآن کی تحقیق میں مختلف الآراء ہیں، سب سے پہلا اختلاف یہ ہے کہ قرآن کا صحیح تلفظ قرآن بروزن فعلان ہے، یا قُران بروزن فعال ہے۔ جو گروہ شقِ ثانی کا طرفدار ہے اس کی بھی دو جماعتیں ہیں، امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ صحیح قرأت قران بروزن فعال ہے اور نیز قران کسی مصدر یا اصل سے مشتق نہیں ہے، بلکہ خدا

(۱) دیباچہ ترجمہ انگریزی قرآن مع نوٹ نمبر ۱۔ باب ۳

نے یونہی ایک لفظ کلام مجید کے نام کے لئے وضع کر دیا ہے۔امام شافعیؒ کی رائے جمہور ائمہ لغت کے خلاف ہے،اس لئے قابل تسلیم نہیں۔تمام کتب لغت میں قرآن کے معنی اور تحقیق موجود ہے۔جس سے اس قول کی پوری تردید ہوتی ہے۔

تمام ائمہ لغت قراء اور مفسرین قرآن بروزن فعلان پڑھتے ہیں اور اس امر پر بھی تقریباً ان کا اتفاق عام ہے کہ وہ نقصان اور غفران وغیرہ کی طرح مصدر ہے۔لیکن اشکال یہ ہے کہ قرآن ازروئے لغت دو لفظوں سے ماخوذ ہوسکتا ہے، پہلا قرأ،قراءۃ وقرآناً ہیں:اس کے معنی پڑھنے کے ہیں،دوسرا قرأ،قرءاً وقرانا ہے،جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ارباب علم نے دونوں راہیں اختیار کی ہیں اور لفظ قرآن کی تحقیق کے متعلق درحقیقت یہی دونوں راہیں درست ہیں۔

پہلے معنی کے طرفدار قدماء میں حضرت ابن عباسؓ اور متاخرین میں لحیان (مشہور لغوی) اور چند اشخاص ہیں۔ان کے نزدیک یہاں مصدر وصف مفعول کے معنی میں ہے۔قرآن کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ یہ بار بار پڑھی جاتی ہے۔اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔دیگر صحیفوں کو تلاوت کا شرف حاصل نہیں ہے۔

قرآن کو دوسرے معنی یعنی جمع کرنے کے معنی میں لینے پر جمہور مفسرین اور ماہرین لغت کا اتفاق ہے اور درحقیقت یہی صحیح بھی ہے۔ذهب أكثرون إلىٰ أنه (أي القرآن) مشتق من القرء وهو الجمع (تفسیر فتح البیان: ج/۱،ص/۳۳) اکثر لوگ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ قرآن قرء سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔

خود قرآن مجید اپنے معنی کی توضیح میں غیر کا محتاج نہیں، وہ اپنے معنی کی توضیح آپ کرتا ہے،خدائے پاک فرماتا ہے:إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ [قیامہ:۱۷] (بے شک اس کا اکٹھا کرنا اور جمع کرنا ہم پر ہے)۔اس سے ثابت ہوگیا کہ قرآن کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔امام راغب اصفہانی نے اس کی توضیح یہ کی ہے کہ قرآن کا نام اس لئے قرآن ہے کہ وہ تمام گذشتہ منزل من اللہ کتابوں کا جامع ہے۔(۱)

(۱) مقالات قرآن: ج/۳،ص/۵۵تا۶۳

فرقان

قرآن مجید نے دو جگہ اپنے کو فرقان سے یاد کیا ہے۔ایک سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ [فرقان:۱] (پاک ہے وہ ذات جس نے فرقان کو اپنے بندے پر نازل کیا۔) دوسرے سورۂ توبہ میں: وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ [آل عمران:۳-۴] (اور تورات اور انجیل کو اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا، اور فرقان کو نازل کیا)۔ہمارا اعتقاد ہے کہ قرآن اپنے ہر معنی کی تفصیل آپ کرتا ہے،اس لئے فرقان کے معنی بھی خود فرقان میں ڈھونڈھنا چاہئے، یہ ظاہر ہے کہ فرقان مصدر ہے، اب اس کے مشتق معنی قرآن مجید میں دیکھو۔سورۂ مرسلات:فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا ۔فارق کے معنی فیصلہ کن اور ممیّز کے ثابت ہوتے ہیں۔سورۂ انفال میں :یوم الفرقان آیا ہے۔فرقان کے معنی میں یہاں بھی فیصلہ کرنے اور حق و باطل میں تمیز دینے کے ہیں۔

فرقان مصدر ہے،عربی زبان میں مصدر اکثر اسم فاعل کے معنی بھی دیتا ہے۔یہ آیت "يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِن تَتَّقُواْ اللّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَاناً" [اَنفال:۲۸] اے ایمان والو! اگر خدا سے ڈروگے تو تمہارے لئے فرقان بنا رہے گا۔یہاں مصدر "فارق" کے معنی میں ہے جو اسم فاعل ہے، چنانچہ اس کے معنی فیصلہ کن یا حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی قوت اور ممیّز یا قوت ممیّزہ کے ہیں۔

ان تمام آیتوں سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ گئی کہ فرقان کے معنی فیصلہ کرنے یا فیصلہ کرنے والے کے ہیں۔جب کسی کتاب کو فرقان کہا جائے گا تو اس کے معنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی کتاب کے ہوں گے۔تمام قرآن مجید میں فرقان کا لفظ تورات اور قرآن کے سوا کسی نبی کے صحیفہ کے لئے نہیں آیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ تورات اور قرآن کے سوا تمام صحف انبیاء صرف اخلاقی اور روحانی احکام پر مشتمل ہیں ۔تورات اور قرآن مجید میں اخلاق اور روحانیت کے علاوہ قانون اور لاء کا ذکر بھی ہے۔یہی وجہ ہے

کہ فرقان کا نام خدا نے صرف ان صحیفوں کو عطا کیا ہے جو قانون پر مشتمل ہوں۔لیکن چونکہ قرآن میں قانون کے ساتھ اخلاقی احکام بھی بکثرت ہیں اور تورات میں بھی قانون کے ساتھ ساتھ کسی قدر اخلاق کی تعلیم ہے، اس لئے تورات اور قرآن کو فرقان کے ساتھ ہدی اور ضیاء بھی خدا نے فرمایا ہے۔سورۂ انبیاء میں تورات کے متعلق ہے: وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً [انبیاء:۴۸] (اور بے شک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ اور روشنی دی)۔ فیصلے سے مراد قانون اور روشنی سے مراد اخلاقی اور روحانی احکام ہیں۔دوسری آیت قرآن کی شان میں ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ" [بقرہ:۱۸۵] (ماہ رمضان جس میں لوگوں کی ہدایت کیلئے قرآن اتارا گیا اس حال میں کہ وہ نشانیاں ہیں، ہدایت اور فیصلے کی)۔ھدی سے مراد اخلاقی اور روحانی تعلیمات اور فرقان سے قانون ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ اور سمجھنے کے لائق ہے کہ تورات کی تعریف میں فرقان یعنی قانون کا لفظ پہلے آیا ہے اور ضیاء یعنی روشنی کا لفظ بعد کو آیا اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تورات کا مقصود اول قانون اور مقصود ثانی اخلاق ہے، لیکن قرآن کی تعریف میں پہلے دوبار ہدی یعنی ہدایت کا لفظ آیا، اور آخر میں اس کو فرقان یعنی قانون کہا گیا، اس سے کنایۃً یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ روحانیت اور اخلاق قرآن کا مقصد اولین اور قانون وملک داری اس کا مقصد دوم ہے۔(۱)

ومهيمنا عليه

اس دین کامل کا صحیفہ (قرآن) تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے۔ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ [مائدہ:۴۸] (اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا)۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے، اس لئے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت

(۱) (مقالات سلیمان ج/۳،ص/۴۶۔۵۱)

قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا: وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ [مائدہ:۱۴۸]

(اور ہم نے (اے محمد (ﷺ)) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اس پر شاہد وحاوی ہے۔

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے:

ابن عباسؓ: شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہؒ: قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔(۱)

وإنا له لحافظون

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی، اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا، پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی، زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا، اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے، ان کی کتابوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اللہ تعالی نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا، اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی اور محفوظ رہے گا، اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالی نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ [حجر:۹] (ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا، بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے)، یہ وعدہ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے: إِنَّ

(۱) سیرۃ النبی: ج ۳۲۴/۴

عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَه [قیامہ:۱۷۔۱۸] بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا اور اس کا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا، اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ وعبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے، تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا: وإنه لكتاب عزيز لايأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه، تنزيل من حكيم حميد [حم سجدہ:۴۱۔۴۲] (اور بے شک یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے، جو غالب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے، اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت اور خوبیوں والے کی طرف سے اترا)، اس کتاب کو غالب فرمایا گیا جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کر دے گی، باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے، اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ وعبارت کی طرف سے، اور نہ معنی وحقیقت کی جہت سے، کیوں کہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اس لئے وہ اپنی حکمت ودانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی، اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے، اس لئے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی، یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے، اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی:۴/۳۲۵

اعلام القرآن

لقمان

حضرت ہود نے مع اپنے متبعین وصالحین عاد کے عذاب سے نجات پائی، روایات عرب میں ہے کہ وہ عذاب سے پہلے عاد کی آبادی سے نکل کر حجاز چلے گئے تھے، پھر ان میں لقمان نام ایک نیک بادشاہ ہوا، اس کی عمر کئی سو برس بیان کی گئی ہے، یہ لقمان کون تھا؟ روایات عرب میں ایک شخص لقمان مشہور ہے، جس کو لوگ اب عموماً حکیم لقمان کہتے ہیں، اس کی طرف حکایات وتمثیلات حکیمانہ کثرت سے منسوب ہیں۔ قرآن مجید میں بھی لقمان کا تذکرہ ہے، اور اس کے بعض نصائح کا حوالہ بھی، ہم ان دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں اور اس اتحاد کی ہمارے پاس ایک قدیم شہادت بھی موجود ہے، (سیرت ابن اسحٰق) عام طور سے لوگ غلطی سے لقمان عاد اور لقمان حکیم کو دو سمجھتے ہیں، عرب کے افسانہ گو کہتے ہیں کہ لقمان حکیم افریقی الاصل تھا، اور ایک غلام کی حیثیت سے عرب میں آیا تھا، بعض علمائے یورپ حکیم لقمان اور ایسپ نام ایک یونانی حکیم کو ایک قرار دیتے ہیں، اس اتحاد کی جو دلیل وہ پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان دونوں کی طرف جو حکایات وتمثیلات منسوب ہیں وہ تقریباً ایک ہی قسم کے ہیں، لیکن یہ ایک تعجب انگیز استدلال ہے، کسی دو تصنیف کے مطالب کا اتحاد ان کے مصنفین کے اتحاد شخصیت کو اگر مستلزم ہے تو افسوس ہے کہ اس جرم میں ہم کو سینکڑوں تاریخی اشخاص کے مٹ جانے کا افسوس ہوگا۔

عرب کے ایک جاہلی شاعر سلمٰی بن ربیعہ کے شعر میں لقمان کا نام آیا ہے، اس سے لقمان کا نہ صرف عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے، بلکہ ایک قبیلہ کا مالک یمن کا باشندہ اور عظمت وشوکت

میں ''سبا'' کا مقابل اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔عرب میں لقمان نہایت مشہور تھا، اس کا صحیفۂ حکمت خود عرب میں موجود تھا اور لوگ اس کو پڑھتے تھے (ابن ہشام ذکر سوید وبیعت عقبہ)، عاد کا ایک کتبہ جو ۱۸۳۶ء میں ملا تھا، اس میں چند حسب ذیل فقرے ہیں:

''ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے اور ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے، اچھے فیصلے اس کتاب میں لکھے جاتے تھے''۔

کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں، یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفۂ لقمان، لقمان کے ''اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے ہوئے'' تھے۔

اس نیک دل بادشاہ کا جو ہود کی شریعت کا متبع تھا، قرآن نے بھی ذکر کیا ہے، اور اس کی نیکی اور دانائی کی شہادت دی ہے، [سورہ لقمان: ۱۲۔۲۰]۔ کتاب التیجان (قلمی) کتب خانہ بانکی پور ص: ۷۰ میں ہے کہ شداد بن عاد جب مر گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی، خدا نے لقمان کو وہ کچھ دے رکھا تھا جو کسی دوسرے کو اس زمانہ میں نہیں دیا تھا، اس کو حواس سو آدمیوں کے برابر خدا نے دیئے تھے اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ وہ بلند قامت تھا۔(۱)

صالح

ثمود کے پیغمبر کا نام صالح تھا، توراۃ میں ارم کے بھائی ارفخشد کے ایک بیٹے کا نام سالح ہے، جو تمام اولاد ابراہیم اور عرب یقطانی کا باپ ہے [تکوین ۱۰۔۲۴]

حضرت صالح اور قوم ثمود کا مفصل ذکر اعراف: ۷۳۔۷۸، شعراء: ۱۴۱۔۱۵۹، نمل: ۴۵۔۵۳، ذاریات: ۴۳۔۴۵، قمر: ۲۳۔۳۱، نجم: ۵۰۔۵۱، شمس: ۱۱۔۱۵، ھود: ۶۱۔۶۵۔ ۶۸، حم سجدہ: ۱۷۔۱۸، نمل: ۵۳) میں ہے۔(۲)

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۱/ ۱۴۹۔۱۵۰

(۲) تاریخ ارض القرآن: ج ۱/ ۱۵۵

آزر

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر مذکور ہے: اذ قال ابراھیم لابیہ آزر' [انعام: ۷۴] اور بائبل میں تارح اور ترح مذکور ہے۔اس اختلاف نے بہت سے علمی جاہلوں کے لئے اعتراض کا موقعہ پیدا کر دیا ہے۔سب سے اول یہ جاننا چاہئے کہ تورات اور قرآن میں کم از کم ۲۰۰۰ ربرس کا فصل ہے، اصل تورات کی زبان عبری تھی، یہودیوں کے سیاسی انقلابات کے ساتھ ان کے مذہب کی زبان بھی بدلتی رہی، موجودہ عبرانی توراۃ اصل عبری نہیں، آرامی یا یونانی کا ترجمہ ہے۔ان حالات کے ساتھ اس فصل زمانہ کے باوجود اس اختلاف السنہ کے الٹ پھیر میں اگر نام مختلف قوموں اور زبانوں میں کچھ سے کچھ ہو جائیں تو کیا کوئی محل اعتراض ہے۔انگریزی بائبل کے ناموں کا تلفظ بالکل یونانی اور لاطینی ہے، جو اصل عبرانی سے بمراحل دور ہے، لیکن کیا یہ اختلاف حرف گیری کا مرکز بن سکتا ہے، مسیح یورپ کا خدا ہے، تاہم اس کا جو نام یورپ کی زبان میں مستعمل ہے وہ اصل سے کہاں تک مطابق ہے۔اصل عبری نام ایشوع ہے، جو مخفف ہو کر یشوع ہو گیا۔یونانی میں یونانی طریق تلفظ پر ''جیسیوس'' ہو گیا، لاطینی میں یہ صرف ''جیزس'' رہ گیا اور اب تمام یورپ میں یہی حضرت مسیح کا نام ہے۔

مسیح کے استاد کا نام عبرانی میں یحنا، لاطینی میں جان اور عربی میں یحیی ہے، اسی طرح تمام عبرانی پیغمبروں کے ناموں کا مختلف زبانوں میں یہی حال ہے۔

اس اعتراض سے ہمارے مفسرین بھی واقف تھے۔امام طبری، قاضی بیضاوی، زمخشری، اور رازی نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ان جوابات کا تمام تر مدار سدی اور مجاہد کے اقوال ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) آزر حضرت ابراہیمؑ کے باپ تارح کا دوسرا نام تھا۔جس طرح حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔

(۲) آزر تارح کا نام نہیں، لقب یا وصف تھا۔

(۳) آزر تارح کے بت کا نام تھا۔

ان جوابات کا دوسرا اور تیسرا نمبر تقریباً صحیح ہے۔ تارح بابل کا باشندہ تھا، ایرانی مذہب، ایرانی زبان، ایرانی حکومت، اسی بابل کی یادگار ہے اور خود اہل عجم کو اس کا دعویٰ ہے۔ آزر قدیم ایرانی زبان میں آگ کو کہتے ہیں۔ آگ ستارہ مریخ کا مظہر ہے، اس بناء پر مریخ کو بھی آزر کہتے ہیں، آگ اور ستارہ مریخ ایرانیوں کا مسجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابل کے قدیم بت پرستوں میں بھی اس کی پرستش جاری ہوگی اور اسی سے منتقل ہوکر آزرگسپ ایک فرشتہ موکل کا نام قرار پایا۔ عجب نہیں اگر قدیم بابل میں موبد یعنی پرستار آتش خانہ کا آزر کے انتساب سے کوئی نام یا لقب قرار پایا ہو، اور عربی میں آکر صرف آزر رہ گیا ہو، بہرحال یہ قیاس ہے۔ (۱)

اسماعیل

اسماعیل عبرانی میں ''شماع ایل'' ہے، شماع (سماع) سننا، اور ایل (اللہ) لفظی معنی خدا کا سننا، خدا نے چونکہ ابراہیم کی دعا اور ہاجرہ کی فریاد سنی، اس لئے بچہ کا نام شماعیل پڑا، ۹۹ برس کی عمر میں حضرت ابراہیم کو سارہ کے بطن سے بھی ایک فرزند کے تولد کی بشارت ملی۔ (ایضا: ج ۲/۳۳۔۴۴) تورات میں ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑا، اس وقت ان کی عمر ۱۵۔۱۶ سے کم نہ ہوگی اور یہ بھی آیا ہے کہ ابراہیم صبح کو اٹھا، اور روٹی لی، اور پانی کا مشکیزہ اور ہاجرہ کو دیا اس کے کندھے پر رکھ کر اور اسماعیل کو (تکوین: ۲۱۔۴۱)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل کو کندھے پر رکھ کر لے گئے، چنانچہ ان کا شیر خوار ہونا ثابت ہوا، مسلمانوں میں عام طور سے مشہور ہے۔ اور بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ (اسماعیل علیحدگی کے وقت) شیر خوار بچے تھے، اصل یہ ہے کہ خود توراۃ میں اس موقع پر جو فقرہ ہے وہ نہایت مشتبہ ہے، قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیل علیحدگی سے پہلے سن تمیز کو پہنچ گئے تھے: حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی کہ ''رب

(۱) مقالات سلیمان: ج/۳، ص/۱۹۲۔۱۹۶

هب لي من الصالحين فبشرناه بغلام حليم، فلما بلغ معه السعي، قال: يابني إني أرى في المنام أني أذبحك فانظرماذاترىٰ، قال: يأبت افعل ما تؤمرستجدني إن شاء الله من الصابرين.....وبشرناه باسحاق نبيا من الصالحين، وباركنا عليه وعلىٰ إسحاق "[صافات:۱۱۲]

(پروردگار! مجھ کو نیک فرزند عطا کر، ہم نے اس کو ایک متحمل مزاج فرزند کے تولد کی بشارت دی، لڑکا جب اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑے، باپ نے کہا: فرزند من! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، دیکھو تم کیا سمجھتے ہو، بیٹے نے کہا: میرے باپ جو حکم کیا گیا ہے کر گزرو، مجھے صابر پاؤ گے.....اور ابراہیم کو اسحاق کی بشارت دی کہ پیغمبر ہوگا اور نیکوں میں سے۔)

ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کو دو بیٹوں کی بشارت دی گئی ہے، پہلے بیٹے کا نام مذکور نہیں ہے، دوسرے کا نام اسحٰق مذکور ہے، اس لئے پہلی بشارت میں لامحالہ اسماعیل مراد ہوں گے، اس بنا پر نص آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیل باپ ہی کے زیر سایہ اسحٰق سے بہت پہلے سن رشد کو پہنچ چکے تھے، دوسری جگہ قرآن میں (سورۂ ابراہیم میں) جہاں وہ دعا مذکور ہے، جو اسماعیل کو مکہ میں آباد کرتے ہوئے انہوں نے کی تھی: ربنا انی أسكنت من ذريتي بوادغيرذي ذرع، اس کے آخر میں ہے: الحمدلله الذي وهب لي على الكبر اسماعيل واسحاق (شکر ہے خدا کا، جس نے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحٰق مجھ کو بخشے)۔

اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیل کے مکہ آنے کے وقت اسحٰق پیدا ہو چکے تھے، توارت سے ثابت ہے کہ اسماعیل، اسحاق سے تیرہ برس بڑے تھے، بخاری کی کتاب الرؤیا اور کتاب الأنبیاء میں حضرت ابن عباسؓ کی جو حدیث اسماعیل کی شیر خوارگی سے متعلق ہے وہ مرفوع نہیں ہے، اس لئے وہ حضرت ابن عباس کے اسرائیلیات میں سے ہے، اور اس کا ثبوت آج بھی موجود ہے۔ (۱)

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲ ص: ۳۳۔۳۵

ایوب

سفر ایوب (مجموعہ توراۃ کا ایک جز) عبری میں حضرت ایوب کا نام ''اوب'' ہے۔لیکن عرب ان کو''ایوب'' کہتے ہیں،ادوم کے شیوخ یا سلاطین میں تیسرا نام''یوباب بن زارح'' ہے،قدیم وجدید،مسلم وغیر مسلم دونوں تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ''یوباب''اور''اوب''یا ''ایوب''ایک ہی نام ہے اور یہ اختلاف محض تغیر ہی کا نتیجہ ہے،آپ کا مسکن بُصری تھا۔

حضرت سارہ کی اولاد میں ادوم تھے،ان کی ایک نسل کا نام''عوض'' تھا،حضرت ایوب عوض بن ادوم کی نسل سے تھے،قرآن میں حضرت ایوب کا ذکر ہے،لیکن چند مجمل اشارات کے سوا کوئی تفصیل نہیں ہے،مفسرین نے جو تفصیل نقل کی ہے،وہ وہب بن منبہ اور دیگر اسرائیلی مسلمانوں سے جو قرن اول میں موجود تھے،منقول ہے،قرآن مجید میں حضرت ایوب کا نام چار سورتوں میں آیا ہے،نساء،انعام،انبیاء،اورص۔نساء اور انعام میں صرف نام ہے،"وعیسیٰ وأیوب" (نساء)وأیوب ویوسف (أنعام)سورۂ انبیاء اور سورۂ ص میں کسی قدر تفصیل ہے:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَى لِأُولِي الْأَلْبَابِ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثاً فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِراً نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ [انبیاء:۴۱۔۴۴](ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو،جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھ کو شیطان نے تکلیف اور عذاب کے ساتھ چھوا۔(اے ایوب)اپنا پاؤں مار،یہ غسل کرنے کی ٹھنڈی جگہ ہے اور پینے کا پانی ہے اور ہم نے اس کو اپنے اہل وعیال دئے اور ان ہی کے برابر اور اپنی رحمت سے اور عقلمندوں کی یادگاری کے لئے،(ایوب)اپنے ہاتھ میں تنکوں کا مٹھا لو اور اس سے مارو،اور اپنی قسم نہ توڑو،ہم نے ایوب کو صابر پایا،کیا اچھا بندہ توبہ کرنے والا ہے)

اس موقع پر شیطان سے کیا مراد ہے؟ دوسری آیت کریمہ نے اس کی تفصیل کردی ہے:وأیوب اذ نادیٰ ربہ انی مسنی الضرّ وأنت أرحم الرٰحمین، فاستجبنا له فکشفنا ما به من ضُر وآتیناه أهله ومثلهم معهم رحمة من عندنا وذکریٰ للعٰبدین[ص:۸۳۔۸۴]۔(اور ایوب کو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھ کو بیماری نے چھوا اور تو مہربانوں میں بڑا مہربان ہے،ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کی بیماری دور کی اور اس کو اس کے اہل وعیال دئے اور ان کے برابر ان کے ساتھ اور اپنی رحمت سے عبادت گزاروں کی یادگاری کے لئے)۔

ان آیات پاک کے متعلق تین امور قابل ذکر وبحث ہیں:

اول: وخذ بیدك ضغثا فاضرب به ولاتحنث[ص:۴۴](اپنے ہاتھ میں جھاڑو لو اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو)۔

اس آیت میں اس کا ذکر نہیں کہ کس کو مارو؟ اہل تفسیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ کی بیوی نے جب خدا کی شان میں گستاخی کی تو انھوں نے غضبناک ہوکر قسم کھائی تھی کہ اگر اچھا ہوا تو تم کو سو لکڑی ماروں گا، بیوی صادق الایمان تھی، اور یہ لغزش ایک وسوسہ شیطانی تھا،اس لئے معاف کی گئی، اور قسم پوری کرنے کے لئے سو تنکوں یا تیلیوں کی جھاڑو سے ان کو ایک بار مار لینے کا حکم دیا گیا۔

سفر ایوبؑ میں اس گستاخی اور کلمہ کفر کا ذکر ہے(سفر ایوب:۲۔۹) لیکن اس سزا اور اس سزا کی نوعیت کا بیان رہ گیا ہے، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ خدا کے نیک وصالح بندے اپنے اعزہ سے کلمہ کفر سن کر بے تاب کیوں کر نہ ہوجائیں اور کیوں کر سزا نہ دیں؟ اس نقص کی تکمیل قرآن نے کردی جو دنیا میں صرف تکمیل ہی کے لئے آیا ہے:ارکض برجلك هذا مغتسل باردشراب[ص:۴۲](اپنے پاؤں سے مارو، یہ نہانے کی ٹھنڈی جگہ ہے اور پینے کا پانی ہے)۔

سفر ایوب میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حضرت ایوب کس طرح اور کس علاج سے صحت یاب

ہوئے، قرآن بتاتا ہے کہ خدا نے ان کو ایک چشمہ کا نشان بتایا، جس میں نہانے سے اور اس کے پانی کے پینے سے بیماری جاتی رہی، یہ طریقۂ علاج بالکل مطابق فطرت ہے، طبعی چشمے جو طبقات ارضی یا پہاڑوں سے بعض اجزائے کیمیاوی کے مخزن سے گزر کر ابلتے ہیں، مخصوص خواص رکھتے ہیں، اور دنیا کے اکثر ممالک واکناف میں اب بھی خدا نے اپنا یہ چشمہ جاری کر رکھا ہے، جس سے اس کی ہزاروں مخلوق ہر موسم میں مستفید ہوتی ہے۔(۱)

مریم بنت عمران واخت ہارون

مریم قرآن مجید کے دیگر مقدس ناموں کی طرح عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی ''ستارۂ بحر'' کے ہیں، بائبل میں یہ دو عورتوں کا نام ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون بن عمران کی بہن کا نام بھی مریم تھا اور حضرت عیسیٰ کی ماں کا نام بھی مریم ہے۔ پرستاران مریم کا بیان ہے کہ قرآن نے ان دونوں شخصیتوں کو ایک سمجھ کر دونوں کے نام ونسب باہم مختلط کر دیئے ہیں۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ کی ماں مریم کو عمران کی بیٹی اور ہارون کی بہن قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ تحریم میں ہے: ''وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا''[تحریم:۱۲] اور سورۂ آل عمران میں ہے ''اذ قالت امرأة عمران[آل عمران:۳۵]'' اور سورۂ مریم میں ہے ''يا أخت هارون''[مریم:۲۸].

تحقیقی جواب تو الگ ہے، لیکن ہم اپنے معترضین سے دست بستہ عرض کریں گے کہ خدارا جو جی چاہے کہئے، مگر اسلام پر ''دو کو ایک اور ایک کو دو'' کہنے کا الزام تو نہ قائم کیجئے۔ اس لا ینحل فلسفہ اعداد کو اپنے ہی تک محدود رکھئے تو بہتر ہے۔ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون کی بہن کا نام بھی مریم تھا اور ان کے باپ کا نام عمران (عبری عمرام) تھا۔ لیکن یہ کیونکر معلوم ہوسکا کہ حضرت مسیح کی ماں مریم کے باپ کا نام عمران اور ان کے بھائی کا نام ہارون نہ تھا۔ حضرت مریم کے خاندانی حالات کے متعلق انجیل میں ایک حرف مذکور نہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا آرٹیکل، میری) ان کے متعلق صرف اسی

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/۳۱

قدر معلوم ہے کہ وہ خداوند کی ماں تھیں۔ پھر وہ کون سی شہادتیں ہیں جن کی بناء پر قرآن مجید کے دعوے کی تردید کی جاتی ہے۔

اسلام پر آج جتنے اعتراضات کئے جاتے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ گو الفاظ کسی قدر بدل جائیں، تعبیر اور طرز ادا میں کتنا ہی فرق آجائے، لیکن مفہوم اور مغز سخن کے لحاظ سے وہ وہی ہیں، جو تیرہ صدی پہلے خود انہی کے برادران ملت کی زبانی بارہا دہرایا جا چکا ہے، چھٹی صدی مسیحی میں بخران جو یمن کا ایک ضلع ہے خالص عیسائی آبادی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہ بن شعبہؓ کو وہاں دعوت اسلام کے لئے بھیجا تھا، وہ بیان کرتے ہیں:

''مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران بھیجا، ان لوگوں نے کہا کہ تم لوگ یہ آیت نہیں پڑھتے، کہ ''اے ہارون کی بہن'' اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ کے درمیان کتنا زمانہ حائل ہے، میں نہ سمجھ سکا کہ ان کو کیا جواب دوں، جب لوٹ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کا اعتراض عرض کیا: فرمایا تم نے یہ نہیں کہا کہ لوگ اپنے پیغمبروں اور گذشتہ بزرگوں کے نام پر نام رکھا کرتے تھے۔ اور آج بھی ہم یہی جواب دیتے ہیں اور یہی کافی ہے۔ (صحیح ترمذی، تفسیر سورۂ مریم)

قرآن مجید نے سورۂ مریم اور سورۂ تحریم دو مقام پر حضرت مریم کے باپ کا نام عمران بتایا ہے، یہ واقعہ ہے۔ اس واقعہ کے خلاف تمام عالم امکان میں کیا شہادت موجود ہے، اناجیل، اعمال، خطوط عیسائیت کے بے پایاں دفتر کے یہی تین اصول ہیں۔ لیکن ان میں یہ کہیں مذکور ہے کہ مریم کے باپ کا نام کیا تھا، بلکہ ہم اور آگے بڑھتے ہیں، کیا ان میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کا باپ کون تھا، ہمارے چیلنج کا ایک قدم اور آگے بڑھتا، کیا ان میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کا کوئی باپ بھی تھا، اور حق بھی یہ ہے کہ ''خداوند کی ماں'' (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا) کے مصنفین لکھتے ہیں: پہلی صدی مسیحی کی کسی تاریخی یادداشت میں ان کے والدین کے متعلق کچھ مذکور نہیں، ان حالات کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنی اولاد کا نام عموماً والدین کے نام سے کسی تناسب کی بنا پر رکھتے ہیں، تو

اگر بیٹی کا نام مریم تھا، تو قرینہ دلالت کرتا ہے کہ گزشتہ مقدس مریم کے باپ عمران کی مناسبت سے ان مریم کے باپ کا نام بھی عمران ہو، اور عجب نہیں کہ اسی تاریخی تناسب کی بنا پر حضرت مریم کے باپ عمران نے اپنی بیٹی کا نام مریم رکھا ہو۔

اخت ہارون میں اخت سے بہن کا رشتہ مراد نہیں ہے، بلکہ استعمال عرب کے مطابق ''ہارون'' سے مراد خاندان اور قبیلہ ہارون ہے۔ بکر، سعد، وائل، اسد، نزار، سے مخصوص اشخاص نہیں بلکہ قبائل وخاندان مراد ہیں، قبائل کی طرف عموماً اہل عرب اخ یا اخت کا لفظ مضاف کرتے تھے تو اس سے مقصود اس قبیلہ کا ایک فرد ہوتا تھا۔ یا أخا قریش۔ جب عرب بولے گا تو شخص قریش کا بھائی مراد نہ ہوگا، بلکہ قبیلہ قریش کے ایک ممبر کو خطاب سمجھا جائے گا۔ حدیث میں ہے "ابن أخت القوم منهم" (قبیلہ کی بہن کے بیٹے کا شمار اسی قبیلہ میں ہوگا)۔ وہ کون طرفۃ العجائب عورت ہوگی جو کل قبیلہ کے قبیلہ کی بہن ہو، اس سے مقصود قبیلہ کی ایک عورت ہے اور بس۔ یہ استعمال عرب میں اس قدر شائع وذائع ہے کہ ذی روح سے نکل کر غیر روح تک کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلا أخا العلم، أخاالجهل وغیرہ۔

لوقا کی انجیل (۳۶-۱) میں ہے کہ الزبتھ حضرت یحیی کی ماں اور حضرت مریم رشتہ دار تھیں، (لوقا: ۵) میں ہے کہ وہ ہارون کی بیٹی تھیں، اس سے واضح ہوگا کہ حضرت مریمؑ بھی خاندان ہارون سے تھی، دیکھو انجیل کی اس اصطلاح میں بھی بیٹی سے حقیقی بیٹی مراد نہیں ہے، ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ انجیل مریم اور حضرت ہارون کو ہم عہد قرار دیتی ہے۔(۱)

عزیر ابن اللہ

قرآن مجید نے عرب کے یہودیوں کے ذمائم اخلاق کو تو کھول کھول کر بیان کیا ہے، لیکن ان کے اعتقاد پر کوئی خاص حملہ نہیں کیا، صرف ایک موقع پر یہ آیت ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰه [توبہ:۳۰] (یہود نے کہا: عزیر خدا کے بیٹے ہیں) عزیر سے مراد عزرا کاھن ہیں، جنہوں نے توراۃ کو اپنے اعجاز سے دوبارہ زندہ

(۱) مقالات سلیمان: ج۔۳، ص۔۲۰۱۔۲۰۶

کیا، معترضین اسلام کا بیان ہے کہ یہودیوں میں عزیر کی ابنیت کا کوئی عقیدہ نہیں ہے، اس لئے قرآن کا یہ دعویٰ سراسر خلاف واقع ہے، اس اعتراض کا سرسری جواب تو جیسا بیضاوی نے لکھا ہے، یہ ہے کہ قرآن نے اپنی یہ آواز مدینہ میں یہودیوں کے مجمع کے اندر بلند کی، کہیں سے ان کی تکذیب اور خلاف واقعیت کی صدا نہ اٹھی، اس سے یہ معلوم ہوا کہ عرب کے یہودیوں میں اعتقاد تھا، ابن جریر طبریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ مدینہ میں اس اعتقاد کے چند لوگ موجود تھے، ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو یمن میں تھا اسی کا یہ عقیدہ تھا۔ (الملل والنحل ج۱/ ۹۹)

میرے نزدیک اصل یہ ہے کہ یہودیوں میں ابنیت کا تخیل نہایت قدیم ہے، تکوین کے چھٹے باب میں ہے کہ ''خدا کے بیٹوں نے دیکھا کہ انسان کی بیٹیاں خوبصورت ہیں'' ابن اللہ کے معنی عبرانیوں کے محاورہ میں خدا کے محبوب اور پیارے کے تھے، اسی لئے مسلمانوں کے مقابلے میں عرب کے یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ تھا: وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاء اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُه [مائدہ:۱۸] (ہم خدا کے فرزند ہیں اور اس کے چہیتے ہیں)۔

ایسی حالت میں یہود عرب اگر عیسائیوں کے مقابلہ میں ان کا غرور توڑنے کے لئے حضرت عزیر کو حضرت عیسیٰ کا مماثل، اور ہمسر قرار دیتے ہوں تو کیا عجب ہے، قرآن نے بھی اسی موقع پر یہودیوں کے اس قول کو نقل کیا ہے، چنانچہ پوری آیت یہ ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتْ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ذَلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ [توبہ:۳۰] (یہود نے کہا: عزیر خدا کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا: مسیح خدا کا بیٹا ہے، یہ ان کا صرف زبانی دعویٰ ہے، یہ اگلے کافروں کی بات کی نقل اتارتے ہیں)۔(۱)

ملائکہ

لفظ ملائکہ کا واحد ملأک ہے جو عربی قاعدے سے ملک ہوگیا ہے، یہ اُلوکہ سے

(۱) تاریخ ارض القرآن ج۲/ ۱۵۱۔

مشتق ہے، جس کے معنی پیغام کے ہیں، اس لئے ملائکہ کے معنی پیغام رساں اور قاصد کے ہیں، ملائکہ الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان قاصد ہیں، قرآن مجید نے متعدد مقام پر ان کو رُسُل اور رُسُل اللہ یعنی قاصدان الٰہی کہا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (حج:۷۵) (خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغام بر منتخب کرتا ہے)، علاوہ ازیں یہ خدا کے حکم سے عالم کی مشینوں کے پرزے کو ہلاتے اور چلاتے ہیں، اور اسی لئے خدا نے ان کو ''مدبرات اُمرا'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے، (سورۂ والنازعات: ۵) ان کی مخصوص صفت یہ ہے کہ وہ خدا کے سراپا مطیع ہیں، اور اس کے کسی امر یا اشارہ سے کبھی روگردانی نہیں کرتے: عَلَیۡهَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ [تحریم:۶] (اس پر سخت اور مضبوط فرشتے ہیں اللہ ان کو جو حکم دیتا ہے وہ اس سے روگردانی نہیں کر سکتے، اور وہ وہی کرتے ہیں، جو ان کو حکم دیا جاتا ہے)۔

انبیاء علیہم السلام کی تمام سیرتیں فرشتوں کی آمد، ان کی بشارت اور نصرت سے معمور ہیں، تورات اور انجیل و قرآن ہر کتاب الٰہی ان کے کارناموں کی شاہد ہے، حضرت آدمؑ کی بارگاہ میں انہوں نے سجدہ کیا، حضرت ابراہیمؑ کے مہمان خانہ میں یہ بھیجے گئے، حضرت لوطؑ کی حفاظت اور ان کی قوم کی بربادی پر یہ مامور ہوئے، حضرت ہاجرہؑ کو بیابان میں یہ نظر آئے، حضرت یعقوبؑ کے خیمہ میں ان کا دنگل ہوا، حضرت ایوبؑ کے مناظرہ جبر و اختیار میں یہ حکم قرار پائے، حضرت زکریاؑ اور مریمؑ کو بشارت انہوں نے دی، آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں بھی یہ مختلف فرائض پر مامور ہوئے، یہ آپ ﷺ کی خدمت میں احکام الٰہی کے قاصد تھے، دشمنوں سے وجود اقدس کی محافظت ان کے سپرد تھی، کمزور اور ناتواں مسلمانوں کی دست گیری ان کا فرض تھا۔(۱)

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد ملک، ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے، اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں، اسی لئے قرآن پاک میں ملائکہ کے لئے

(۱) سیرۃ النبی ج ۳/۱۸۸

رُسل کا لفظ بھی آیا ہے، جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں، ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک، ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالی کے حکم سے عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں، جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں، یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالی اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القاء کرتا ہے، اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں، ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے، وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا ان کی خلقت اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے کی گئی ہے، دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ ہوتا ہے، اور خدا انبیاء پر اپنے جو احکام اتارتا، یا ان سے کلام کرتا ہے۔ وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفے میں بھی اسی قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابئی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں، یونانی مصری (اسکندری) فلسفے میں ان کا نام عقول عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کئے گئے ہیں، بلکہ خالص یونانی فلسفے میں بھی بعض غیر مادی ارواحِ مجردہ کا پتہ لگتا ہے، جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے، جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہلِ فلسفہ عقل اوّل سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ''امشاسپند'' ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے، یہودی ان کو ''کروبیم'' کہتے ہیں، اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں، عیسائی بھی ان کو انہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل و روح القدس وغیرہ لفظ سے تعبیر کرتے

ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیبیوں کے نام سے روشناس ہیں، جاہل عرب اِن کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے، بہرحال یہ تمام مختلف، صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صانع ومصنوعات اور خالق ومخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔(۱)

جبریل

جبریل عبرانی لفظ ہے، جس کے معنی مرد خدا کے ہیں، لیکن یہ اصطلاح شریعت میں اس فرشتہ کا نام ہے جو خدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے۔تورات اور انجیل میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے مستعمل ہوا ہے، چنانچہ دانیال (۸، ۱۶، ۱۹، ۲۱) میں اس کی پیامبری کا اعلان ہے، اسی طرح انجیل (لوقا ۱، ۱۹، ۲۶) میں مذکور ہے کہ وہ حضرت زکریاؑ کے پاس، حضرت یحییٰؑ کی بشارت اور حضرت مریمؑ کے پاس حضرت عیسیٰؑ کی بشارت لے کر آیا تھا۔قرآن مجید نے بتایا ہے کہ وہ پیامبر جو آنحضرت ﷺ اور خدا کے درمیان وحی کا ایلچی تھا وہ یہی جبریل تھا، قرآن مجید میں اس کو روح الامین (امانت دار روح) روح القدس (پاکی کی روح) اور رسول (فرستادہ) بھی کہا گیا ہے، لیکن احادیث اور روایات میں ان الفاظ کے بجائے جبرئیل ہی کا لفظ عام طور سے مستعمل ہوا ہے، صحابہ میں دحیہؓ نام ایک صحابی بہت حسین تھے، جبرئیل اکثر ان ہی کی صورت میں مجسم ہوکر آیا کرتے تھے اور اس حالت میں لوگوں کو کبھی کبھی نظر بھی آجاتے تھے، حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جبرئیل کو آنحضرتؐ نے ان کی اصلی شکل میں دو دفعہ ملاحظہ فرمایا۔ (صحیح بخاری) ایک دفعہ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اور دوسری دفعہ ایک اور مقام پر، وہ آسمان کے کناروں میں نظر آئے، سورۂ نجم میں ہے: ولقد رآہ نزلة أخرى عند سدرة المنتهىٰ، [نجم:۱۴] (اس نے اس کو دوسری دفعہ اترتے دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس)، اور سورۂ تکویر میں ہے کہ " ولقد رآہ بالأفق المبين" [تکویر:۲۳] (اور یقیناً اس کو آسمان

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴/ ۲۸۷

کے کھلے کنارہ میں دیکھا)۔(۱)

میکائیل:

جبرئیل کے علاوہ دوسرے ملائکہ کا بھی آں حضرت ﷺ کی خدمت میں آنا ثابت ہے، قرآن مجید میں جبرئیل کے علاوہ ایک دو اور فرشتوں کے بھی نام آئے ہیں، جن میں سے ایک میکائل ہیں، یہودیوں نے قرآن کے ماننے سے اس لئے اپنا انکار ظاہر کیا تھا کہ یہ جبرئیل کی وساطت سے نازل ہوتا ہے، خدا نے اس کے جواب میں کہا: مَن كَانَ عَدُوّاً لِلّٰهِ وَمَلآئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ [بقرہ: ۹۸] (جو خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا دشمن ہو تو خدا ان کافروں کا دشمن ہے)۔

یہودیوں کے اعتقاد میں یہ عرش الٰہی کے چار مخصوص فرشتوں میں سے ایک کا نام تھا، یہ خاص طور پر اسرائیل اور اس کے خاندان کا محافظ سمجھا جاتا تھا، اور لڑائیوں میں اس کی مدد کیا کرتا تھا، (دانیال: ۱۰۔۱۳۔۲۱) عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہی فرشتہ تھا جو کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوا تھا (اعمال: ۷۔۳۸)

میکائلؑ بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوئے ہیں، معراج کے موقع پر جو دو فرشتے آئے تھے، وہ جبرئیل اور میکائیل تھے، اسی طرح غزوۂ احد میں جو دو فرشتے دشمنوں سے آپ ﷺ کی حفاظت کرتے تھے، وہ بھی جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے جبرئیل اور میکائیل تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت کے ابتدائی تین سالوں میں میکائیل ہی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔(۲)

جن

عربی میں ''جن'' کا لفظ ''جن'' سے مشتق ہے، جس کے معنی چھپنے اور چھپانے

(۱) سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۸۸۔۱۹۳
(۲) سیرۃ النبی ج ۳/ ۱۹۴

کے ہیں، چونکہ یہ مخلوق انسانوں کی آنکھوں سے عموماً مستور رہتی ہے، اس لئے اس کو ''جن'' کہتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ یہ لفظ اسی معنی میں یا اسی کے قریب مختلف قوموں کی زبانوں میں پایا جاتا ہے، فرنچ میں جِنی (GENEE) اور انگریزی میں جینائی (GENEI) اسی مفہوم میں ہے، جس میں عربی میں جون (دیو، بھوت پلیت) ہے، لاطینی میں جینوس (GENIUS) اور جینی وہ مفہوم رکھتا ہے جو ہمارے یہاں ہمزاد کا ہے اور روح نوعی کے معنی میں بھی یہ لفظی رومی اساطیر (میتھالوجی) میں مستعمل ہوا ہے، فارسی میں ''جان'' کے معنی مطلق روح کے ہیں۔ بہرحال دنیا کی قوموں میں یہ اعتقاد کسی نہ کسی حیثیت سے موجود رہا ہے کہ انسانوں کے سوا اس سطحِ ارض پر ایک اور غیر مرئی مخلوق بھی موجود ہے، یورپ کے موجودہ دورِ الحاد میں ارواح سے نامہ و پیام اور اُن کے عمل و تسخیر کے کارنامے بڑے بڑے فلسفیوں اور مادہ پرستوں کو آئینہ حیرت بنائے ہوئے ہیں، اور روز بروز اُن کے انکار اور شک کی جرأت کم ہوتی چلی جاتی ہے، اسلام کے علاوہ دوسری مسلّم مذہبی کتابوں میں بھی جن اور شیاطین کے تذکرے موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات جو موجودہ انجیل میں مذکور ہیں اُن کی بڑی تعداد انسانوں اور حیوانوں کو اُن کے پنجۂ ظلم سے رہائی ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اُن کی پیدائش انسانوں سے پہلے ہوئی ہے اور آگ سے بنائے گئے ہیں: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ وَالْجَآنَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ [حجر:۲۶۔۲۷] (اور ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا، اور جنوں کو اس سے پہلے لو کی آگ سے پیدا کیا)، وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ [رحمان:۱۵] (اور اس نے جنوں کو آگ کی لو سے پیدا کیا)۔ اسلام سے پہلے عرب میں جنات کا بڑا تسلط تھا، ان کی پوجا کی جاتی تھی (مسلم) ان کی دہائی مانگی جاتی تھی، غرض جس طرح خدائی الوہیت میں عرب کے بہت سے دیوتا اور دیبیاں شریک تھیں، اسی طرح جنات بھی شریک تھے، اسلام آیا تو اس نے ان اعتقادات باطلہ کے تار و پود کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اس نے دنیا میں صرف ایک ہی قوت کی

تعلیم دی، اور وہ خدا کی تھی۔(۱)

نبی

فطرت بشری کے عجز اور بے چارگی کا سب سے بڑا دردناک نظارہ مستقبل سے ناواقفیت اور جہالت ہے، چنانچہ اخبارِ غیب اور پیشین گوئی کی قدرت، نبوت اور رسالت بلکہ عام بزرگی اور ولایت کے ثبوت پر نوعِ انسانی کے عام افراد کے نزدیک ایک دلیل ہیں۔ بنی اسرائیل کے نزدیک یہ وصف، نبوت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ اُن کی زبان میں پیغمبر کا نام ہی ''پیشین گو'' ہے۔ عربی، عبرانی اور دوسری سامی زبانوں میں نبی یا نابی جو پیغمبر کے معنی میں مستعمل ہے اس کے لغوی معنی ''مخبر اور پیشین گو'' کے ہیں اور نبوت کے معنی مخبری اور پیشین گوئی کے ہیں۔ اسی لئے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسی قدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہانِ نادیدہ کا مخبر ہے .... آنحضرت (ﷺ) جب پیغمبر بنا کر عربوں کے درمیان بھیجے گئے تو اُن کے لئے ثبوتِ نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہی اِخبارِ غیب اور پیشین گوئی ہو سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے بیسیوں پیشین گوئیاں کیں اور مستقبل کے واقعات اور باتوں کو رأی العین کی طرح پیش فرمایا اور وہ سب کی سب بے کم وکاست پوری ہوئیں۔(۲)

(۱) سیرۃ النبی: ج۳/۲۹۸۔۲۹۹
(۲) سیرۃ النبی ج۳/۳۷۲۔

اقوام قرآن

عاد

السنہ سامیہ میں لٹریچر کے لحاظ سے عبرانی سب سے قدیم زبان ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی سے زیادہ اس میں محفوظ ہے، لغوی حیثیت سے عربی میں عاد کے کوئی معنی نہیں ملتے، عبری میں عاد کی اصلیت موجود ہے، اس کے معنی ''بلند ومشہور'' کے ہیں، اور عجیب تر یہ کہ ''ارم'' اور ''رشم'' (سام) کے بھی یہی معنی ہیں، ان معنوں کا بقیہ اثر عربی میں بھی موجود ہے، ارم کے معنی پہاڑی اور نشان راہ کے پتھر کے لغت میں مذکور ہیں، اور ''شم'' سے ''شمم'' اور ''سمو'' تو اب تک مستعمل ہیں، توراۃ میں ''عاد'' مذکر کے نام کے لئے اور عادہ عورتوں کے لئے کئی جگہ آیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہ نام عموما مستعمل تھا۔ (تاریخ ایام اول ۷۔۲۱، اور تکوین ۳۶، ۲، وتاریخ ایام اول ۲۰۰۰)۔

عاد کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن وحضر موت میں سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک تھی، دراصل حکومت کا مرکز ملک یمن تھا، لیکن خلیج فارس کے کنارہ کنارہ وہ عراق تک وسیع تھی۔ (۱)

قرآن مجید نے عاد کا جہاں ذکر کیا ہے، اس کو خلفائے قوم نوح کہا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین شام کی دوبارہ آبادی کے بعد بنو سام کی پہلی ترقی عاد سے شروع ہوتی ہے، اس لئے اس آیت سے نہ صرف زمانہ کی تعیین ہوتی ہے، بلکہ ہماری اس تھیوری کی بھی تائید ہوتی ہے کہ امم سامیہ اولیٰ اور علیٰ الأغلب عاد ایک چیز ہے۔ اور اسی لئے قرآن نے ان کو عاد اولیٰ کہا ہے: وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَاداً الْأُولَى [النجم:۵۰] (اسی خدا نے

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج ۱/۱۱۰

عاد اولیٰ کو برباد کیا)۔ عاد کا وجود: ۲۲۰۰/ ق م سے شروع ہوتا ہے، انتہائے مدت کی تعیین کی یہ صورت ہے کہ پندرہ سو ق م میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور معلوم ہوتا ہے۔

عاد کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک عظیم الشان قوم تھی، جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی، ایشیاء اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے زور وقوت کا تماشا گاہ تھا، بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں اس کے دست صنعت کا نتیجہ تھیں، اس بنا پر عرب کے لئے اس قوم سے زیادہ عبرت وبصیرت کا کوئی دوسرا نمونہ نہ تھا، اسی لئے قرآن مجید نے عرب کی اس عظیم الشان قوم کی داستان بار بار دہرائی ہے۔

معلوم ہو چکا کہ عاد ارم بن سام کی نسل سے تھے، قرآن بھی یہی کہتا ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ [فجر:۶۔۸] (تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے خدا نے اس عاد ارم کے ساتھ کیا کیا، جو بڑی بڑی عمارتوں کے بانی تھے، جن کی نظیر دنیا میں نہیں پیدا کی گئی)۔

بعض داستان گو مفسرین نے ''ارم'' سے ایک عجیب الخلقت باغ مراد لیا ہے، جس میں سونے چاندی کی اینٹیں تھیں، اور لعل وگوہر کی پچہ کاری تھی، عاد کے بادشاہ شداد نے اس کو بہشت کے مقابلہ میں بنوایا تھا، لیکن یہ دانشمند یہ نہ سمجھے کہ اس حالت میں عاد اور ارم میں باہمی نحوی تعلق کیا ہوگا؟ مشہور قرأت میں یہ بدل مبدل منہ ہیں، ابن خلدون نے اس موضوع پر ایک محقق بحث مقدمہ میں لکھی ہے، اس موقع پر وہ قابل مطالعہ ہے۔

قوم عاد کی نسبت عام طور سے نہایت لغو باتیں مشہور ہیں، مثلا یہ کہ ان کا قد کئی کئی گز کا ہوتا تھا، یہ شبہ اس لئے ہوا کہ قرآن نے ان کو ذات العماد (ستونوں والے) کہا ہے، اس سے وہ سمجھے کہ ان کا قد ستونوں کی طرح تھا، حالانکہ ''ستونوں والے'' سے مقصود ''عمارتوں والے'' ہے، دوسری جگہ قرآن میں ان کی نسبت ہے: وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً [الأعراف:۶۹] (خدا نے تم کو خلق میں زیادتی بخشی ہے)، بصطۃ سے مقصود زور وقوت ہے، یعنی خدا نے تمہارے بدن میں زور وقوت بخشا ہے، یہی محاورہ دوسری جگہ

حضرت طالوت کی نسبت مستعمل ہوا ہے، وزاده بسطة في العلم والجسم [بقرة:۲۴۷] (خدا نے اس کو بدن میں اور علم میں زیادتی بخشی ہے) اس سے یہ معنی کون سمجھ سکتا ہے کہ طالوت بڑے قدآور تھے، بلکہ مقصود ہے کہ صاحب قوت تھے۔

عاد امم سامیہ کے ہم معنی یا تقریباً ہم معنی ہیں، نیز یہ کہ وہ ایک عظیم الشان حکمراں قوم تھی، قرآن پاک باعلان عام اس کی تصدیق کرتا ہے: وَاذْكُرُواْ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاء مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوح [اعراف:۶۹] (عاد کے لوگ یاد کرو، خدا کے اس احسان کو کہ اس نے قوم نوح کی تباہی کے بعد تم کو خلافت (حکومت) عطا کی)۔ قوم نوح کے بعد عرب اور اطراف عرب میں معلوم ہے کہ نوح کے بیٹے سام ہی کی نسل (امم سامیہ) نے ترقی کی تھی، عاد کو دعویٰ تھا کہ ''مَن أشدُّ منا قوة'' [حم السجدہ:۱۵] ہم سے بڑا روئے زمین پر آج کون ہے؟) ان کے پیغمبر نے کہا: وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْماً غَيْرَكُمْ [ھود:۵۷] (عجب نہیں کہ خدا اپنی خلافت تم سے لے کر کسی دوسری قوم کو عطا کر دے)۔

عاد کا مقام عام روایات میں یمن بتایا گیا ہے، امم سامیہ کے مسکن کے بیان میں کسی خاص مقام کی تعیین نہیں کی گئی ہے، صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود کیا گیا ہے، لیکن قرآن نے ایک موقع پر کہا ہے: وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ [احقاف:۲۱] (برادر عاد کو یاد کرو جب احقاف میں اس نے اپنی قوم کو ڈرایا)، احقاف صحرائے ریگستان کو کہتے ہیں، یہ صحرا جنوبی اور شمالی عرب میں دونوں طرف واقع ہے، اس بنا پر پیغمبر عاد کے مقام بعثت کو جنوبی صحرا (یمن) کے ساتھ تخصیص کا کوئی سبب نہیں ہے۔

اب وہ وقت آ گیا کہ اس عظیم الشان اور عظیم الجبروت قوم کو جس نے اپنے زور قوت سے دنیا کو ہلا دیا تھا، آخر دعوت دی جائے، آخر ان ہی میں ہود مبعوث ہوئے،، جنھوں نے ان کو خدا کی آواز سنائی، ان کا تذکرہ (اعراف:۶۵-۶۹-۷۰-۷۱) (حم السجدہ:۱۵) (احقاف:۲۱-۲۳) (ھود:۵۷) (شعراء:۱۲۳-۱۳۵-۱۳۶-۱۴۰) میں آیا ہے۔

ان آیات پاک میں عاد کی تباہی کے تین اسباب بتائے گئے ہیں، جو ہمیشہ سے

قوم کی تباہی کے باعث ہوئے ہیں:

۱۔ ''غرور قوت'' متکبرین عاد نے کہا: اے ہود! ہمیں کس سے ڈراتے ہو، من أشد منا قوةً [حم السجدہ:۱۵] قوت وزور میں ہم سے کون بڑا ہے۔

۲۔ ''ظلم وجور'' قوم کی حاکمانہ زندگی کے لئے سب سے زیادہ زہر قاتل ظلم اور جور وستم ہے، اور اقوام کی تاریخ اس دعوی پر بہترین شاہد ہے، عاد اپنے ممالک مقبوضہ میں اکڑتے پھرتے تھے، بغیر کسی استحقاق کے قوموں کو چھیڑتے تھے،'' فأمَّاعاد فاستكبروا في الأرض بغيرالحق'' (لیکن عاد نے زمین میں بلا استحقاق غرور کیا) [حم السجدہ:۱۵]

۳۔ سب سے آخری چیز جو انتہائے بربادی عالم ہے، خدائے واحد کا انکار اور معبودان باطل کی پرستش ہے: ھود نے کہا: يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ أَفَلاَ تَتَّقُونَ [اعراف:۶۵] بھائیو! خدا کو پوجو، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، کیا پرہیز گار نہیں بنتے۔

آخر وہ دن آ گیا جب سنت الٰہی نے اپنی زمین کے لئے ایک دوسری قوم کا انتخاب کیا اور اس شریر قوم کو احقاف کے باہر تلوار سے اور احقاف کے اندر ہوا اور ریگ کے طوفان سے برباد کر دیا کہ یہ سب اس کے ہتھیار ہیں، اس کا ہاتھ انسانوں کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی کام کرتا ہے جس طرح ہوا، پانی اور آگ میں۔ فأرسلناعليهم ريحاً صرصراًفي أيام نحسات لنذيقهم عذاب الخزى فى الحيوة الدنيا ولعذاب الآخرة أخزىٰ [حم سجدہ:۱۶] (ہم نے ان پر منحوس دنوں میں بادصرصر بھیجا، تا کہ ہم ان کو عذاب ذلت کا اسی زندگی میں مزہ چکھائیں اور عذاب اخروی سب سے زیادہ ذلت والا ہے)۔ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضاً مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَى إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ [احقاف:۲۴] (جب ان کو بادصرصر کا عذاب ایک بادل کی صورت میں جس کا رخ ان وادیوں کی طرف تھا نظر آیا تو بولے: یہ ہم کو سیراب کرنے والا بادل ہے، نہیں، بلکہ یہ وہ ہے جس کی اے گنہگارو! تم کو جلدی تھی، یہ ہوا ہے

جس میں دردناک عذاب ہے، اپنے خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کردیتی ہے، پھر وہ ایسے نیست ونابود کردئے گئے کہ ان کے گھروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُوماً فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ فَهَلْ تَرَى لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ [الحاقۃ:۶۔۸] (لیکن عاد تو وہ تند باد صرصر سے تباہ کردئے گئے، خدا نے جڑ کاٹنے والی سات رات اور آٹھ دن تک ان پر اس ہوا کو لگا دیا، تم دیکھتے ہو اس ہوا نے اس قوم کو افتادہ ، جیسے وہ کھوکھلے درخت کی جڑ تھے، کیا اب ان میں کوئی تم کو زندہ نظر آتا ہے)۔ وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ [ذاریات:۴۱۔۴۲] (اور عاد میں عبرتیں ہیں جب ہم نے بے فائدہ بخش ہوا کو بھیجا، جو ایسی تھی کہ جس شے پر اس کا گزر ہو جاتا اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح چھوڑتی)۔

مشہور ہے کہ عذاب کے بعد کوئی زندہ نہ بچا، یہ خیال غلط قرآن کی ان آیتوں سے سمجھا گیا ہے،: فَأَصْبَحُوا لَا يُرَى إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ،[احقاف:۲۵] (اور وہ اس طرح ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا)، لیکن یہ تو زمانۂ نزول قرآن کا حال بیان کیا گیا ہے، اس سے دو ہزار برس پہلے کا حال کیا تھا، خود قرآن کہتا ہے: فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا [اعراف:۷۲] (ہم نے ہود کو اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے، اپنی رحمت سے نجات دی، اور جنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی، ان کی جڑ کاٹ دی) آگے چل قرآن نے ہلاک ہونے والوں کو عاد اولی کہا۔ اس سے خود بخود سمجھنا چاہئے کہ نجات پانے والوں کا عاد ثانیہ نام ہے۔(۱)

آلِ ابراھیم

حضرت ابراھیمؑ کی تین بیویاں تھیں: سارہ، ہاجرہ اور قطورا۔

(۱) تاریخ ارض القرآن ج۱/۱۲۲۔۱۴۷۔

سارہ کے بیٹے حضرت اسحاق تھے، اور ان کے دو بیٹے تھے، حضرت یعقوب جو بنی اسرائیل کے باپ تھے، اور عیسو جن کا لقب ادوم تھا، اس سلسلہ میں سے ادوم اپنے بھائی سے الگ ہو کر اپنے چچا اسماعیل کے پاس عرب میں متوطن ہوئے، بقیہ سلسلے مصر وشام میں رہے۔ ہاجرہ کے بطن سے صرف ایک بیٹا ہوا، حضرت اسماعیلؑ، انہوں نے بھی عرب ہی میں اپنے باپ کے حکم سے سکونت کی۔

قطورا کے بطن کی تمام اولادوں کو جن میں ایک کا نام مدین تھا، عرب ہی میں ان کے باپ نے ان کو بسایا۔ ان میں سے بنو مدین اور ودان کے سوا اوروں کا حال نہیں معلوم، ارض القرآن کا دوسرا حصہ صرف ان ہی خاندانوں کی تفصیل پر محدود ہے، اور ان میں سے بھی ان خاندانوں کا ذکر مفصل ہے۔ جن کا ذکر قرآن مجید میں کسی حیثیت سے مذکور ہے:

(۱)۔ بنو قطورا میں سے اہل مدین اور اہل ودان (اصحاب الایکۃ)

(۲)۔ بنو سارہ میں سے ادوم (حضرت ایوب اور ان کی قوم)

(۳)۔ بنو ہاجرہ میں حضرت اسماعیل (انباط (اصحاب الحجر) قیدار اور قریش۔(۱)

ثمود

ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے، ثمد عربی میں ''آب قلیل'' کو کہتے ہیں، لیکن اس سے کوئی خاص مناسبت نہیں معلوم ہوتی، عبری میں ایک لفظ تامید۔۔۔ ہے، جس کے معنی دائم اور خالد کے ہیں، عربی کی ''ث'' اور عبری کی ''ت'' ایک چیز ہے، عبری میں ''ث'' نہیں ہے، اس لئے اکثر وہ الفاظ جو عربی میں ''ث'' سے ہیں، عبری میں ''ت'' ہیں، اس بنیاد پر ثمود کے معنی عام سامی زبان میں وہی ہوں گے جو عربی میں خالد کے معنی ہیں اور بہت سے قبائل عرب کے نام ہیں، عاد عرب جنوبی ومشرقی کے جو ساحل خلیج فارس کے ساتھ ساتھ حدود عراق تک وسیع تھے، ثمود اس کے مقابل عرب مغربی وشمالی پر قابض تھے، جس کا نام اس زمانہ میں وادی القری تھا، وادی القری اس لئے کہتے ہیں کہ اس عہد

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۱/۲۔

قدیم میں یہ وادی چھوٹی چھوٹی آبادیوں سے جا بجا آباد تھی، ان آبادیوں کے سنگی کھنڈر اور آثار جغرافیین اسلام نے دیکھے تھے (معجم یاقوت ج ۸/ ۲۷۵)۔ اور اب بھی باقی ہیں، قرآن نے سورۂ فجر میں وادی سے اسی وادی القری کو مراد لیا ہے: وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ [فجر:۹] (اور ثمود جو وادی میں (بغرض تعمیر) پتھر تراشا کرتے تھے)۔

ثمود کے ملک کا دارالحکومت حجر تھا، یہ شہر اس قدیم راستہ پر واقع ہے، جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ اسی راستہ پر ثمور کا ایک دوسرا مقام ''فج الناقہ'' ہے، جس کو یونانیوں نے بہ تلفظ Badncitu لکھا ہے، لیکن اصلی شہر حجر ہی تھا، اب عموماً اس شہر کو مدائن صالح کہتے ہیں۔ قوم ثمود کے سیاسی حالات بالکل نہیں معلوم، صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی، فن تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا، پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا پتھروں کے عمارات ومقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا، یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ (معجم یاقوت حموی، لفظ وادی القری ج ۸/ ۲۵۷)

قرآن مجید نے ان کی عظمت تعمیر کا متعدد آیات میں ذکر کیا ہے: (الفجر:۹، الأعراف:۷۴، شعراء:۱۴۹، مؤمن:۳۱) ثمود نے خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر ستاروں کے مادی ہیکلوں کے سامنے سر جھکایا، ثمود کے طریقہ ہلاک کو کہیں خدا نے صرف عذاب کہا ہے، کہیں صاعقہ (بجلی کی کڑک) اور کہیں صیحۃ (چیخ) سے ادا کیا ہے، اس سے کوئی خاص طریقہ عذاب نہیں، مطلق عذاب مراد ہے، جو انسان کے لئے کڑک اور چیخ سب کچھ ہے۔ (۱)

أصحاب الأیکہ

قرآن مجید میں عرب کی ایک قوم کا ''اصحاب الأیکہ'' کے نام سے ذکر ہے، ایکہ کے لغوی معنی جنگل کے ہیں، اس قوم کے پیغمبر بھی حضرت شعیبؑ ہی تھے، اس اتحاد سے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مدین اور اصحاب الأیکہ ایک ہی چیزیں ہیں، ان کا قیاس ہے کہ ملک مدین کے پاس جنگل تھا، جہاں مدین کی قوم کبھی کبھی قیام کرتی تھی، اس

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج ۱/ ۱۵۵

لئے ''اصحاب الأیکہ'' جنگل والوں کے نام سے خطاب کیا گیا ہے، (معالم التنزیل بغوی، سورۂ حجر، شعراء، ق، ص،)

مسلمان جغرافیہ نویس ان اطراف میں کسی جنگل کے ذکر سے خاموش ہیں، ان کی رائے ہے کہ شہر تبوک جو مدین کے مقابل مدین سے ۶ مرحلہ پر واقع ہے، اسی کا قدیم نام أیکہ تھا اور خود اہل تبوک کو بھی اعتراف ہے کہ اس کا پہلا نام ''أیکہ'' ہے۔ (معجم البلدان)

قرآن کے رو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدین اور ایکہ دو چیزیں ہیں، کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیبؑ سے سوال وجواب، طرز خطاب اور پھر آخراً بربادی اور طریقۂ بربادی بالکل مختلف ہے، اس بنا پر کون دعوی کرسکتا ہے کہ مدین اور اصحاب الأیکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں؟ سب سے بڑے اشتباہ کی صورت یہ ہے کہ عام معلومات کے لحاظ سے ان اطراف میں جنگل کا نشان نہیں، ورنہ اہل تفسیر وروایت اور اہل جغرافیہ عرب اس کا ذکر کرتے، اس دشوار گزار راہ کو اب ہم اپنی کوشش سے طے کرنا چاہتے ہیں:

اتنا تو ظاہر ہے کہ مدین اور ایکہ میں کوئی شدید تعلق تھا، اور ان کا زمانہ بھی باہم ایک تھا، جس کی بنا پر دونوں آبادیوں کے لئے ایک ہی پیغمبر کی بعثت ہوئی، نیز قرآن نے دونوں کے اخلاق کا نقشہ بھی ایک ہی کھینچا ہے، مدین جو حضرت ابراہیمؑ کی بیوی قطورا کے بطن سے تھا، اس کے کئی بھائی تھے، توراۃ نے قطورا کی متعدد اولاد اور اولاد میں سے صرف دو کی تفصیل کی ہے، بنو مدین اور بنو ددان، بنو مدین کے متعلق بہ تحقیق معلوم ہے کہ بحر احمر پر خلیج عقبہ کے سامنے شہر مدین میں آباد تھے، اس لئے تسلیم کرنا چاہئے کہ بنو ددان بھی ان ہی سواحل پر مدین کے قریب آباد ہوں گے، توراۃ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ انہیں اطراف میں آباد تھے، یمن سے سواحل بحر احمر کے کنارہ کنارہ حجاز ومدین سے گزر کر خلیج عقبہ کے کنارہ سے نکل کر تیماء وغیرہ کو قطع کرتی ہوئی ایک نہایت قدیم ومشہور تجارتی سڑک واقع ہے، وادی القری، ثمود کا مسکن، مدین، قوم شعیب کی آبادی، سدوم، قوم لوط کا مقام اور نیز تبوک تیماء اور رقیم (یونانی پٹرا) اسی سڑک پر مابین حجاز وشام واقع ہیں، توراۃ کے لحاظ

سے ددان بھی یہیں تھا اور قرآن کہتا ہے کہ اُصحاب الأیکہ بھی اسی سڑک پر ہیں، قوم لوط جو سدوم میں آباد تھی، اس کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ [حجر ۷۸۔۷۹] (اور جنگل والے یقیناً حد سے گزر جانے والے تھے، ہم نے ان سے انتقام لیا اور یہ (سدوم وایکہ والے) دونوں کھلے راستے پر ہیں)۔ یہ وہی راستہ ہے، جس کا ہم نے ذکر کیا، اور جس کو تاریخ قدیم میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔

اس بیان سے قرآن وتوراۃ دونوں کے رو سے ددان یا اصحاب الایکہ کا مسکن متعین ہوگیا۔ قرآن نے ددان کو اصحاب الأیکۃ ''جنگل والے'' کیوں کہا؟ کیا ان کا وطن جنگل میں تھا؟ ہاں جنگل میں تھا۔ اور آٹھ سو برس کے بعد بھی جنگل میں تھا، اشعیا بنوخذنضر (بخت نصر) کے خروج سے تمام اقوام کو متنبہ کررہے تھے تو کہا کہ جنگل میں ددان والوں کی راہ میں تم شام بسر کرو، مسیح سے سو برس اور اسلام سے ۷۰۰ سو برس پہلے بھی یہاں جنگل موجود تھا، یونانی جغرافیہ نویس کی تحقیق سے بھی تائید ہوتی ہے، اس سے بڑھ کر توافق یہ ہے کہ اُصحاب الأیکۃ یعنی جنگل والوں کے ملک کا ایک مشہور واضح شاہ راہ امام مبین پر ہونا قرآن نے بیان کیا ہے، بعینہ یہی بیان ایک یونانی جغرافیہ میں بھی ہے۔

قرآن مجید میں اصحاب الأیکۃ کا ذکر چار سورتوں میں ہے: حجر، شعراء، ص، ق، سب سے مفصل ذکر شعراء میں ہے:

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ وَمَا أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفاً مِّنَ السَّمَاءِ إِن كُنتَ مِنَ

الصَّادِقِينَ قَالَ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ [شعراء:۱۷۶۔۱۹۰]

(جنگل والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی، جب کہ ان سے شعیب نے کہا کہ کیا تم نہیں ڈرتے؟ میں تمہارا پیغمبر ہوں، خدا سے ڈرو اور میری بات مانو، اور میں تم سے اس کی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت صرف خدائے پروردگار عالم پر ہے، ناپ اور تول پورا پورا کرو، اور ٹوٹا دینے والوں میں سے نہ ہو، اور ٹھیک ترازو سے تولو، لوگوں کے حق کو کم نہ کیا کرو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، اور اس سے ڈرو، جس نے تم کو اور پہلی قوموں کو پیدا کیا۔

انہوں نے کہا: تم پر تو جادو کیا گیا ہے، تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، ہم تو تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں، اگر سچے ہو تو آسمان سے ہم پر بادل کا ایک ٹکڑا گرادو، شعیبؑ نے کہا: میرا پروردگار تمہارے اعمال سے واقف ہے، لوگوں نے اس کو جھٹلایا، پس سایہ کے دن کے عذاب نے ان کو آلیا، بیشک وہ ایک بڑے دن کا عذاب تھا، اس میں عبرت کی نشانی ہے، ان لوگوں میں اکثر مومن نہ تھے)۔

ددان بھی مدین کی طرح ایک تاجر قوم تھی، ہمارے مفسرین کا بیان ہے کہ بلا استثناء تمام اصحاب الایکہ ہلاک ہوگئے، لیکن قرآن مجید میں اس قسم کا کوئی لفظ نہیں ہے، اور نہ کوئی حدیث مرفوع وصحیح اس کی مثبت ہے، اور نہ یہ تفصیل ہے کہ یہ عذاب مہلک تھا یا مکلّف، اس بنا پر مفسرین کی زیادت قابل تسلیم نہیں، اگر یہ صحیح ہوتا تو مدین وغیرہ کے ذکر میں جس طرح اس کی تشریح قرآن مجید نے کردی ہے، یہاں بھی ضرور ہوتی۔

یہاں ایک نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ مدین کے موقع پر خدا نے فرمایا: وإلىٰ مدين أخاهم شعيباً اور یہاں فرمایا: إذ قال لهم شعيب اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت شعیب مدین کے خاندان سے تھے، دوسرے بھائی ددان کے خاندان سے نہ تھے۔

زیادت تبصرہ کے لئے اصحاب الایکہ کی تین اور آیتیں بھی پڑھو:

وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ

[حجر:۷۸۔۷۹] (اور جنگل والے یقیناً حد سے گزر جانے والے تھے، تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور یہ دونوں مقام (سدوم وایکہ) کھلے راستے پر ہیں)۔

یہ سورۂ حجر کی آیت: ص اورق میں اقوام ظالمین کی ضمن میں صرف نام ہے۔

وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ أُولَئِكَ الْأَحْزَابُ ، إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ [ص:۱۳۔۱۴] (ثمود، قوم لوط، جنگل والے یہ بڑی جماعتیں ہیں، ان میں سے ہر ایک نے انبیاء کی تکذیب کی، پس میرا عذاب حق ہوا)۔

وعاد وفرعون وإخوان لوط وأصحاب الأيكة وقوم تبع، كل كذب الرسل فحق وعيد. [ق:۱۳۔۱۴] (ہر ایک نے انبیاء کی تکذیک کی، پس میری وعید سچ ہوئی)۔

ان آیات سے بھی عذاب ہلاک یا ہلاک کلی کا ثبوت نہیں ہوتا، اسی لئے ہم اس قوم کا ذکر ۶۰۰ برس ق م میں بنوخذ نصر (بخت نصر) کے عہد تک پاتے ہیں، تا آنکہ اس کی تلوار نے دیگر اقوام کی طرح ان کو بھی محو کر دیا، جیسا کہ حزقیال نبی نے پیشین گوئی کی تھی۔:

اسی لئے خداوند کہتا ہے کہ میں اپنا ہاتھ ادوم پر دراز کروں گا، اور اس سے انسان وحیوان چھین لوں گا، اور اس کو جنوب (تیمن) سے ویران کر دوں گا، اور اہل ددان تلوار سے گریں گے (۲۵۔۱۴)۔(۱)

أصحاب الرس

حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں میں دسویں بیٹے کا نام قیدماہ تھا، قرآن مجید میں ایک قبیلہ کا نام ''أصحاب الرس'' مذکور ہے، بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ قیدماہ کا نام أصحاب الرس تھا، ہمارے ہاں مفسرین أصحاب الرس کی تعیین میں نہایت مشکوک الرأی ہیں، امام طبریؒ نے ارباب روایت کی تین روایتیں نقل کی ہیں:

(۱) رس کنویں کو کہتے ہیں، ایک امت نے اپنے پیغمبر کو کنویں میں ڈال دیا تھا، اس لئے اس کو أصحاب الرس کہتے ہیں۔

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/ ۱۸۔۲۱

(۲) رس ملک آذربیجان کے پار ایک آبادی کا نام ہے، (شاید روس سے مقصد ہو)

(۳) رس غار کو کہتے ہیں اور اس سے مراد اصحاب الاخدود ہیں۔

لیکن مؤرخ مسعودی بلا تزلزل رائے لکھتا ہے:

''أصحاب الرس'' اسماعیل کے اولاد میں سے تھے، وہ دو قبیلے تھے: ایک کا نام قیدمان اور دوسرے کا نام یامین، اور کہا گیا ہے کہ رعویل تھا اور یہ یمن میں تھے: (مروج الذھب)۔

قیدمان، قیدماہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے، أصحاب الرس کا اس کے علاوہ کوئی اور حال نہیں معلوم، قرآن مجید نے أصحاب الرس کا دو مقام پر ذکر کیا ہے، لیکن کوئی حال بیان نہیں کیا ہے، بلکہ صرف گنہگار قوموں کی فہرست کے ضمن میں اس کا نام لیا ہے :

وعادا وثمود وأصحاب الرس [فرقان:۳۸] (عاد، ثمود اور أصحاب الرس کو)

كذبت قبلهم قوم نوح وأصحاب الرس وثمود. [ق:۱۲] (اس سے پہلے نوح کی قوم، أصحاب الرس اور ثمود نے جھٹلایا)۔(۱)

أصحاب الحجر

اصحاب الحجر حضرت اسماعیلؑ کے گیارہویں بیٹے نابیوط کی اولاد ہیں، نابیوط کو اہل عرب عموماً نابت کہتے ہیں، ان کی روایتوں کے مطابق خانہ کعبہ کی تولیت حضرت اسماعیلؑ کے بعد سب سے بڑے بیٹے نابت کے حصہ میں آئی۔ (الأخبار الطّوال: مصنفہ ابوحنیفہ دینوری، ت ۲۸۱ ص ۱۱، مطبوعہ مصر)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نابیوط نے حجاز ہی میں قیام کیا، لیکن بعض حوالوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ فرزندان نابیوط عراق میں موجود تھے، لیکن اصل یہ ہے کہ بدویانہ زندگی کے ساتھ وہ حجاز سے عراق تک خانہ بدوشانہ پھیلے ہوئے ہوں گے، تحریری حیثیت سے نابیوط کا نام ساتویں صدی ق م میں نظر آتا ہے، یوسیفوس یہودی، جو پہلی صدی مسیحی میں تھا لکھتا ہے:

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/ ۴۴

''ملک بحر احمر (حجاز) سے نہر فرات (عراق) تک اسماعیل کے ۱۲ر بیٹوں کے قبضہ میں ہے جن کے سبب سے اس کا نام نباطیہ پڑ گیا ہے''۔

انباط کے مرکز حکومت دو تھے: رقیم (پٹرا) متصل شام، اور حجر (اجرا) اندرون عرب، قرآن مجید نے ان کو اسی قریب تر شہر کے مالک کہہ کر ان کو پکارا ہے: وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً آمِنِينَ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ فَمَا أَغْنَى عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ. [حجر:۸۰۔۸۴]

(اہل حجر نے پیغمبروں کو جھٹلایا (گزشتہ اور معاصر پیغمبروں کی ہدایات قبول نہ کیں) ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں، ان سے منہ پھیر لیا، یہ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بناتے تھے، جن میں امن وآرام کے ساتھ رہتے تھے، ان کو عذاب نے صبح کرتے ہوئے لے لیا، پھر ان کے کارناموں نے ان کو کوئی فائدہ نہ بخشا)۔

تمام مفسرین نے ''اصحاب الحجر'' سے ثمود مراد لیا ہے، اس میں شک نہیں کہ ثمود کا دارالحکومت بھی کبھی یہی شہر تھا، لیکن قرآن مجید کا عام طرز ادا بتاتا ہے کہ اصحاب الحجر سے ثمود کے علاوہ ان کے بعد کی آبادی مراد ہے، قرآن مجید نے ثمود کا ۲۶ر جگہ ذکر کیا ہے، لیکن ہر جگہ ان کا نام لیا ہے، اس اجمال کے ساتھ یعنی حجر والے کہہ کر کہیں نہیں بیان کیا ہے، ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ ثمود کی تعمیر وسنگ تراشی کا قرآن مجید میں جہاں ذکر ہے وہاں مقام کا نام بھی بتا یا دیا ہے، یعنی وادی القری، وثمود الذين جابوا الصخر بالواد [فجر:۹] (ثمود جنہوں نے وادی القری میں پتھر تراشے)، یہاں ''حجر والے'' کہہ کر ان کی تعمیر وسنگ تراشی کا ذکر کیا ہے، اس سے اشارہ یہ ہے کہ ان کی سنگی عمارتیں حجر میں واقع تھیں، ان کے نشان اور آثار اب تک موجود ہیں، ان پر جو کتبات منقوش ہے، ان میں بانی اپنا نام ''نبطیو'' بتاتے ہیں، جس کو ہر نبطی خط وزبان کا عالم ہر وقت پڑھ کر تصدیق کر سکتا ہے، اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اصحاب الحجر ان ہی انباط کا لقب تھا، صحیح بخاری اور

احادیث وسیر کی دوسری کتابوں میں مذکور ہے کہ آنحضرت (ﷺ) تبوک کو تشریف لے جاتے ہوئے مقام حجر سے گزرے تھے، اس موقع پر بھی اکثر روایتوں میں ثمود کا نام نہیں، یہ فقرہ مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا: لاتدخلوا مساكن الذين ظلموا أنفسهم إلاأن تكونوا باكين أن يصيبكم مثل ما أصابهم. (ان اپنی جان پر آپ ظلم کرنے والوں کے گھروں میں روتے ہوئے چلو، ایسا نہ ہو کہ جو مصیبت ان پر آئی ہے تم پر بھی آئے)، یہ روایت امام بخاریؒ نے باب غزوۂ تبوک تفسیر سورۂ حجر اور ثمود کے ذکر میں درج کی ہے، اس میں ثمود کا مطلق نام نہیں، ایک روایت میں یہی حدیث بزیادت الفاظ اس طرح مروی ہے: إن الناس مع رسول اللّٰه (ﷺ) نزلوا أرض ثمود الحجر، اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حجر ثمود کا ملک بھی تھا، اور اس سے ہم کو انکار نہیں۔(۱)

اصحاب الأخدود

تبابعہ کے علاقہ میں یہودیت ونصرانیت دو ہی مہذب اور صاحب الہام مذہب تھے، اور باہم میدان میں برابر کے حریف بھی تھے، یہ حقیقت ہے کہ رومیوں اور حبشیوں کے ساتھ سبائے حمیر کو کس قدر سیاسی کشمکش تھی، رومیوں نے اس نزاع کو بہ صلح وآشتی طے کرنا چاہا، چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں رومی قیصر جسٹینن نے تبع یمن کے دربار میں سفیر بھیجا، تبع نے نہایت تزک واحتشام سے اپنی سطوت کا اظہار کیا، خود ایک گاڑی پر سوار تھا، جس میں ہاتھی جتے ہوئے تھے، بدن پر ایک چادر تھی، جو سونے کی گھنڈیوں سے اٹکی تھی، ایک ہاتھ میں ڈھال اور دوسرے میں دو نیزے تھے، بازوؤں میں بیش قیمت بازوبند تھے، اردگرد درباری تھے، جو فخریہ رجز کے اشعار پڑھتے تھے، اس شان وشوکت کے منظر میں سفیر نے قیصر کا خط اور اس کی طرف سے دیگر تحائف پیش کئے، خط کا مفہوم یہ تھا کہ ان اطراف میں ایرانی فروغ نہ پائیں، سفیر معمولی وعدہ وایجاب کے بعد واپس آ گیا۔

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/۶۰۔۴۵

یہ پیام صلح تعصب کی آگ کو کچھ بھی سرد نہ کرسکا، اس وقت ذونواس فرمانروا تھا، کہتے ہیں کہ اس نے یہودیت کے پرجوش تعصب کا سبق یثرب کے یہودیوں سے سیکھا تھا، جن سے اسلام نے بھی کچھ کم دکھ نہیں اٹھایا، رومی سوداگر تاجرانہ یمن کے سواحل تک پہونچے تھے، لیکن جہاں گزرتے تھے۔ اسباب سوداگری کے ساتھ عیسائیت کی سوغات بھی ساتھ ساتھ بانٹتے جاتے تھے۔ عیسائی راہب بھی مخصوص مقاصد کے ساتھ ملک میں دورہ کرتے تھے، پہلے اثر نے عدن اور دوسری کوشش نے نجران میں جہاں پہلے شجر پرستی ہوتی تھی، عیسائیت کے برگ وبار پیدا کئے، یورپ کے جو اب ہتھکنڈے ہیں وہی پہلے بھی تھے، مذہبی اور سیاسی اغراض پر تجارت کا پردہ ہمیشہ ڈالا کئے ہیں، یہی پردہ اس وقت بھی ڈال رہے تھے، ان تدابیر سے نجران یمن میں عیسائیت کا مرکز قرار پا گیا تھا، یعنی رومیوں اور حبشیوں کی مذہبی وسیاسی امیدوں کا وہ مادیٰ بن گیا تھا، حمیری یہودی اس کو دیکھتے تھے اور وفور جوش سے بپھرتے تھے۔

اتفاق وقت، اشتعال طبع کے لئے ایک عجیب حیلہ پیدا ہوگیا، جواب بھی نہایت کثیر الوقوع ہے، نجران میں ایک راہب کا مقام تھا، ایک لڑکا اس راہ سے اکثر گزرتا تھا، راہب اس کو راستہ میں ٹھہرا کر مذہبی تعلیم کا روز کوئی نہ کوئی سبق دیا کرتا تھا، جب عام لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ طبعاً برافروختہ ہوئے اور ایک عظیم الشان فتنہ کے مواد فراہم ہوگئے۔

ذونواس نے سنا تو چراغ پا ہوگیا، نجران آگ بگولا بن کر پہنچا، لوگ قلعہ بند ہوگئے، شہر کا محاصرہ کرلیا، جب شہر فتح ہوا تو گڈھوں میں آگ دہکائی اور ایک ایک کر کے عیسائیوں کو بلوایا، جس نے یہودیت کے قبول سے انکار کیا، اس کو نذر آتش کیا، قرآن میں اصحاب الأخدود کے نام سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُود وَهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ [بروج: ۴-۸] (مارے جائیں گڈھوں والے، گڈھے بھڑکتی آگ تھے، جب وہ ان پر

بیٹھے تھے اور (سچے) مومنوں کے ساتھ جو ظلم کر رہے تھے اس پر خود گواہ تھے، ان مومنوں میں بجز اس کے اور کچھ قصور نہ پایا کہ وہ خدائے محبوب ومحمود پر ایمان لائے تھے)۔

قرآن میں یہ مذکور نہیں کہ اس نے تمام لوگوں کو جلا دیا اور شہر کو بے نشان کر دیا، لیکن کتب اخبار وتفسیر کی عام روایات میں مذکور ہے کہ تمام آبادی خاکستر ہوگئی، لیکن یہ صحیح نہیں، آں حضرتؐ کے زمانہ میں نجران میں عیسائی آبادی موجود تھی، وہاں دعاۃ اسلام بھیجے گئے ہیں، نجران سے دو راہب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مناظرہ کے لئے آئے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں یہاں کے نصاری سے دُونے صدقات وصول ہوئے ہیں، یا ممکن ہے کہ حبشی عیسائیوں کے ہفتاد سالہ عہد میں یہ شہر پھر دوبارہ آباد ہوا ہو، (اصحاب الأخدود کے متعلق طبری اور کتب تفسیر میں عجیب وغریب روایات ہیں، جو اصول روایت سے صحیح نہیں ہیں، بقیہ اس فصل کے تمام عربی روایات تاریخ طبری میں اور عام تفسیروں میں موجود ہیں)۔

اس واقعہ کو عیسائیوں نے بھی یاد رکھا ہے، اسی عہد میں شام کے عیسائی اس قصہ کو قید تحریر میں لائے ہیں، ان کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے، جس میں یقیناً بعض تاریخی غلطیاں بھی ہیں: جاڑے کے سبب سے اہل حبش اپنا نائب یمن نہ بھیج سکے، ذونواس نے حکومت غصب کرلی اور عیسائیوں کو مذہب کی خاطر بہت دکھ دیا، علاوہ ازیں نجران پر فوج کشی اور خلاف وعدہ شہر پر قبضہ کر لینے کے بعد باایمان عیسائیوں کو آگ اور تلوار سے برباد کر دیا۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اصحاب الأخدود)۔(۱)

تبع

لفظ تبع لغویین عرب کے نزدیک تبع یا تبیعت سے مشتق ہے، تاریخ حمزہ اصفہانی ص: ۱۰۸ میں ہے کہ حمیر کے بعد یمن کی حکومت حارث الرائش کو ملی، یہ پہلا تبع ہے، اس سے پہلے دو بادشاہ یمن میں ہوتے تھے، ایک سبا میں، ایک حضرموت میں، تمام یمن ایک بادشاہ پر متفق نہیں تھے، جب رائش بادشاہ ہوا تو سب اس کی بادشاہی پر متفق ہوگئے اور اس

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۱/ ۲۴۴-۲۴۵

کی بیعت اختیار کی، اس لئے اس کا لقب تبع ہوا۔ ممکن ہے کہ تبع عربی لفظ (متبوع) ہو، یعنی جس کی لوگ پیروی اور اطاعت کریں، لیکن بہ تحقیق جدید یہ حبشی لفظ ہے، حبشی میں اس کے معنی قادر، جبار اور صاحب قوت کے ہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون عرب)۔

حکومت اسلام میں ٹھیک اسی معنی میں یہ لفظ سلطان، (قوت وغلبہ) رواج پایا ہے، اس لفظ کے غیر عربی ہونے کی تائید علاوہ اس کے کہ حبشی زبان میں یہ لفظ موجود ہے، یہ ہے کہ عربی زبان میں اس وزن پر کوئی لفظ واحد اور بہ معنی مفعول نہیں آیا ہے، ''رکع'' ''سجد'' وغیرہ الفاظ ہیں تو جمع ہے، مبالغہ کا وزن ہے تو وہ معنی مفعول نہیں پیدا کرتا اور اگر یہ عربی صنف کا صیغہ ہوتا تو مانع الف ولام کیا ہے، لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ صرف حبشی لفظ ہے، کتبات میں ملوک معین وسبا کے عہد میں یعنی کم از کم ہزار سال قبل مسیح میں لفظ تبع نظر آتا ہے، ایک بادشاہ معین کا نام ''تبع کرب بن تبع ایل'' مذکور ہے، ایک سبائی کتبہ میں ''تبع شرحبیل ملک سبا'' منقوش دیکھا ہے، دوسرے کتبہ میں ''تبع کرب'' بلا لقب شاہی نظر سے گزرا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ اصلا سبائی اور حمیری ہے، قرآن مجید نے قوم تبع کا دو بار ذکر کیا ہے، دونوں بار قوت وزور اور جبروت وعظمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔(۱)

پہلی آیت میں صرف جبار قوموں میں اس کا بھی نام ہے، دوسری آیت میں قریش کی طرف روئے خطاب ہے کہ ان کو اپنی کس قوت پر ناز ہے؟ تبع اور ان سے پہلے کی قومیں کیا ان سے زیادہ توانا اور زور مند نہ تھیں، ان کا کیا انجام ہوا؟ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ [ق:۱۲-۱۳] (اس سے پہلے نوح کی قوم، اہل رس، ثمود، عاد وفرعون، برادران لوط، اہل ایکہ اور تبع کی قوم نے جھٹلایا)، ''أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ [دخان:۳۷] (یہ قریش بہتر ہیں یا تبع کی قوم، اور جو قومیں ان سے پہلے گذریں ہم نے ان کو برباد کیا، وہ مجرم تھے)۔

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۱/۲۳۶-۲۳۷۔

ان آیات کے موقع استعمال سے واضح ہوتا ہے کہ تبع کے معنی متبوع سے ''زیادہ بلیغ وپر اثر قادر وتوانا'' کے ہیں۔

عام مؤرخین اور ان کی تبعیت میں عام مفسرین لکھتے ہیں کہ صرف تین تبع گزرے ہیں، تبع اکبر، تبع اوسط، اور تبع اصغر، تبع اکبر کا نام الحارث الرائش ہے، تبع اوسط اسعد ابوکرب کا لقب تھا اور تبع اصغر تبع بن حسان تھا، اس کے مقابلہ میں خود حمیری مصنفین کی روایت ہے کہ تاریخ یمن میں ستر تبع گزرے ہیں، لیکن اس سے مقصود شاید عام سلاطین یمن ہوں گے۔(۱)

أصحاب الفیل

ابرہہ کے زمانہ کا سب سے بڑا عظیم الشان واقعہ ۵۷۰ء میں مکہ پر فوج کشی ہے، اس مہم میں چونکہ حبشی ہاتھی لے کر آئے تھے، اس لئے عرب اس مہم کو وقعۃ الفیل اور اس سال کو عام الفیل کہتے ہیں، آنحضرتؐ کی ولادت مبارک اسی سال اس واقعہ کے چالیس روز بعد ہوئی۔

عرب مؤرخین کی روایت کے مطابق اس مہم کا مقصد صرف تخریب کعبہ تھی، یورپین مصنفین کہتے ہیں: یہ واقعہ ضمنی پیدا ہو گیا ہوگا، ورنہ اصل غرض روم وفارس کی باہمی جنگ میں صحرائے حجاز کو عبور کر کے ہم مذہب رومیوں کی اعانت تھی، ہم کو اصل وضمن سے بحث نہیں، تواتر نقل سے اتنا جانتے ہیں کہ واقعہ ہوا، اور بس!

ابرہہ کے کتبہ عرم (ابرہہ کے زمانہ کا ایک بہت بڑا کتبہ سد عرم کی بقیہ دیوار پر ملا ہے) کے فقروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ یمن کے علاوہ تہامہ کا بھی جہاں کعبہ واقع ہے اپنے کو بادشاہ سمجھتا ہے، کتبہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ایک گرجا مارب میں بنوایا تھا، اہل عرب کی روایت اس واقعہ کے متعلق یہ ہے، اور جو قرب زمانہ کی وجہ سے یقیناً صحیح ہوگی، ابرہہ نے عیسائیت کی ترویج کی غرض سے صنعاء میں ایک بڑا اور عظیم الشان کلیسا تعمیر کیا تھا اور اس کا نام کعبہ رکھا، غرض یہ تھی کہ عرب اصلی کعبہ کو چھوڑ کر ادھر جھکیں،

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۱ ص ۲۳۸۔

عربوں میں کعبہ کی چونکہ بڑی عظمت تھی اور عرب کے ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ اس کی برابر عزت کرتے تھے، (اس کی دو دلیلیں ہیں۔ اول یہ کہ کعبہ میں ابراہیم (یہود) مسیح اور مریم (عیسائی) کی تصویریں اور تمام قبائل کے تھے، ثانیا یہ کہ نصرانی شعرائے جاہلیت کے کلام میں بھی مشاعر کعبہ اور ارکان حج کی عظمت مذکور ہے)

اس لئے اس سے ان میں برہمی پیدا ہوئی، ایک عرب نے رات کو چھپ کر اس کلیسا کو نجس کر دیا اور ابرہہ اپنے مقدس معبد کی بے حرمتی دیکھ کر غصہ سے بے تاب ہو گیا، فوج جرار اور چند ہاتھی لے کر کعبہ ابراہیم کو ڈھانے نکلا، راہ میں عرب کے متعدد قبائل بڑھ بڑھ کر ابرہہ پر حملہ آور ہوئے، لیکن ہزیمت اٹھا کر پسپا ہو گئے، جب یہ ہاتھیوں کا دل اور آدمیوں کا جنگل وادی مکہ کے قریب پہنچا، دفعتا کسی سمت سے پرندوں کا غول درغول نمودار ہوا، ان کے منھ اور پنجہ میں کنکریاں تھیں، یہ کنکریاں جس پر گریں اس کا بدن پھوڑ کر نکل آئیں، اعضاء سڑنے گلنے لگے، ہاتھی چنگاڑ مار مار کر پیچھے ہٹ گئے، چند منٹ میں تمام لشکر زیروزبر تھا، عرب میں چیچک کی بیماری اسی سال پیدا ہوئی۔ (طبری وابن اسحٰق)

واقعہ کے اخیر فقرہ سے مؤرخین یورپ نے یہ نتیجہ پیدا کیا ہے کہ اصل واقعہ اتنا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا، راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہو کر رہ گئی (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اصحاب الفیل)

حبش میں اسی زمانہ میں چیچک کی وبا کا پھیلنا، غیر اسلامی روایت سے ثابت ہے، چنانچہ حبش کے ایک سیاح نے اپنے سفر نامہ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ ''اسمال پاکس'')

چیچک کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس بیماری کا نشو، اور ترقی تقریبا اسی زمانہ سے ہے۔

قرآن مجید نے ان ہی واقعات کو سورۃ الفیل میں بیان کیا ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ [فیل ۱-۵] (تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا، کیا اس نے ان کی مخفی تدبیر کو بے کار نہیں کر دیا، اس نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے وہ پرندے پتھر مارتے تھے، پھر خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا)۔

جمہور کے نزدیک ان آیات کی تفسیر تو وہی ہے جو عام روایت کے مطابق ہے، پرندوں کا پتھر برسانا اور اس سے ایک فوج کی فوج کا ہلاک ہو جانا تعجب انگیز واقعہ ہے، لیکن محال نہیں، ممکن ہے کہ ان کنکریوں میں چیچک کے وبائی جراثیم ہوں، اس واقعہ کی صحت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ یہ سورہ اس واقعہ کے تقریبا پچاس برس بعد نازل ہوئی، اس وقت بہت سے اشخاص حملہ حبش کے چشم دید گواہ موجود ہوں گے، بعض لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنے بزرگوں سے اس واقعہ کو سنا ہوگا۔ تاہم کسی نے اس وحی الٰہی کی تکذیب نہ کی۔ (۱)

قریش

فہر کا لقب قریش تھا، اس بنا پر اس کی نسل نے ''قریش'' اپنا خاندانی علم قرار دیا، لفظ قریش کے عربی میں متعدد معنی ہیں، اس کا ایک ماخذ تقریش وتقرش ہے، جس کے معنی ''اکتساب وتحصیل'' ہیں، خیال ہے کہ چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لئے قریش کے نام سے موسوم ہے۔

قریش ایک دریائی درندہ جانور کا بھی نام ہے جو دریائی جانوروں کا شکار کرتا ہے، فہر نے اپنے استیلاء وقوت کے اظہار کے لئے یہ لقب اختیار کیا، حضرت ابن عباسؓ نے اسی دوسری تاویل کو اختیار کیا ہے، مستشرقین یورپ جن کو ہماری تاریخ سے خود غرضانہ محبت ہے، وہ بھی دوسری رائے کو پسند کرتے ہیں، لیکن اس لئے نہیں کہ وہ روایۃً صحیح تر ہے، بلکہ اس لئے کہ ٹوٹزم کے ثبوت کے لئے سند ہاتھ آتی ہے، (لائف آف محمد مارگیولیوتھ) حالانکہ اس کی تردید کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس خاندان میں قریش کے نام کی نہ

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج/۱، ص/۲۵۷-۲۵۸۔

پوجا ہوتی تھی، نہ اس نام کا دیوتا پوجا جاتا تھا۔قریش کوئی ایک قبیلہ نہ تھا، چھوٹے چھوٹے دس مختلف خاندانوں پر منقسم تھا: ہاشم، امیہ، نوفل، عبدالدار، اسد، تیم، مخزوم، جمح، سہم۔قریش کی جن شاخوں کا ذکر ہوا وہ طرز زندگی کے لحاظ سے دو جماعتوں میں منقسم تھے۔قریش الظواہر، قریش البطائح، قریش الظواہر دیگر بادیہ نشیں قبائل کی طرح مکہ کے آس پاس صحرا میں خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے، قریش البطائح شہری زندگی کے عادی تھے، اور چونکہ ان کا خاص پیشہ تجارت تھا، اطراف کے متمدن ممالک میں ان کا گزر ہوتا رہتا تھا، اس لئے ایک منتظم آبادی کی حیثیت انہوں نے پیدا کر لی تھی، ذیل کی فہرست سے قریش کے ان خاندانوں کی تقسیم ظاہر ہوگی۔

قریش الظواہر میں بنو محارب، بنو تیم الادرم، خزیمہ بن لؤی، سعد بن لؤی، جشم بن لؤی، بنو حارث، اور قریش البطائح میں بنو قصی بن کلاب، بنو کعب بن لؤی، ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بنو قصی اور بنو کعب بن لؤی کے سوا، قریش کی اور تمام شاخیں قریش الظواہر تھیں، اصل یہ ہے کہ تمام تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ قریش کی سیاسی عظمت وجلال کا بانی قصی تھا، قصی سے پہلے قریش میں کسی قسم کا نظام قومی نہ تھا، مکہ ایک مرکز تھا، اور اس کے دائرہ میں قریش کے تمام خاندان چکر لگاتے تھے، قصی سب سے پہلا شخص ہے جس نے قریش میں قومی ہیرو کی حیثیت پیدا کی۔قصی نے حدود شام میں تربیت پائی تھی، قریش عرب اس وقت تک بدوی تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی نے تہذیب زندگی، نظم حکومت اور تأسیس قومیت کے اصول شام ہی کے ملک میں سیکھے، اور جوانی کے بعد حجاز آ کر اسی اصول پر قریشی منتشر اجزاء کو یکجا کیا، اور ان میں سے ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی۔قصی نے مکہ میں جو چھوٹی سی ریاست قائم کی تھی اس کی حیثیت ایک شہری جمہوریت کی تھی۔

اس شہری حکومت میں کل چودہ عہدے تھے جو دس عہدہ داروں پر منقسم تھے، دس عہدہ دار قریش کے دس قبائل سے منتخب ہوتے تھے، ظہور اسلام کے وقت ان عہدوں کی حسب ذیل تقسیم تھی:

مذہبی

نمبر شمار	عہدہ	توضیح خدمات	نام قبیلہ	عہدہ دار
۱	سقایہ	حاجیوں کے کھانے پینے کا سامان	بنو ہاشم	عباسؓ بن عبدالمطلب
۲	عمارہ	خانہ کعبہ کا انتظام	بنو ہاشم	عباسؓ بن عبدالمطلب
۳	رفادہ	حاجیوں کی مالی اعانت کا انتظام	بنو نوفل	حارث بن عامر
۴	سدانہ	خانہ کعبہ کی دربانی وکلید برداری	بنو عبدالدار	عثمان بن طلحہ
۵	ایسار	بتوں سے استخارہ کی خدمت	بنو جمح	صفوان
۶	اموال محجرہ	بتوں کے نذرانوں اور جائیدادوں کا انتظام	بنو سہم	حارث بن قیس

عدالتی

۷	ندوہ	عدالت خانہ اور مشورہ گاہ کا انتظام	بنو عبدالدار	عثمان بن طلحہ
۸	مشورہ	امور مہمہ میں مشورہ لینا	بنو اسد	یزید بن ربیعہ
۹	اشناق	خوں بہا، جرمانہ اور مالی تاوان کا انتظام	بنو تمیم	ابوبکر صدیقؓ
۱۰	حکومۃ	مقدمات کا فیصلہ	بنو سہم	حارث بن قیس

جنگی

۱۱	عقاب	نشان قومی کی علمبرداری	بنو امیہ	ابوسفیان
۱۲	قبہ	فوجی معسکر (کیمپ) کا نظم	بنو مخزوم	خالد بن ولید
۱۳	اعفہ	سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری	بنی مخزوم	خالد بن ولید
۱۴	سفارت	سفارت	بنو عدی	عمر بن الخطابؓ

اسی چھوٹی سی شہری جمہوریت کا ایوان حکومت دارالندوہ کے نام سے موسوم تھا، اس کا بانی قصی تھا، ہر قسم کے اجتماعی، تجارتی، عدالتی، اور سیاسی احکام اور فیصلے قریش اسی عمارت میں بیٹھ کر صادر کرتے تھے، یہاں تک کہ شادی، بیاہ، بلوغ کے مراسم، قافلوں کی روانگی وداخلہ وغیرہ جملہ امور یہیں انجام پاتے تھے (ابن سعد ج ا ص ۳۹ میں ان تمام مراسم اور امور کی تفصیل ہے) قریش نے داعی اسلام کے قتل کا مجرمانہ فیصلہ بھی اسی ایوان عدالت میں بیٹھ کر صادر کیا تھا۔

عرب کے قبائل کی دو قسمیں تھیں: ایک وہ جو کسی مقام پر متعین بود و باش رکھتے تھے اور مکانات بنا کر کوئی متصل آبادی قائم کر لیتے تھے، ان قبائل کو لوگ حضری کہتے تھے، عرب کے بڑے شہر مکہ، یثرب، طائف، صنعاء، یمامہ، عدن، وغیرہ ان قبائل کے وطن تھے، ان کے علاوہ عرب کے اکثر قبائل بدوی تھے، یعنی خانہ بدوشانہ زندگی رکھتے تھے، خیموں میں رہتے تھے، مویشی کے لئے جہاں عمدہ چراگاہ نظر آتی تھی وہاں اتر پڑتے تھے، پھر کسی اور مقام پر جا کر ڈیرے ڈالتے تھے، یہی قبائل جرائم پیشہ بھی تھے۔

قریش حضری تھے، مکہ ان کا وطن تھا، بدوی قبائل کی طرح پر یا دوسرے قبائل کے مال و دولت کی چھین جھپٹ پر ان کا گذارہ نہ تھا، بلکہ پورا قبیلہ تجارتی کاروبار پر زندگی بسر کرتا تھا، عرب سے نکل کر حبشہ، عراق، ایران، شام، بلکہ ایشیائے کوچک تک ان کے تاجر گذرتے تھے، غیر ملکی تاجر جوان کے شہر میں داخل ہوتے تھے ان سے یہ عشر لیتے تھے (ابن سعد ج ا ذکر قریش)۔

قریش کے تلمیحی اور ایہامی اشاروں سے اگرچہ تمام قرآن بھرا ہوا ہے، لیکن نام کے ساتھ ان کا ذکر ایک ہی دفعہ قرآن میں آیا ہے اور وہ سورہ ایلاف میں: جس کو سورۂ قریش بھی کہتے ہیں: لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ [قریش:۱-۳]

(تعجب ہے کہ قریش کو اپنے جاڑے اور گرمی کے سفر سے کس قدر الفت ہے، ان

کو چاہئے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کو پوجیں، جس نے ان کو بھوک سے بچا کر کھانا دیا، اور خوف سے بچا کر امن وامان بخشا)۔

قرآن میں مذکور افراد قریش:

قریش کے افراد اور اشخاص کے ایہامی تذکرے قرآن میں کثرت سے ہیں، لیکن نام کے ساتھ، قریش اور موالی قریش میں سے صرف تین اشخاص کا ذکر ہے، ایک تو خود ذات رسالت مآب محمد ﷺ، دوسرے حضرت زید بن حارثہ اور تیسرا ابولہب۔

(۱) محمد ﷺ، یہ اسم گرامی چار موقعوں پر قرآن میں مذکور ہے: ما كان محمد أبآ أحد من رجالكم ولكن رسول الله (احزاب:۴۰) (محمدؐ تمہارے مردوں میں کسی کا باپ نہیں، لیکن خدا کا رسول ہے)۔ یہ اس موقع کی آیت ہے کہ لوگ حضرت زید بن حارثہؓ کو آپ ﷺ کا بیٹا کہتے تھے، تو خدا نے اس کی ممانعت کی، اس آیت سے یہ پیشین گوئی بھی سمجھی جاتی ہے کہ آپ کے کوئی لڑکا پیدا نہ ہوگا۔ دوسری آیت یہ ہے: محمد رسول الله (فتح: ۲۹) (محمدؐ خدا کے پیغمبر)۔

تیسری آیت: آمنوا بما نزل على محمد (محمد:۲) (محمدؐ پر جو کچھ اترا اس پر ایمان لاؤ)۔ چوتھی آیت: وما محمد الا رسول (آل عمران:۱۴۴) (محمدؐ صرف خدا کے رسول ہیں)۔

(۲) دوسرا نام **زید بن حارثہ** کا ہے، زید قریشی النسل نہ تھے، وہ کلب کے قبیلہ سے تھے، لڑکپن میں چند ڈاکو اُن کو چرا کر عکاظ کے بازار میں لائے، اور غلام بنا کر ان کو بیچا، حضرت حکیم بن حزامؓ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ماموں نے خریدا اور اپنی بھانجی کی خدمت گزاری میں دیا، حضرت خدیجہؓ نے ان کو آں حضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا، آپؐ نے آزاد فرما کر اپنی تربیت میں لیا، اور اس درجہ ان سے محبت کرنے لگے کہ لوگ ان کو زید بن محمد کہتے تھے، جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی: ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ [احزاب:۵] (ان کو ان کے باپ کی نسبت سے پکارو) تو لوگ ان کو زید بن حارثہ کہنے لگے۔

حضرت زید بن حارثہ ایک لاکھ صحابہ میں صرف وہی ایک خوش قسمت ہیں جن کا اسم گرامی ناموس اکبر کی زبان سے ادا ہوکر قرآن کے صفحات میں زندگی جاوید حاصل کرسکا، ان کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کا نام قرآن میں مذکور نہیں ہوا: فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا [احزاب: ۳۷] (جب زید نے اس کو طلاق دے دی)۔

حضرت زیدؓ کو آں حضرتؐ نے پالا تھا، اس لئے وہ خاندان کے ایک ممبر ہوگئے تھے، آنحضرتؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے ان کو بیاہ دیا تھا، لیکن میاں بیوی میں نباہ نہ ہوسکا، حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی، اسی سلسلہ کلام میں حضرت زیدؓ کا نام قرآن میں آگیا۔

(۳) تیسرا ابولہب ہے جو حضرتؐ کا حقیقی چچا اور عبدالمطلب کا بیٹا تھا، چچا نے بھتیجے کی نبوت پر گواہی نہ دی، بھتیجے نے وحی آسمانی کی زبان سے اس کے دائمی خسران وہلاکت کا اس کو پیغام سنایا: تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ سَيَصْلَى نَاراً ذَاتَ لَهَبٍ [لہب: ۱-۳] (ابولہب کے دونوں ہاتھوں کی ہلاکت ہو اور وہ ہلاک بھی ہوگیا، اس کے مال ودولت نے کچھ فائدہ نہ پہنچایا، وہ آتش دوزخ میں بیٹھے گا)۔

ابولہب کا اصلی نام عبدالعزیٰ تھا، ابولہب کنیت تھی، ابولہب کے معنی ''آگ والے'' کے ہیں، اس سے لوگوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ مسلمانوں نے ضد سے اس کا نام آگ والا یعنی دوزخی رکھا تھا، لیکن اصل یہ ہے کہ عربی میں آگ والے سے مراد صاحب حسن وجمال ہے، چونکہ یہ خوبصورت تھا، اس لئے قریش نے اس کو ابولہب کا خطاب دیا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ اس خطاب نے جو اسلام سے پہلے مل چکا تھا دوسرے معنی میں ایہاماً اسلام کے بعد اس کی تقدیر کا سرنوشت ہوگیا۔ یہ قریش کا سردار تھا، اور اسلام کا سخت دشمن، ہجرت کے بعد قریش کے حملہ آورانہ ارادوں کا آلہ تحریک ایک یہ بھی تھا، ۲ھ میں مکہ میں غزوۂ بدر کے بعد اس نے انتقال کیا۔

اس آیت میں ابولہب کی ہلاکت سے اس کی ذاتی ہلاکت نہیں، بلکہ اس کی قومی

ہلاکت مراد ہے، جو غزوۂ بدر میں واقع ہوئی، جس طرح دیگر انبیاء کے زمانہ میں ہمیشہ ایک طاغی اور سرکش ان کا مقابل رہا ہے، اور جس نے اپنی گمراہی سے قوم کو ہلاک کیا ہے، مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نمرود، حضرت موسیٰ کے عہد میں فرعون، اسی طریقہ سے اس امت محمدیہ کا نمرود یا فرعون ابولہب تھا، اور قرآن نے اسی حیثیت سے تمام رؤسائے قریش کو چھوڑ کر صرف اسی کا نام لیا۔(۱)

غلبت الروم في أدنىٰ الأرض:

انباط کے مٹنے کے بعد حدود شام میں ایک اور عرب خاندان نے ظہور کیا، جس کو عموماً آل غسان یا غساسنہ اور کبھی بانی خاندان کے نام سے آل جفنہ کہتے ہیں۔

عام علمائے انساب کی تشریح کی بنا پر آل غسان قحطانی سبا کے خاندان کہلاتے تھے۔

دوسری صدی کے وسط میں غسانی تہامہ میں اقامت گزیں تھے، اس کے بعد وہ حدود شام میں منتقل ہوئے ہیں، ان اطراف میں غسانیوں کی انتہائے حکومت کا زمانہ ۶۳۳ء (عہد فاروقی) ہے۔

اس خاندان کے بادشاہوں کی تعداد حمزہ نے ۳۲/ بیان کی ہے، لیکن اس تعداد میں عموماً بعض معاصر حکمراں غسانی شہزادوں کو بھی شمار کرلیا گیا ہے، آل غسان کی تاریخ تمام تر ایران وروم کی تاریخ کا خلاصہ ہے، اور اسی تعلق سے غسان ہمیشہ حیرہ کے بادشاہوں سے لڑتے رہتے تھے (ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کو اگر کبھی کامیابی ہوئی تو وہ ہمیشہ غسانیوں کی امداد کا نتیجہ تھی اور خود رومی بھی شکرگزاری کے ساتھ اس نتیجہ کا احساس کرتے تھے)۔

غسانیوں کے بادشاہوں میں سب سے پہلے جبلہ کا نام آتا ہے، پھر حارث اکبر بن جبلہ وغیرہ کا۔

چھٹی صدی کی ابتداء سے ربع صدی تک (۶۰۱ء سے ۶۲۵ء تک مشرق ومغرب میں یا مجوسیت اور عیسائیت میں جو زور آزمائیاں ہوئیں، ان سے غسانیوں کی یہ چھوٹی

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/ ۸۵-۸۸

سلطنت بھی مستثنیٰ نہ تھی، خسرو پرویز کی اولوالعزمیوں نے پندرہ برس میں دامن فرات سے وادی نیل اور ساحل باسفورس تک ہر جگہ خاک اڑادی، شام میں رومیوں کی شکست نے ۶۱۳ء میں غسانیوں کی بساط الٹ دی، قرآن مجید کی یہ پیشین گوئی جو سورۂ روم میں ہے اسی موقع کے متعلق ہے۔

رومی اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی حصہ کھو چکے تھے، آرمینیہ، شام، مصر، ایشیائے کوچک ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا، ایرانی قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے پڑے تھے، ہرقل (ہرکلیوس) قیصر روم، قسطنطنیہ سے راہ فرار کا سامان کر چکا تھا کہ مکہ کا پیغمبر نبوت کی پرجلال آواز میں مترنم ہوا:

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّومُ فِيٓ أَدۡنَى ٱلۡأَرۡضِ وَهُم مِّنۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُونَ فِي بِضۡعِ سِنِينَ۔ [روم ۱۔۳] الم، رومی قریب کے ملک میں مغلوب ہوگئے، وہ مغلوبی کے بعد عنقریب چند سالوں کے اندر غلبہ پائیں گے۔

دفعۃً ہوا کا رخ بدل گیا، ۶۱۶ء تک رومیوں نے ایک ایک کر کے اپنا ملک واپس لے لیا، غسانیوں نے سنبھال لیا، حارث بن ابی شمر ایک پرزور غسانیوں میں بادشاہ ہوا۔(۱)

والذین آووا و نصروا :

اوس وخزرج عرب کے دو مشہور قبیلوں کے نام ہیں، جو اسلام کے پہلے سے مدینہ میں سکونت پذیر تھے، اسلام آیا تو وہ اس کے پرزور دست وبازو تھے، اور انصار ان کا خطاب تھا۔

عام طور سے ان کو بھی قحطانی الاصل اور کہلان کے خاندان سے قرار دیا گیا، لیکن ہمارے نزدیک یہ رائے بھی صحت سے تہی مایہ ہے، زبان، مذہب اور اخلاق قومی کے علاوہ روایات سے بھی ان کے اسماعیلی ہونے پر مستحکم دلائل قائم ہیں۔

توالد ومرور زمانہ سے یہ دو قبیلے متعدد فروع اور شاخوں میں تقسیم ہوگئے تھے:

اوس: اوس کے صرف ایک اولاد تھی، مالک، جس کی اولادوں کی حسب ذیل

(۱) ارض القرآن ج ۲/۶۳۔۶۷۔

شاخیں ہیں:

۱۔عمرو بن مالک، ۲۔عوف بن مالک، ۳۔سالم بن مالک، ۴۔عبداللہ بن مالک بنو خطمہ، ۵۔خزرج، ۶۔جشم بن خزرج، ۷۔عوف بن خزرج، ۸۔حارث بن خزرج، ۹۔کعب بن خزرج۔

اوس وخزرج کی تاریخ ان کے ہم وطن یہودیوں کے ساتھ مخلوط ہے، یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ کے یہود اصلا بنی اسرائیل تھے، یا یہودی المذہب عرب تھے، تاہم شمالی عرب میں نہایت کثرت سے اصل یہود آباد تھے، مدینہ کے اطراف میں بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع پُرزور یہود خاندان آباد تھے، تجارت، زرگری، مہاجنی، لین دین، قرض دینا، رہن رکھنا، سود پر روپیہ لگانا، یہ ان کے پیشے تھے، بدوی عربوں سے حفاظت اور ملک میں سیاسی رعب پیدا کرنے کے لئے ہر تجارتی گودام پورا جنگی قلعہ تھا، جنوب میں مدینہ ان کی آخری سرحد تھی، مدینہ سے لے کر حدود شام تک، خیبر، فدک، تبوک تیماء، مدین، وادی القریٰ، حجر وغیرہ میں ان کے قلعے اور برابر برابر آبادیاں تھیں، مدینہ میں بنو قریظہ، اور بنو نضیر کے مضبوط ومستحکم قلعے تھے، اسلام آیا تو یہی ان کا مایہ غرور تھا، قرآن نے ان ہی قلعوں کی نسبت کہا ہے: وَأَنزَلَ ٱلَّذِينَ ظَٰهَرُوهُم مِّنۡ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ مِن صَيَاصِيهِمۡ [احزاب:۲۶] (خدا نے ان یہودیوں کو جنہوں نے کفار قریش کی مدد کی تھی، ان کے قلعوں سے اتارا)۔ لَا يُقَٰتِلُونَكُمۡ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرٗى مُّحَصَّنَةٍ أَوۡ مِن وَرَآءِ جُدُرٖ [حشر:۱۴] (اے مسلمانو! یہ یہود تم سے صرف قلعہ دار شہروں میں یا فصیلوں کے پیچھے ہو کر لڑیں گے)۔

ان جنگی اسباب وتدابیر کے ساتھ ان کے مالی کاروبار کا جو جال تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا، زنجیریں تھیں جو تمام باشندوں کے پاؤں میں انھوں نے ڈال رکھی تھیں۔

غرض یہ اسباب تھے کہ اوس وخزرج یہاں آکر ابھی ٹکے بھی نہ تھے کہ وہ ان کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے، اوس خزرج گو بدویانہ زور وقوت میں ان سے زیادہ تھے، لیکن سامان

،دولت، ہنر، اور دیگر قوائے معنوی میں ان سے فروتر تھے، اس بنا پر وہ یہودیوں سے نہایت متأثر ہونے لگے، یہاں تک کہ اس سے مذہبی اثر بھی پیدا ہونا شروع ہوگیا، اوس وخزرج نذر مانتے تھے کہ بچہ جیتا رہا تو یہودی بنادوں گا۔ (دیکھو تفسیر ''لا اکراہ فی الدین'')۔

بالآخر اوس وخزرج نے تنگ آکر بنوغسان سے جوان کے ہم نسب تھے، مدد کے طالب ہوئے، غسانیوں نے آکر یہودیوں کا زور توڑا، تاہم مالی تعلقات ایسی چیزیں نہیں ہیں جو تلوار سے کاٹ دی جاسکے، یہودی حقیقت میں جن اسلحہ سے لڑتے تھے، ان کا جواب فوجوں سے نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے ظہور اسلام تک ان کی زبردستی قائم رہی، پھر بھی وہ پہلے سے اچھی حالت میں تھے۔

ادھر یہودیوں سے کسی قدر فراغت ملی، تو خود آپس میں لڑنا شروع کیا، جس کا سلسلہ ایک مدت تک قائم رہا، ان کی مشہور لڑائیوں کے نام یہ ہیں: یوم الربیع، یوم البقیع، حرب قارع، یوم بعاث، (کامل ابن اثیر ج ۱/ ۳۰۳) اس متواتر جنگ میں اوس وخزرج کے اکثر اہل ادعا کام آئے، آخر فریقین نے تھک کر مصالحت کرلی۔ (بخاری کتاب الجاہلیۃ) اور قبیلہ عوف بن خزرج کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کو متفقاً اپنا بادشاہ اور یثرب کا ''تاجدار'' تسلیم کرلینا چاہا۔ (بخاری، السلام علی جماعۃ فیھا المسلم والکافر) کہ اس اثنا میں خورشید اسلام طلوع ہوا، اوس وخزرج کے بارہ آدمیوں نے موسم حج میں داعی اسلام کا وعظ سنا، اور ایمان وبیعت سے مالا مال ہوکر گھر واپس آئے، دوسرے سال اسی موسم میں ستر آدمی اور فروغ اسلام سے منور ہوگئے، اور آخر نبوت کے تیرھویں سال ۶۲۲ء میں رحمت عالمؐ کو یثرب کی شہنشاہی کے لئے لے آئے۔

سرور عالمؐ نے مدینہ آکر سب سے پہلے یہودیوں سے چند شروط پر مصالحت کی، اوس وخزرج کے باہمی فتنوں کو سرد کیا، عبداللہ بن ابی بن سلول جو بادشاہی کا دعویدار تھا ڈر کر خاموش تھا، تاہم فتنہ پردازیوں سے باز نہ آتا تھا، اس کے ساتھ چند کمزور دل کے افراد بھی شامل تھے، یہی لوگ منافقین تھے، اور عبداللہ ان کا سردار رأس المنافقین تھا۔

اوس وخزرج نے انصار کے نام سے اسلام میں زندگی جاوید پائی، دنیا کے ہرگوشہ میں جہاں قرآن کا کوئی صفحہ اور مسلمانوں کا کوئی گھرانہ ہے، انصار کا نام زندہ ہے: وَالَّذِيْنَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقّاً لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيْم ۔ [انفال: ۷۴] (اور جن لوگوں نے اسلام کو پناہ دی اور نصرت کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لئے مغفرت اور اچھا رزق ہے)۔ (۱)

یہود

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہوسکتی ہے، جو سام کی اولاد میں سے سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانت دار بنی، اسی لئے قرآن نے ان سے کہا "وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِه" [بقرہ: ۴۱] (اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ بنو) مگر یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا، مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا، قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا: "فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً" [بقرہ ۷۴] (ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں)۔

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں، بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا، حضرت موسیٰ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا، جس نے ان کی سنگ دلی کا ماتم نہ کیا ہو، اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو، چنانچہ قرآن مجید نے کہا: "لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا مِن بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُون" [مائدہ: ۷۸-۷۹] (بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے، اور دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے، ان کا کام کتنا برا ہے)۔

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج ۲/ ۷۲-۶۹

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین وملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، ''وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ ''[توبہ:۳۶] اپنی دولت وثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے: "يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَة "[مائدہ:۶۴] (خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں)۔قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہوسکتا کہ ہمارے نامختون ہیں، "وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْف "[بقرہ:۸۸] ان فقروں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے:

(۱) ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، یہودیوں میں ایک قسم کی ایک غلط فہمی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں، اس لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں، وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے، ان کا دعویٰ تھا کہ: نَحْنُ أَبْنَاء اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ [مائدہ:۱۸] (ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں) قرآن نے کہا:۔ بل أنتم بشر ممن خلق يغفر لمن يشاء و يعذ ب من يشاء [مائدۃ:۱۸] (بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے، سزا دے)۔

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا، لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّاماً مَّعْدُودَاتٍ [آل عمران:۲۴] (ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھوکر چھوڑ دے گی) قرآن نے کہا: وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ [آل عمران:۲۴] (اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔)

(۲) مال ودولت کی حرص وطمع تھی، اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہوگئی تھی: وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ [بقرہ:۹۶] (ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی لالچی پاؤ گے)۔(۱)

المجوس

مجوسیت ایران کا قدیم مذہب ہے، جس کا بانی زرتشت بتایا جاتا ہے، زرتشتی خود اپنے کو مجوس نہیں کہتے، عربی میں مجوس کا لفظ یونانی سے آیا ہے، یونانی ان کو مجوس کہتے ہیں، اصل فارسی لفظ مغ ہے، مجوس یزداں اور اہرمن دو خداؤں کے قائل تھے، ایک فاعل خیر (یزداں) اور دوسرا فاعل شر (اہرمن) یزداں کو نور اور اہرمن کو ظلمت سے بھی تعبیر کرتے تھے، قرآن نے عرب کے مجوسی اعتقاد کا ابطال بھی ضروری سمجھا، چنانچہ کہتا ہے: وقال الله لاتتخذوا الٰهين اثنين، انما هو اله واحد [نمل:۴۹] (خدا نے فرمایا کہ دو خدا نہ بناؤ، خدا تو ایک ہی ہے)۔میری رائے میں قرآن مجید کی یہ آیتیں: اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْض (نور:۳۵) (خدا آسمان وزمین کی روشنی ہے) الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّور [انعام:۱] (حمد ہو اس اللہ کی، جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور تاریکی اور روشنی کو بنایا) ان ہی مجوس کے رد میں ہیں، مجوس کا نام ایک دفعہ قرآن میں آیا ہے، سورۂ حج میں۔(۲)

---

(۱) سیرت النبی: ج ۴/۱۲۷۔۱۳۳، باختصار۔
(۲) تاریخ ارض القرآن: ج ۲/۱۵۴۔

اُمکنہ قرآن

مدین

سامی قومیں عموماً اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگان نسل کے نام سے موسوم کرتی ہیں، مدین اپنے بانی ومؤسس خاندان مدین بن ابراھیم کی طرف منسوب ہیں، مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی اسماعیل کے پہلو میں قائم کی، (یوسیفوس قدامت الیھود کتاب۲فصل۱۱)

یہ ملک طولاً خلیج عقبہ (عیلانہ) کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر وارض ثمود وحجاز تک جہاں ثمود جرہم وعرب اسماعیل آباد تھے، واقع تھا، اس کے باشندے ۲۰۰۰ق م تا ۱۰۰۰ق م رہے۔(۱) حضرت یوسف کو جو کاروان تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا وہ یہی اہل مدین اور اسماعیلی عرب تھے (تکوین ۳۷۔۲۷۔۲۸۔ ۳۶۔۳۰۔۱) اس لئے قرآن مجید کی اس آیت پاک میں: وَجَاءتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَهُ قَالَ يَا بُشْرَى هَذَا غُلَامٌ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ [یوسف:۱۹۔۲۰] (اتنے میں ایک کارواں آیا، جس نے اپنے پانی والے کو بھیجا، اس نے اپنا ڈول لٹکایا تو چلایا اے خوش نصیبی! یہ ایک لڑکا ہے، کارواں والوں نے ایک سرمایہ کی چیز سمجھ کر یوسف کو مخفی رکھا اور خدا ان کے کاموں سے آگاہ تھا، (مصر پہنچ کر) ان لوگوں نے معمولی قیمت پر چند درم میں بیچ ڈالا، کیوں کہ وہ یوسف کی قدر نہیں جانتے تھے۔

کارواں سے ان ہی اہل مدین کو مراد لینا چاہئے، اور مسلمان مفسرین نے بھی

(۱) ایضا: ج۲،۲/

ایسا ہی سمجھا ہے (معالم، تفسیر سورۂ یوسف)

قرآن پاک میں مدین کا ذکر دو سبب سے آتا ہے، اول حضرت شعیب اور دوم حضرت موسیٰ کے تعلق سے۔(۱)

سبا

توراۃ میں شبا ایک جدّ قبیلہ کا نام ہے، عرب روایات کے مطابق اس جد قبیلہ کا نام عمر یا عبد شمس اور لقب سبا تھا، محققین جدید بھی زیادہ تر اس کو لقب خیال کرتے ہیں، لغویین عرب کی رائے ہے کہ یہ ''سبی'' سے مشتق ہے، جس کے معنی غلام بنانے کے ہیں، چونکہ عبد شمس بہت بڑا فاتح تھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے غلام بنایا، اس لئے اس کا لقب سبا قرار پا گیا، تحقیق جدید یہ ہے کہ ''اسبی'' اور ''سبا'' اس معنی سے ماخوذ ہے، جس کا مفہوم ''تجارت'' ہے، کتبات میں عموماً ''سبا'' کا مادہ تجارتی سفر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج۲۳/۹۵۵)

عربی زبان میں یہ اب تک شراب کی تجارت اور خرید وفروخت اور اس کے لئے سفر کے معنی میں مستعمل ہے، سبا چونکہ تاجر قوم تھی، اس لئے اس لقب سے مشہور ہوئی، ہماری رائے ہے کہ چونکہ حضرت داؤد کی زبور میں جس کا زمانہ تصنیف دسویں صدی ق م کا وسط حصہ ہے، شاہان سبا کا ذکر صریح موجود ہے، اس لئے سبا کا ابتدائی زمانہ عروج ۱۱۰۰ق م سے کسی حال میں کم نہیں ہوسکتا، سبا کا اصلی مرکز حکومت جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا، اس کا دار الحکومت شہر مأرب تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ مغرب میں حضرت موت تک وسیع ہو گیا تھا۔

سبا میں سد مأرب کے دائیں بائیں مشرق ومغرب میں دو بڑے دروازے تھے، جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ وراست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا، اس نظام آب رسانی سے چپ وراست دونوں جانب اس ریگستانی اور شور ملک کے اندر ۲۰۰ رمیل مربع

(۱) تاریخ ارض القرآن ج۲۔۲/۲۔۳

میں سینکڑوں کوس تک بہشت زار تیار ہوگئی تھی، جس میں انواع واقسام کے میوے اور خوشبودار درخت تھے، ان کی خوشبو دور تک پھیلی رہتی تھی، قرآن مجید ان آیات کی طرف اشارہ کرتا ہے: لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ [سبا:۱۵] (سبا کے لوگوں کے لئے خود ان کے گھر میں قدرت خدا کی ایک عجیب نشانی موجود تھی، دو باغوں (کا سلسلہ) داہنے بائیں، سبا کے لوگو! اپنے پروردگار کی روزی کھاؤ اور شکر کرو، شہر ہے پاکیزہ، اور پروردگار ہے بخشنے والا۔(۱)

ملکۂ سبا

توراۃ، انجیل اور قرآن مجید میں سبا کی ایک شہزادی کا ذکر ہے جو حضرت سلیمانؑ کی بارگاہ میں آئی تھی، قرآن مجید نے کوئی تعیین خاندان وجہت نہیں کی ہے، لیکن تمام مفسرین ومؤرخین اس کو عرب قحطانی اور باشندۂ یمن سمجھتے ہیں، توراۃ میں صرف ''سبا کی شہزادی'' کا لفظ بلاتعیین خاندان وجہت ہے۔(متی ۱۲-۴۲۔لوقا:۱۱-۳۱) یمن کے عرب کے یہود میں اس کا نام بلقیس مشہور تھا اور اسرائیلیات کے ذریعہ یہی نام مسلمان مؤرخین اور اہل تفسیر میں مقبول ہے، لیکن لفظی دلالت کے لحاظ سے یہ عربی نہیں، بلکہ یونانی اصل نام معلوم ہوتا ہے، بعض مرویات تفسیر میں بلقیس کو پری زاد کہا گیا ہے، یعنی اس کی ماں (بلقمہ) ایک پری تھی، لیکن یہ روایتیں بالکل لغو اور موضوع ہیں، بلقمہ کو ممکن ہے کہ یمن کے مشہور دیبی ''المقہ'' سے کوئی نسبت ہو، اسی طرح اہل تاریخ کا سبا (بلقیس) بنت شرجیل لکھنا بھی غلط ہے، شرجیل حمیر کا بادشاہ اور حضرت سلیمانؑ سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد تھا، انجیل کی شہادت اور روایات عرب کا تواتر ہے کہ اصل مرکز کے لحاظ سے وہ یمن ہی کی کہی جائے گی، یعنی (جنوب عرب کی)، سبا کا نام قرآن مجید میں دوبار آیا ہے، اول حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں ملکہ سبا کے نام سے اور دوسری بار سیل عرم کے ذکر میں، ملکہ سبا کا قصہ

(۱) تاریخ ارض القرآن ج۱/۱۹۳

سورۂ نمل میں مذکور ہے (نمل:۲۰-۴۴)۔

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ سبا کا مذہب آفتاب پرستی کا تھا: ''وجدتها وقومها يسجدون للشمس من دون اللّٰه'' (میں نے سبا کی ملکہ اور اس کی قوم کو خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے پایا)۔(۱)

کعبہ:

کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا، اور سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ أول بيت وضع للناس [آل عمران:۹۶] (سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا)۔

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن کے بیان کے مطابق (حج:۳۳) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی البیت العتیق (پرانا گھر) تھا، نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی۔

کعبہ کے لغوی معنی ''چوکھونٹے'' کے ہیں، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے، اس لئے کعبہ کے نام سے مشہور ہوا، یونانی تاریخوں میں کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے: ثمودیوں اور سباوالوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں (گبن کی تاریخ عروج وزوال روم باب:۵۰) اور

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۱/۲۱۲

ثمود کا مقام شام وحجاز کے حدود میں تھا، اور سبا کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دنوں ملکوں کے درمیاں حجاز ہی ہے، اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں، خانۂ کعبہ ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی خانۂ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکولیس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسۂ مشاورت کیا، اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذرہ رسوم فوراً حملہ کر دے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا: تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے، جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص رہتے ہیں، اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں (نتائج الأفہام فی تقویم العرب قبل الاسلام محمود پاشا فلکی، مطبع امیریہ بولاق مصر: ۳۵ بحوالہ فرنچ ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۸۳ء)

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے، ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے، اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بہ کثرت ملتا ہے، مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف: الامعان فی أقسام القرآن مطبوعہ کویت ۱۴۰۰ھ - ۱۹۸۰ء ص: ۳۶ تا ۳۸ میں اس قسم کے اشعار جمع کر دئے ہیں۔ یہاں تک عیسائیوں کے یہاں بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ ملتا ہے، عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کو قائم کرنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا (کتاب الأمکنۃ والأزمنۃ ج ۲/۱۶۱ باب ۴۰)۔

اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک میں پہنچنے میں کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے(۱)۔

(۱) سیرۃ النبی ج ۱/۱۷۸-۱۸۰

واد غیر ذی زرع (یا عرب)

''عرب'' اعراب سے مشتق ہے، جس کے معنی زبان آوری اور اظہار مافی الضمیر کے ہیں، چونکہ عرب کی قوم نہایت زبان آور اور فصیح اللسان تھی، اس لئے اس نے اپنا نام عرب رکھا، اپنے سوا تمام دنیا کو اس نے عجم یعنی بے زبان کے نام سے پکارا، لیکن حقیقت میں یہ صرف نکتہ آفرینی اور دقت رسی ہے، دنیا میں ہر قوم اپنی زبان کی اسی طرح جوہری ہے جس طرح عرب۔

علمائے انساب کہتے ہیں کہ اس ملک کا پہلا باشندہ یعرب بن قحطان تھا، جو یمنی عربوں کا پدر اعلی ہے، اس لئے اس ملک کے باشندوں کو اور نیز اس ملک کو عرب کہنے لگے، لیکن یہ بالکل خلاف قیاس اور معلومات تاریخی کے مخالف ہے، نہ یعرب اس ملک کا پہلا باشندہ تھا، اور نہ لفظ عرب کسی قاعدہ لسانی کے موافق یعرب کی طرف منسوب ہوسکتا ہے، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یعرب کا مسکن یمن تھا، اس لئے سب سے پہلے خود یمن یعنی جنوبی عرب کو عرب کہنا چاہئے، لیکن اس کے بالکل برخلاف عرب کا لفظ پہلے شمالی عرب کے لئے مستعمل ہوا۔

اہل جغرافیہ کہتے ہیں اور بالکل صحیح کہتے ہیں کہ ''عرب'' کا پہلا نام ''عربۃ'' تھا، جو تخفیفاً بعد کو عموماً ''عرب'' بولا جانے لگا، اور اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار دیا گیا، چنانچہ شعرائے عرب کے اشعار سے بھی جو عرب کی تنہا ڈکشنری ہے، اس کی تصدیق ہوتی ہے، اسد بن جاحل کہتا ہے:

وعربة أرض جد في الشر أهلها كما جد في شرب النقاخ ظماء

لفظ عرب عبرانی زبان میں بیاباں اور میدان کو کہتے ہیں، قرآن مجید میں لفظ ''عرب'' ملک عرب کے لئے کہیں نہیں بولا گیا، حضرت اسماعیلؑ کی سکونت کے ذکر میں واد غیر ذی زرع یعنی وادی ناقابل کاشت کہا گیا ہے، لفظ ''عرب'' سب سے پہلے ۱۰۰۰ء ق م

حضرت سلیمانؑ کے عہد میں سننے میں آتا ہے، اور پھر اس کے بعد عام طور سے اس کا استعمال عبرانی، یونانی اور رومانی تاریخوں میں نظر آتا ہے۔(۱)

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں عرب کا لفظ اس سرزمین کے لئے پیدا بھی نہیں تھا، یہ لفظ مجموعہ توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا کہ یہ شام کی جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا اور کبھی اس کا نام بیاباں تھا، اور آخر یہی بیاباں اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیاباں وصحرا ہی کے ہیں، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا: ربنا انی أسكنت من ذريتی بواد غير ذی زرع عند بيتك المحرم [ابراہیم: ۳۷] (خداوندا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لاکر بسایا ہے) تو حقیقت میں یہ ''بن کھیتی کی ترائی'' اور بے آب وگیاہ میدان'' اس وقت اس کی امتیازی صفت تھی، اور آخر میں یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی، اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسماعیل کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی: وارزق أهله من الثمرات [بقرہ: ۱۲۶] (اور خداوندا! یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہونچا)۔(۱)

مکہ یا بکہ

مکہ یا بکہ، اس کا تیسرا نام ام القری ہے، حجاز کا دارالحکومت ہے، یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر (ابراہیم) کی بنا، ایک نوجوان پیغمبر (اسماعیل) کی ہجرت گاہ اور ایک یتیم پیغمبر (محمدؐ) کا مولد ہے، شہر کا عرض البلد ۲۱ درجہ، ۳۸ دقیقہ اور طول البلد ۴۰ درجہ، ۹ دقیقہ پر واقع ہے، سطح آب سے تقریباً ۳۳۰ میٹر بلند ہے، چاروں طرف پہاڑوں نے قدرتی دیواریں کھینچ دی ہیں، بالفعل شرقاً غرباً تقریباً تیس کیلومیٹر لمبا اور جنوباً شمالاً تقریباً ڈیڑھ کیلومیٹر چوڑا ہے، مشرقی سلسلہ، شمالی سلسلہ جبل خلیج (فلق)، جبل قیقعان، جبل ہندی، جبل لعلع، جبل

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۱/ ۵۲۔۵۳
(۲) سیرۃ النبی ج ۵/ ۱۷۹

کداء سے مرکب ہے، آخر الذکر پہاڑی وہی ہے جس کی راہ سے رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن داخل ہوئے تھے، جنوبی سلسلہ جبل ابوحدیدہ، جبل کدی اور جبل ابوقبیس کے بعض سلسلہ سے مرکب ہے، مشرق میں جبل ابی قبیس اور اس کے پیچھے جبل خندمہ اور مغرب میں جبل عمر واقع ہے۔

حضرت مسیح سے ڈھائی ہزار برس پہلے یہ کاروان تجارت کا ایک منزل گاہ تھا، تقریبا دو ہزار ق م میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند عزیز حضرت اسماعیلؑ کو یہاں آباد کیا، باپ بیٹے نے خدا کے نام پر یہاں ایک قربان گاہ بنائی، جس کا نام کعبہ قرار پایا، فرزندان اسماعیل کی اولاد ایک مدت تک یہاں دیگر قبائل پر بالادست رہی، اس کے بعد قحطانی قبائل (بروایت عام) آئے اور انہوں نے استیلا حاصل کیا، بنو اسماعیل میں سے قصی نے آخر یہاں کی ریاست حاصل کی، قصی قریش کا پدر اعلی تھا، آخر زمانہ میں یہاں کے مالک قریش تھے، امور مملکت اور صیغہائے حکومت ایک ایک شیخ خاندان کے زیر نگرانی تھے، شہر کے علاوہ اسماعیلی قبائل شہر کے آس پاس بھی آباد تھے، مکہ کے جنوب میں جو پہاڑیاں ہیں وہ مشہور قبیلہ ہذیل کا مسکن تھیں، جنوب کی طرف وادی القری ہے جو قدیم قبائل کا مسکن تھا، اس کے اطراف میں قبائل کنانہ رہتے تھے، مکہ کے پاس جبل حبشی کے دامن میں قبائل احابیش رہتے تھے۔(۱)

یثرب

مدینہ منورہ کا نام قبل ہجرت نبویؐ یثرب تھا، ہجرت کے بعد اس کا نام بدل کر مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہوا اور کثرت استعمال سے ''ال'' قائم مقام مضاف الیہ ہو کر المدینہ رہ گیا، یہ شہر سمندر کی سطح سے ۶۱۹ میٹر بلند ہے اور طول ۳۹ درجہ، ۵۵ دقیقہ اور عرض ۲۴ درجہ، ۱۵ دقیقہ شمال خط استوا پر واقع ہے، پہلے یہاں عمالیق آباد تھے، لیکن عہد اسلام میں یہود اور قبائل اوس وخزرج آباد تھے، محققین حال کا بیان ہے کہ یثرب مصری لفظ ہے، ''اتھربیس'' کی تعریب ہے، اوس وخزرج وہی قبائل

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۱/ ۸۳۔۸۴۔

ہیں ،جن کا لقب اسلام میں انصار ہوااور جنہوں نے اسلام کی دعوت اولین قبول کی اور مسافرین اسلام کو اپنے گھروں میں اتارا اور جس کی مکافات میں خداوندتعالی نے انصار کے نام سے ان کو زندگی جاوید بخشی اوران کے شہر کو ۳۵ رکروڑ نفوس کا مرکز قرار دیا۔(۱)

طائف

لو لاأنزل هذاالقرآن على رجل من القريتين عظيم [زخرف:۳۱]

طائف حجاز کی جنت ہے، بے انتہا سرسبز وشاداب مقام ہے،امرائے حجاز عموماً گرمی وہیں بسر کرتے تھے،ابتداء قبیلہ عدوان کا مسکن تھا، بعد کو وہ مشہور قبیلہ ثقیف کے قبضے میں آیا، قبل ہجرت آنحضرتؐ یہاں دعوت اسلام کے لئے تشریف لائے ،لیکن جس طرح خلیل کے ایک شہر نے مسیح کو قبول نہیں کیا، طائف نے بھی آپ کو قبول نہ کیا،۸ھ میں آنحضرتؐ نے طائف کا محاصرہ کیا،۹ھ سردار ثقیف عروہ بن مسعود نے اسلام قبول کیا،اور خود اپنی قوم کے ہاتھ سے اسلام کی راہ میں مارا گیا،لیکن اس کی منادی بے اثر نہ رہی، اسی سال وفد ثقیف خدمت نبوی میں حاضر ہوکر عقیدت کیش ہوا۔(۲)

امام مبین

عرب کی تجارتی شاہراہ جو حجاز ہوکر یمن سے شام کو جاتی ہے،قرآن مجید نے اسی راستہ کو ''امام مبین'' (ظاہر راستہ) کہا ہے اور عرب کی تمام بڑی بڑی آبادیاں اسی کے دائیں بائیں واقع تھیں،اصحاب الایکہ اور مؤتفکہ یعنی حضرت لوط کا گاؤں جو بحرمیت کے قریب تھا،اسی راستہ پر آباد تھے،قرآن کہتا ہے: وإنهما لبإمام مبين، [حجر:۷۹] (یہ دونوں گاؤں کھلے راستہ پر ہیں)۔

سبا کے تجارتی قافلوں کے ذکر میں ہے:وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فيها قُرىً ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَسِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّاماً آمِنِينَ[سبا:۱۸]

(۱) تاریخ ارض القرآن ج۱/۸۴۔
(۲) تاریخ ارض القرآن ج۱/۸۵۔

(ہم نے ان کے ملک اور بابرکت آبادیوں (شام) کے درمیان بہت ہی کھلی آبادیاں قائم کردی تھیں اوران میں سفر کی منزلیں مقرر کردی تھیں کہ ان میں دن رات بے خوف وخطر چلیں)۔

یہ ان ہی آبادیوں کی طرف اشارہ ہے،حضرت یوسفؑ کے قصہ میں ایک قافلہ تجارت کے جس راہ سے گزرنے کا ذکر ہے وہ یہی راستہ ہے۔تورات کے الفاظ یہ ہیں: ناگاہ (یوسف کے بھائیوں نے) دیکھا کہ اسماعیلیوں کا قافلہ جلعاد کی طرف سے آرہا ہے.....اور مصر کو جارہا ہے،قرآن میں یہ الفاظ ہیں:وجاءت سيارة (یوسف:۱۹) یہ قافلہ جو تجارت کا مال عرب سے مصر لئے جاتا تھا، اسی شاہ راہ سے گذر رہا تھا، اصحاب الأیکہ یعنی ددان کا قرآن نے اسی راستہ پر ہونا بیان کیا ہے۔تورات بھی اس کی تائید سے خالی نہیں ہے، یونانیوں کی تاریخ میں بھی اس راستے کا ذکر ہے،ایک یونانی مؤرخ لکھتا ہے:''یہیں سے ایک سیدھی سڑک اس شہر کو جاتی ہے،جس کا نام پٹرا (رقیم) ہے،اور فلسطین (شام) کو جاتی ہے،(یمامہ وبحرین) معین اور تمام عرب قریب میں رہتے ہیں،(برٹن کی گولڈ مائنس آف مدین ص:۱۷۹۔۱۸۰)(۱)۔

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۲/۹۰۔۹۱۔

الفاظ قرآن

شرحِ صدر

منجملہ نبوت کے ان خصائص کے جو ایک پیغمبر کو عطا ہوتے ہیں، شق صدر یا شرح صدر ہی ہے، چنانچہ یہ رتبۂ خاص پیش گاہ الٰہی سے آنحضرت کو مرحمت ہوا، شق صدر سے مراد یہ ہے کہ سینۂ مبارک کو چاک کر کے اس کو بشری آلودگیوں سے پاک اور ایمان وحکمت کے نور سے منور کیا گیا، بعض روایتیں ایسی بھی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی یہ کیفیت آپؐ پر گزری تھی، تمام روایتوں کے جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپ پر اس کیفیت کا گزرنا ظاہر ہوتا ہے، ایک جب آپؐ چار پانچ سال کے تھے، اور حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پا رہے تھے، دوسرے جب عمر شریف دس برس کی تھی، تیسرے جب آپ بیس برس کی عمر کو پہونچے، چوتھے جب حضرت جبرئیل سب سے پہلی دفعہ وحی لے کر آئے، پانچویں معراج کے موقع پر۔

ہمارے نزدیک (شق صدر کیلئے) صحیح اصطلاح شرحِ صدر ہے جیسا کہ صحیح مسلم (باب الاسراء) میں حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت میں مذکور ہے: "فشرح صدری الیٰ کذا و کذا" (میرا سینہ یہاں سے یہاں تک کھولا گیا) اور قرآن مجید کی اس سورت میں جیسا کہ ترمذی میں ہے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے: الم نشرح لك صدرك ووضعنا عنك وزرك الذی أنقض ظهرك [شرح:۱-۳] (کیا ہم نے تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تجھ سے تیرے اس بوجھ کو ہٹا نہیں دیا، جس نے تیری پیٹھ کو توڑ دیا تھا"۔

شرح کے لغوی معنی عربی میں "چیرنے پھاڑنے" کے ہیں، اسی سے طب کی

اصطلاح "علم تشریح" اور "تشریح اجسام" نکلی ہے، چونکہ چیرنے اور پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہو جاتی ہے، اس لئے اس سے تشریحِ امر اور تشریحِ کلام، شرحِ بیان اور شرحِ کتاب وغیرہ مجازی معنی پیدا ہوئے ہیں، اسی سے ایک اور محاورہ شرحِ صدر کا پیدا ہوا ہے، جس کے معنی سینہ کھول دینے کے ہیں اور کلامِ عرب میں اس سے مقصود بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کر دینا ہوتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے، حضرت موسیٰ کو جب فرعون کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی تو آپ نے دعا مانگی: رب اشرح لي صدري ويسرلي أمري واحلل عقدة من لساني يفقهوا قولي. [طٰہٰ:۲۵-۲۸] (پروردگار! میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں)(۱)۔

عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل ونادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے، اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم ومعرفت اور اطلاع وآگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی وتسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک وشبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت ومسرت حاصل ہو جاتی، جمہرہ ابن درید میں ہے: والشرح من قولهم شرحت لك الأمر أی أوضحته و كشفته و شرح الله صدره فانشرح اذا اتسع بقبول الخير [۲-۳۴]۔ (شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا، یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا)۔

---

(۱) سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۷۱۔

صحاح جوہری میں ہے:الشرح الکشف: تقول: شرحت الغامض اذا فسرته (شرح یعنی کشف (کھولنا)،تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی یعنی اس کی تفسیر کردی)۔

لسان العرب میں ہے:الشرح الکشف یقال: شرح فلان أمری: أوضحه وشرح مسألة مشکلة بینها، وشرح الشيءُ بشرحه شرحا وشرحه: فتحه بینه وکشفه وکل ما فتح من الجواهرفقد شرح أیضاً، تقول : شرحت الغامض إذ فسرته ، وشرح اللّٰه صدره بقبول الخیربشرحه شرحا فانشرح: وسعه لقبول الحق فاتسع۔ قال ا بن الاعرابی: الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البیان، والشرح الفهم.

(شرح یعنی کشف ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کردی یعنی اس کو واضح کردیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کردی یعنی اس کو بیان کردیا اور کسی چیز کی شرح کردی یعنی تفصیل کردی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی، تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی یعنی تفسیر کردی، اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کردیا تو وہ وسیع ہوگیا)۔

ابن اعرابی نے کہا، شرح کے معنی ہیں، یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔

شرح صدر اور ''سینہ کھولنے'' کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رویا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینہ مبارک کو واشگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور اس سے سینہ مبارک کو معمور کرکے شگاف کو برابر کردیا، (صحیح بخاری وصحیح مسلم ونسائی ابواب معراج) اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو چاک کرکے اور زمزم کے پانی سے پاک وصاف کرکے ایمان

اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے، تو بھی یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا، بہر حال شرح صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے سورۂ زمر میں ہے: أفمن شرح اللّٰه صدره للاسلام فهو علی نور من ربه[زمر:٣٣] (بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو تو وہ اپنے پروردگا کی طرف سے روشنی میں ہے) اسلام کے لئے سینہ کو کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین آگیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہے، یہی شرح صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی وبیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔(۱)

خاتم

ختم کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے، اسی سے اس کے دوسرے معنی کسی شے کو بند کرکے اس پر مہر کرنے کے ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر سے نہ کوئی چیز باہر نکلی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر گئی ہے، اور چونکہ یہ عملِ مہر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے، اس لئے اس کے معنی انتہا اور ختم کرنے کے بھی آتے ہیں، قرآن مجید میں یہ معنی مستعمل ہوئے ہیں مثلاً: الیوم نختم علیٰ افواههم [یٰس:٦٥] (آج (قیامت کے دن) ان کے منہ پر مہر لگادیں گے (یعنی بند کردیں گے) کہ بول نہ سکیں)۔

یہاں ختم کے معنی ''بند کردینے'' کے بالکل ظاہر ہیں: ختم اللّٰه علیٰ قلوبهم [بقرہ:٧]

(خدا نے ان (کافروں) کے دلوں پر مہر لگادی ہے (یعنی ان کے دلوں کے

(۱) سیرۃ النبی ج/۴، ص/ ۹۷-۹۹۔

دروازے بند کردیئے کہ باہر سے جو نصیحت اور ہدایت کی باتیں وہ سنتے ہیں، وہ ان کے دلوں کے اندر نہیں گھستیں اور بے اثر رہتی ہیں): وختم علیٰ سمعه وقلبه [جاثیہ:۲۳] (اور خدا نے اس کے کان پر اور دل پر مہر لگادی (یعنی اس کے کان اور دل بند کردئے)۔

کہ اس کے کان کے اندر دعوت رسول کی آواز اور اس کے دل کے اندر اس آواز کا اثر نہیں جاتا)۔ فیسقون من رحیق مختوم [مطففین:۲۵] (اہل جنت پلائے جائیں گے وہ شراب جس پر مہر لگی ہوگی)۔ وہ سربمہر یعنی بند ہوگی جو اس بات کا ثبوت ہوگی کہ یہ خالص شراب ہے، یہ کھلی نہیں کہ اس کے اندر کی خوشبو باہر نکل گئی ہو اور نہ اس کے باہر سے کوئی چیز کسی نے ملادی ہے، جس سے اس کی تیزی کم ہوگئی ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، ختامه مسك [مطففین:۲۶] (اس کی مہر مشک ہوگی (یا) اس شراب کا آخر مشک ہوگا)۔

بہر حال ان تمام استعمالات سے یہ بالیقین معلوم ہوگا کہ اس لفظ کے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کے بند کرنے کے ہیں، لفظ ''خاتم'' کی دو قرأتیں ہیں، مشہور قرأت تو ''خاتم'' (بکسر تاء) کی ہے، جس کے معنی ختم کرنے والے اور بند کرنے والے کے ہوئے اور دوسری قرأت ''خاتم'' کی ہے، جس کے معنی ہیں: وہ شے جس کے ذریعے سے کوئی شے بند کی جائے اور اس پر مہر لگائی جائے، تاکہ وہ کھولی نہ جاسکے اور نہ اس کے اندر کوئی چیز باہر سے جاسکے، الغرض دونوں حالتوں میں آیتِ پاک کا حاصلِ معنی ایک ہی ہوگا کہ آپ کا وجود پیغمبروں کے سلسلے کو بند کرنے والا اور ان پر مہر لگادینے والا ہے کہ پھر آئندہ کوئی نیا شخص اس جماعت میں داخل نہ ہوسکے(۱)

مبشر اونذیرا

خلیل اللہ کے معنی اللہ کے دوست کے ہیں اور یہ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے، لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے انبیاء کرام اللہ کے دوست نہ تھے، اسی طرح حضرت

(۱) سیرۃ النبی ج۳ ص۴۶۱۔۴۶۰

موسیٰ کا لقب کلیم اللہ مشہور ہے، جس کے معنی ہیں: خدا سے باتیں کرنے والا، اسی طرح حضرت عیسیٰ کو روح اللہ کہتے ہیں حالانکہ تمام انبیاء اور نہ صرف انبیاء بلکہ ہر انسان کی روح خدا ہی کی روح ہے، اسی طرح قرآن نے حضرت محمدؐ کو شاهدا و مبشرا ونذیرا وداعیا الی اللّٰه باذنه سراجامنیرا [احزاب:۴۵] کہا ہے۔ درانحالانکہ ہر نبی شہادت دینے والا، نیکوکاروں کو بشارت سنانے والا، گناہ گاروں کو تنبیہ کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا اور روشنی بخشنے والا چراغ بن کر آیا۔

عام لوگوں کو یہ شبہ اس لئے پیش آتا ہے کہ وہ زبان کے ایک نکتہ سے پہلو تہی کرتے ہیں، وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص اس کے صرف اسی وصف سے ملقب کیا جاتا ہے، جو وصف اس میں بمرتبہ کمال ہوتا ہے، باتیں ہر شخص کرتا ہے، اس لئے لغت کے لحاظ سے ہر شخص ابوالکلام ہے، مگر استعمال میں ابوالکلام اسی کو کہیں گے جس میں کلام کی خوبی اور برجستگی یا طول بوجہ کمال ہو۔

آنکھ اور ہاتھ کس انسان کے پاس نہیں، اس لئے أولو الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) بھی ہیں، مگر قرآن نے اس کو خاص طور سے انبیاء کرام کا وصف قرار دیا ہے: واذکر عبادنا ابراهیم واسحاق ویعقوب أولی الأیدی والأبصار [سورۂ ص:۴۵] (اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے)۔ ہاتھ عمل کے لئے اور بصارت علم کے لئے ہے، اس سے مقصود انسان کی عملی اور علمی قوتوں کا کمال ہے، چونکہ حضرات انبیاء کی عملی اور علمی دونوں قوتیں مرتبہ کمال پر ہوتی ہیں، اس لئے تمام انسانی طبقوں میں "أولی الایدی والأبصار" کی لقب کے وہی مستحق قرار پائے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء علیہم السلام کو مختلف اوصاف کاملہ سے یاد فرمایا۔

نذیریت کے کمال کے معنی یہ ہیں کہ اس میں خدا کی قہاری اور جباری کے اوصاف

کا ظہور زیادہ ہو، اور کمال مبشریت کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے فضل وکرم اور رحمت عام کا رنگ زیادہ نمایاں ہو، جیسا کہ خدا نے آنحضرت کو مبشر وغیرہ کہہ کر پکارا تو وہیں اس کی تصریح فرمائی" وبشر المؤمنین بأن لهم من الله فضلا كبيرا" [احزاب:۴۷] (اور ایمان والوں کو خوشخبری سنادیجئے کہ ان کے لئے خدا کی طرف سے بڑی مہربانی (فضل) ہے)۔

کسی نبی میں شانِ نذیری کا غلبہ اور کسی نبی میں شان بشیری کا کمال باہم ایک دوسرے پر ترجیح کا سبب نہیں، انبیاء علیہم السلام کے یہ دونوں اوصاف اللہ تعالیٰ کی شان جلالی وجمالی کے مظہر ہیں، کسی میں جلالی شان کی چمک زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں جمالی شان کی، جب اور جس زمانہ میں حکمت الٰہی کا اقتضا جلال یا جمال میں سے جس شان کمال کا اظہار ہوتا ہے وہ اس وقت کے پیغمبروں میں ظاہر فرماتا ہے دونوں اس کی شانیں ہیں اور دونوں اس کے اسمائے حسنیٰ۔ الملك القدوس، السلام، المؤمن، المهيمن، العزيز، الجبار، المتكبر سبحان الله عما يشركون. [حشر:۲۳] (۱)

حُلم اور رویا

عربی زبان میں خواب کے لئے دو لفظ ہیں، ایک ''حلم'' جس کی جمع ''احلام'' آتی ہے، اس کے معنی خواب وخیال کے ہیں یعنی محض وہم وتخیل، دوسرا رویا، یہ اس خواب کو کہتے ہیں جس میں حقیقت بینی اور رمز شناسی ہو، ان دونوں لفظوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ پہلے میں وسوسۂ شیطانی کا دخل ہوتا ہے اور دوسرا اس سے پاک ہے۔ فرق سورۂ یوسف کی ان آیتوں میں صاف نظر آئے گا، عزیز مصر نے خواب دیکھا ہے، اپنے درباریوں سے اس کی تعبیر پوچھتا ہے، اہل دربار کہتے ہیں کہ یہ محض خواب وخیال اور وہم ہے: يأيها الملأ أفتونى في رؤياي ان كنتم للرؤيا تعبرون، قالوا أضعاث أحلام، وما نحن بتأويل الأحلام بعالمين [یوسف:۴۳۔۴۴] (اے درباریو! میرے اس خواب کے بارے میں مجھے رائے دو، اگر خواب کی تم تعبیر بیان کر سکتے ہو، انہوں نے کہا: یہ تو محض اوہام وخیالات کا

(۱) مقالات سلیمان: ج۳، ص۲۸۴۔۳۰۵

مجموعہ ہے، ان اوہام، اور خیالات کی تعبیر سے ہم واقف نہیں ہیں)۔ اور حدیث میں بھی آیا ہے: الرؤيا من الله والحلم من الشيطان (رویا خدا کی طرف سے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے) (صحیح بخاری ومسلم وترمذی)، اس کے بعد آں حضرت ﷺ نے فرمایا: خواب تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک رویائے صالحہ، یہ خدا کی طرف سے خوشخبری ہوتی ہے، دوسری غم پیدا کرنے والا خواب، یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، تیسرا وہ خواب ہوتا ہے جو انسان کی اپنے دل کی باتیں اور خیالات ہوتے ہیں (صحیح مسلم باب صلاۃ اللیل)۔

عام انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کی رویا میں وہی نسبت ہے جو ان دونوں کی ذات میں ہے، جب عام انسانوں کی آنکھیں سوتی ہیں تو کم وبیش ان کے دل بھی سوتے رہتے ہیں، لیکن انبیائے کرام کی آنکھیں جب سوتی ہیں تو ان کے دل بیدار رہتے ہیں۔ اس طرح کی حدیثوں کی بنا پر جمہور علمائے اسلام کا فیصلہ ہے کہ انبیاء کرام کی رویا بھی اسی قدر قطعی اور یقینی ہے، جس قدر آپ (ﷺ) کے عام احکام وحی اور مخاطبات الٰہی، چنانچہ ترمذی میں حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ رؤيا الأنبياء وحي (انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے) (۱)۔

الہام

الہام کے لفظی معنی ''دل میں ڈالنے'' کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور ترتیبِ مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہوجائے۔ مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربے یا عقلی دلیل کے نتیجے کے طور پر نہیں آتا، بلکہ خود بخود دل میں آجاتا ہے۔ کیوں آتا ہے، اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہوسکتے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں، جو محققین، علما، شعراء اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ اُن کو

(۱) سیرۃ النبی ج۳/۳۰۱۔۳۰۲

دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔(۱)

وحی

وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دئے بغیر اخفا اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہے اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعے سے مطلع کرنا ہے، یہ علم واطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ اشارہ کرنا ،لکھنا، پیغام دینا ،دل میں بات ڈالنا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال میں ڈالو(لسان العرب)

۲۔لکھنا۔عجاج کا شعر ہے

حتی نحاهم جدنا والناحی لقدرکان وحاه الواحی

۳۔خط اور کتاب،لبید کہتے ہیں۔

فمدافع الریان عری رسمه خلقا کما ضمن الوحی سلامها

(تو ریان پہاڑ کے نالوں کے آثار پرانے ہوکر ایسے دھندلے ہوگئے جیسے پتھر میں لکھی ہوئی عبارت)۔

۴۔ حکم دینا،عجاج کہتا ہے:

وحی لها القرارفاستقرت

وشدها بالراسیات الثبت

(زمین کو ٹھہرنے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئی اور اسے جمے ہوئے پہاڑوں سے جکڑ دیا)۔

۵۔ چھپا کر بات کرنا،ابوذؤیب کا شعر ہے:

فقال لها وقدأوحت الیه

ألا للّٰه أمك ما تعیف

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۴۴۔

(اس مرد نے کہا جب عورت نے اس سے پوشیدہ طریقہ پر گفتگو کی کہ تیری ماں کا کیا کہنا کہ وہ کیا فال بد لیتی ہے)۔

۶۔اشارہ کرنا۔

یوحی الیها بأنقاض ونقنقة. (وہ مرغ اس مرغی کی طرف کڑکڑا کے اشارہ کرتا ہے)

۷۔آواز،ابوزبید

مرتجز الجوف بوحی أعجم.

(گھوڑے کے پیٹ سے نہ سمجھنے والی آواز آتی ہے)۔

لیکن اہلِ لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں، کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے کہ وحیت الیه بالکلام وأوحیه إلیه هوأن تکلمه بکلام تخفیه من غیره (یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ)۔ابواسحاق لغوی کہتا ہے:وأصل الوحی فی اللغة کلها إعلام فی خفاء (وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں چھپا کر اطلاع دینے کے ہیں ،قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے:

۱۔فطری حکم۔وأوحی ربك إلی النحل [نحل : ٦٨] بأن ربك أوحی لها [زلزال : ٥]

۲۔دل میں بات ڈالنا۔واذ أوحیت الی الحوارییین [مائده : ١١١]

وأوحینا الی أم موسی[قصص : ٧]

۳۔چپکے بات کرنا۔یوحی بعضهم الی بعض [انعام : ١١٣] وإن الشیاطین لیوحون إلیٰ أولیائهم[انعام : ١٢٢]

وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ''منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا'' یا اگر الفاظ ہوں تو وہ اس قدر

پوشیدہ ادا ہوں کہ دوسرے اُن کو نہ سمجھ سکیں، اس لئے اشارہ کرنا لکھنا، دل میں ڈال دینا، حکم فطری، خط اور کتابت اور جانوروں کا اپنے حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کرنا، سب اس کے معنوں میں داخل ہیں، بہر حال اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کا لفظ جس مذہبی معنی میں مستعمل ہے وہ درحقیقت لغوی معنی کے بہت قریب ہے، چنانچہ خود شعرائے جاہلیت نے اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے:

حافظ ابن قیم نے وحی کی حسب ذیل قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) رویائے صادقہ (سچ خواب دیکھنا)

(۲) نفث فی الروع یا القاء فی القلب، (دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا)

(۳) صلصلة الجرس (گھنٹے کی طرح آواز آنا)

(۴) تمثل۔ (فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا)

(۵) فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا

(۶) وہ طریقہ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا

(۷) بلاواسطہ مکالمہ، (زادالمعاد ج ۱/۱۸)۔ (سیرۃ النبی: ج/۳، ص/۱۸۲۔۱۸۴)

اسرا

اسرا کے معنی رات کو چلانے یا لے جانے کے ہیں، چونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ حیرت انگیز معجزانہ سفر رات کو ہوا تھا، اس لئے اس کو اسرا کہتے ہیں اور قرآن مجید نے اسی لفظ سے اس کو تعبیر کیا ہے: سبحان الذی أسریٰ بعبده لیلا (پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندے کو لے گیا) [بنی اسرائیل: ۱] معراج عروج سے نکلا ہے، جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، چونکہ احادیث میں آپ سے لفظ ''عُرِجَ بی'' (مجھ کو اوپر چڑھایا گیا) مروی ہے، اس لئے اس کا نام ''معراج'' پڑا۔

انبیاءؑ کے حالات اور واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اولوالعزم پیغمبروں

کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ منصب رفیع حاصل ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ کو جب نبوت عطا ہوئی ہے تو ارشاد ہوتا ہے: وکذٰلک نری ابراھیم ملکوت السماوات والأرض [انعام: ۷۶] (اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کی بادشاہی دکھاتے ہیں) یہ سیر ملکوت یعنی آسمان وزمین کی بادشاہی کا مشاہدہ کیا ہے، یہی اسراء اور معراج ہے، حضرت موسیٰ کو طور پر جلوۂ حق کا پرتو نظر آیا، وہی ان کی معراج تھی.....

اسلام نے اس خزانہ کو یہاں تک عام کیا ہے کہ اہل ایمان کے لئے دن میں پانچ دفعہ اس دربار کے کسی نہ کسی گوشہ تک رسائی ممکن کر دی ہے کہ الصلاۃ معراج المؤمنین، لیکن چونکہ حضورؐ سرور انبیاء اور سید اولاد آدم تھے، اس لئے اس حظیرۂ قدس اور بارگاہ لامکان میں آپ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی، جہاں تک کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہونچا تھا، اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جواب تک مقربان بارگاہ کی حد نظر سے باہر رہا تھا۔ (سیرۃ النبی ج ۳/۲۱۶۔۲۱۷)

علم لدنی

انبیاء علیہ السلام کا علم وفہم انسانی تعلیم وتعلم اور مادی حکمت ودانائی سے پاک ومبرا ہوتا ہے، وہ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیم الٰہی، القاء ربانی اور فہم ملکوتی ہوتا ہے اسی کا نام علم لدنی ہے۔ لدن کے معنی عربی زبان میں پاس اور نزدیک کے ہیں، چونکہ یہ علم (انبیاء کو) کسب وتحصیل کے بغیر خدا کے پاس سے اور اس کے نزدیک سے عطا ہوتا ہے، اس لئے عرف عام میں علم لدنی کہلاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: وعلمناہ من لدنا علما، (ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا)۔ (سیرۃ النبی ۳/۲۷۱)۔

علم کی لغوی معنی جاننے کے ہیں، مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت

اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی، انبیاء کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات وصفات، دین وشریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی، حضرت ابراہیم توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں: یـاأبـت إنـي قـدجـاء نـي من العلم مالم يأتك[مریم:۴۳] (اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا جو تیرے پاس نہیں آیا)، حضرت خضر کے متعلق ہے: وعـلـمـنـاه مـن لـدنـاعلما [کہف: ۶۵] (اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا)، خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شئی جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش اور جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے، اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم واستدلال اور تلاش وتحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، یہی علم خداداد ہے، اور اس لئے صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا) علم کہتے ہیں۔(۱)

علم وحکم

حکم کے معنی لغت میں فیصلے اور حق وباطل میں تمیز کرنے کے ہیں، جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ یعنی فیصلہ کرسکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں: والـحـكـم بـالشـيئ أن تـقضى بالشئى بأنه كذا أو ليس كذاسواء ألزمت ذلك غيره أولم تلزمه (کسی شئی پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شئی ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کرسکو یا نہ کرسکو)۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے کہ: الـحـكـم الـعلم والفقه والقضاء بالعدل (حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے)۔

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم وحکم کے طرف

(۱) سیرۃ النبی: ج/۴۔ص/۹۴۔۹۵

اشارہ ہے، چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے: ولـمـا بـلـغ أشـده آتيناه حكماوعلما [یوسف: ۲۲] (اور جب یوسف جوانی کی قوت کو پہنچے تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا)۔

سورۂ انبیاء میں حضرت لوطؑ، داوٗدؑ اور سلیمانؑ کے متعلق علم وحکم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت یحییٰ کے متعلق سورۂ مریم میں حکم کا لفظ آیا ہے، سورۂ جاثیہ میں بنی اسرائیل کو کتاب، حکم اور نبوت سے نوازے جانے کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں حکم سے اشارہ دنیاوی حکومت اور سلطنت کی طرف نہیں ہے۔ کیونکہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے۔ یہ اہل عجم کا محاورہ ہے۔ قرآن کریم نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ سورۂ انعام میں حضرت ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داوٗد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام ان اٹھارہ ناموں کے بعد آیا ہے: اولـئك الـذين آتيناهم الكتاب والحكم والنبوة (یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی)۔

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے، جس سے صاف وصریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم وفہم، فیصلہ، اور حق وباطل میں تمیز ہے۔(۱)

تبیین کتاب

بیان اور تبیین کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں، اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے: ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفاء کے مقابل، دوسرے توضیح وتفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ تبیین اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ مثلا ایک جگہ قرآن پاک میں آیا ہے: یاآهل الكتاب قدجاء كم رسولنا يبين لكم كثيرا مماكنتم تخفون من الكتاب ويعفواعن كثير [مائدہ: ۱۵] (اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے، وہ ان کو تمہارے لئے

(۱) سیرۃ النبی: ج/۴۔ص/۹۵۔۹۷

ظاہر کردے، اور بہت سی باتوں سے درگزر کردے) یہاں تبیین صریح طور پر سے اخفا کے مقابلہ میں ہے، اس لئے یہاں تبیین کے معنی یقینی طور پر اظہار واعلان کے ہیں، لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے: وما أنزلنا علیك الکتاب إلا لتبین لهم الذی اختلفوا فیه وهدی ورحمة لقوم یؤمنون [نحل:۶۴] (اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری، لیکن اس لئے تاکہ تو واضح کردے اس کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا، اور ایمان والوں کے لئے رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا)۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں، بلکہ توضیح وتشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ اس توضیح وتفسیر کے بعد دور ہوجائے، اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہئے، جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے: وأنزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیهم ولعلهم یتفکرون [نحل:۴۴] (اور ہم نے اے پیغمبر! تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا، تو اس کو ان کے لئے کھول کر بتادے شاید کہ وہ سوچیں)۔

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح وتفصیل کرنے کے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور وفکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح وتفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہوسکتا ہے مگر سوچنے کے نہیں، سوچنے اور غور وفکر کرنے کے لئے یہاں تشریح وتفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار واعلان کی، اب جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تفصیل وتبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل وتبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین وتشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہوگا، جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے تھے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۱۰۲-۱۰۱

حکمت

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں، ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے، آل ابراہیم پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے: فقد آتینا آل ابراهیم الکتاب والحکمة وآتیناهم ملکا عظیماً [نساء:۵۴] (تو بیشک ہم نے ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی، اور ان کو بڑی سلطنت بخشی)۔ دوسری آیت: (ولقد آتینا لقمان الحکمة [لقمان: ۱۲]) (اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی) میں حضرت لقمان کو حکمت دئے جانے کا بیان ہے..... تیسری آیت: (وشددنا ملکه وآتیناه الحکمة وفصل الخطاب [ص:۲۰]) (اور ہم نے داؤد کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا)، اور چوتھی آیت: (وقتل داؤد جالوت وآتاه الله الملك والحکمة [بقرہ:۲۵۱]) (اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی) میں حکمت کا اطلاق زبور پر، پانچویں: قد جئتکم بالحکمة ولأبین لکم بعض الذی تختلفون فیه [زخرف:۶۳] (میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں) اور چھٹی آیت: واذکر نعمتی علیك وعلی والدتك إذ أیدتك بروح القدس تکلم الناس فی المهد وکهلا وإذ علمتك الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل [مائدہ:۱۱۰] (اور یاد کرو جب میں نے تجھ کو کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کی تعلیم دی)، اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ''حکمت والا قرآن'' ظاہر کی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ جس حکمت کی تعلیم دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی..... ایک حدیث میں بعض اشعار کو حکمت کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اس کے اردو مفہوم سے بلند تر ہے، حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے۔ اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل وفہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اور اردو میں اس

حقیقت کو حکمت کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے، یعنی الہامی حکمت۔(۱)

حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم وعرفان کے معنی میں ہے جو نورالٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار ومظاہر رسولؐ کی زبان سے کبھی مصالح واسرار اور کبھی سنن واحکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس عملی علم وعرفان کے ان آثار ونتائج پر بھی ہوتا ہے، جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن مجید میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں، ایک سورۂ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت وتعظیم، قرابت داروں اورمحتاجوں کی امداد کی نصیحت اورفضول خرچی، بخل، اولادکشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اوریتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اورتولنے اورزمین پراکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

ذٰلك مماأوحىٰ اليك ربك من الحكمة [بنی اسرائیل:۳۹] (یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا)۔سورۂ لقمان میں ہے کہ: وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلّٰه [لقمان:۱۲] (اورہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کر)۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی اسی طرح تشریح کی گئی ہے، جس طرح سورۂ بنی اسرائیل میں موجود ہے۔(۲)

حکمت کے لغوی معنی دانائی کی بات اور کام کے ہیں، سب سے قدیم لغت نویس ابن درید جمہرۃ اللغۃ میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے: فكل كلمة وعظتك أوزجرتك أو دعتك الى مكرمة أو نهتك من قبيح فهى حكمة و حكم (ہروہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز

(۱) سیرۃ النبی ج/۴،ص/۸۵۔۹۳
(۲) سیرۃ النبی ج۶/۱۰

سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے)، لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں: والحكمة إصابة الحق بالعلم والعقل، فالحكمة من الله معرفة الاشياء وايجادها على غاية الاحكام من الإنسان معرفة الموجودات وفعل الخيرات (اورحکمت، علم اورعقل کے ذریعہ سے سچی اور صحیح بات کو پہنچنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اوران کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے، اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اوراچھی باتوں کا کرنا ہے)۔

یہ عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں، اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اورشریعت کے استدلالات اورمحاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ابن حبان اندلسی نے اپنی تفسیر ''البحرالمحیط'' میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے:

قال مالك وأبورزين: الحكمة الفقه فى الدين والفهم الذى هو سجية ونورمن الله. (امام مالکؒ اورابورزینؒ کا قول ہے: حکمت دین میں سمجھ اوراس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اوراللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے)۔

وقال مجاهد: الحكم فهم القرآن (مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم)

وقال مقاتل: العلم والعمل به لايكون الرجل حكيما حتى يجمعهما. (مقاتل کا قول ہے: حکمت علم اوراس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں، کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا، جب تک وہ علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو)۔

بعضوں کا قول ہے کہ حکمت فیصلہ کرنا ہے، کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسول کے سوا کسی اور کے ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔ابن جریر طبریؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ مالک کا قول ہے کہ دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اوراس کی پیروی حکمت ہے، ابن زید کا قول ہے کہ حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے، قتادہ سے مروی ہے: حکمت سنت الٰہی ہے، امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں

قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: الحکمة سنة رسول اللہ ﷺ (وہ کہتے ہیں کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے)۔

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں، حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح وغلط، صواب وخطا، حق وباطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز وفیصلہ، بذریعہ غور وفکر، دلیل وبرہان اور تجربہ واستقرا کے نہیں، بلکہ منکشفانہ طور سے ہوجاتا ہے۔ اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا قول بھی ہوتا ہے۔(۱)

تزکیہ

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں یہ کہا ہے: ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة (یہ پیغمبر لوگوں کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے) اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں: ایک پاک وصاف کرنا جس کو قرآن پاک نے ''تزکیہ'' کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

''تزکیہ'' کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں۔ قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینے کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے: وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا [شمس:۷-۱۰] (قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا، وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا)۔

دوسری جگہ ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى [الاعلیٰ:۱۴-۱۵]

(۱) سیرۃ النبی ج ۳/ ۸۸-۹۰

(بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی)۔

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے: عَبَسَ وَتَوَلَّى أَن جَاءهُ الْأَعْمَى وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَى [عبس:۱-۴] (پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا)۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس ''تزکیہ'' کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہے۔(۱)

تقویٰ

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر وشر کی تمیز کے لئے خلش ہو۔ یہ ''تقویٰ'' ہے۔ تقویٰ اصل میں ''وقویٰ'' ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے، دل میں خیر وشر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقوی اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے، جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے: ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب [حج:۳۲] (اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتے ہیں تو وہ دلوں کے تقوی سے ہے) اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقوی کا اصلی تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امورِ خیر کی طرف دلوں میں

(۱) سیرۃ النبی ج/ ۶، ص/ ۱۰۔

تحریک پیدا کرتا اور شعائرِ الٰہی کی تعظیم سے اِن کو معمور کرتا ہے۔(۱)

اخلاص

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود ریا ونمائش، جلب منفعت، طلب شہرت، معاوضہ وغیرہ نہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے: فاعبداللّٰہ مخلصا له الدين، ألا للّٰه الدين الخالص [زمر:۲۔۳] تو اللہ کی عبادت کر، خالص کرتے ہوئے عبادت گذاری کو اسی کے لئے، ہشیار کہ اللہ ہی کے لئے خالص اطاعت گذاری۔(۲)

توکل

توکل کے لفظی معنی ''بھروسہ کرنے'' کے ہیں، اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں۔لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا۔کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترکِ عمل، اسباب وتدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے۔حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا۔(۳)

توکل بے دست وپائی اور ترکِ عمل کا نام نہیں، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجے کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا

(۱) سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۲۱
(۲) سیرۃ النبی ج ۵/۲۲۴ (۳) ج ۵ ص ۲۲۷

جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کرسکتا۔اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش ومدد کارآمد نہیں ہوسکتی، اس لئے ہر مؤمن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے(۱)

صبر

''صبر'' کے لغوی معنی ''روکنے'' اور ''سہارنے'' کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے۔یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔(۲)

حضرت موسیٰ اور خضر کے قصے میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضر کہتے ہیں۔إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْراً [کہف:۶۷] (تم میرے ساتھ صبر نہ کرسکو گے اور کیسے اس بات پر صبر کرسکتے ہو، جس کا علم تمہیں نہیں)، حضرت موسیٰ جواب میں فرماتے ہیں: سَتَجِدُنِيٓ إِن شَاءَ اللّٰهُ صَابِراً [کہف:۶۹] (اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے)

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہوگیا ہے، بایں ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں :

۱۔ وقت مناسب کا انتظار کرنا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واصبر لحكم ربك، فانك بأعيننا [طور:۴۸] (اے رسول! تو اپنے پروردگار کے فیصلے کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

(۱) سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۲۸
(۲) سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۳۵

۲۔ بے قرار نہ ہو،(والصابرین علیٰ ما أصابھم) [حج:۳۵](اور جو مصیبت میں صبر کریں)

۳۔ مشکلات کو خاطر میں نہ لانا(فاصبر کما صبر أولو العزم من الرسل، ولا تستعجل لھم) [احقاف :۳۵](اے محمد! تو بھی اسی طرح پامردی کر، جس طرح پختہ ارادے والے پیغمبروں نے کی، اوران (مخالفوں) کے لئے جلدی نہ کر)

۴۔ درگزر کرنا: وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُواْ بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلاَّ بِاللّهِ وَلاَ تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلاَ تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ [نحل:۱۲۶۔۱۲۷](اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی، اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لئے یہ بہتر ہے، اور تو صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے، اوران کا غم نہ کر اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو)۔

۵۔ ثابت قدمی:وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاء والضَّرَّاء وَحِينَ الْبَأْسِ . (بقرۃ:۱۷۷) (اور صبر کرنے والے ثابت قدمی دکھانے والے، مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت وہی ہیں، جو سچ بولے، اور وہی پرہیزگار ہیں)

۶۔ ضبط نفس: وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاء بَعْدَ ضَرَّاء مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّيْ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ إِلاَّ الَّذِينَ صَبَرُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ أُوْلَئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ [ہود:۱۰۔۱۱](اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزا چکھائیں پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ نا امید اور ناشکرا ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزا چکھائیں تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں، بے شک وہ شاداں اور نازاں ہے، لیکن وہ جنہوں نے صبر (نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کئے یہ لوگ ہیں، جن کے لئے معافی اور بڑا انعام ہے)۔(۱)

۷۔ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا: فَوَقَاهُمُ اللّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ

(۱) سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۴۶

وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورا وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيراً [الدھر:۱۱۔۱۲](تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچا لیا، اوران کو تروتازگی، شادمانی سے ملایا، اوران کے صبر کرنے (یعنی احکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلے میں دیا)۔

شُکر

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ''جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو، دودھ زیادہ دے'' اس سے انسانوں کے محاورے میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہوسکتی ہیں: دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے، یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو، اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کا اظہار کریں۔

اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل وکرم سمجھا جائے اور جسم وجان وزبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ ''شکر'' ہے۔

''شکر'' کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے، خدا نے قرآن مجید میں اپنی طرف بھی کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اوران کو ان کا پورا بدلہ دیتا ہے۔(۱)

حمد

شکر کے جذبے کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کو ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے، قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے اور یہی سبب ہے کہ حمدِ

(۱) سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۴۷

الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے ان صفات کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں اور اسی لئے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے۔ اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن: سارے جہاں کے پروردگار کی حمد ہے۔(۱)

انفاق

ایمان نے بعد اسلام کے دوسب سے اہم رکن نماز اور زکاۃ ہیں، زکاۃ کی اصل روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی، اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا: یأیھا الذین آمنوا أنفقوا ممارزقناکم من قبل أن یأتی یوم لابیع فیه ولاخلة ولاشفاعة والکافرون ھم الظالمون. [بقرہ:۲۵۴] (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اس میں سے کچھ خرچ کرو، جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خریدنا ہے نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم)۔

سخاوت کے حقیقی معنی ''اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کر دینے کے ہیں'' اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں: اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کئے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرے میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرے میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لئے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں، جن کے امتیاز کے لئے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔ (سیرۃ النبی ج ۶/ ۱۷۹-۱۸۰)

سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے .... یہ بھی سخاوت

(۱) سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۴۸۔

نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے اور جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں۔(۱)

امانت:

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ دیانت داری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایمان دار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے، اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں۔

امانت کا دائرہ صرف روپئے، پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی جائے تو اس کو مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے۔ اگر کسی کا کوئی حق آپ پر ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے۔ کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنے اور ہنگامے کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنے کسی نج کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے یا بے سبب سستی کرتا ہے، یا دیر سے آتا ہے اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے، ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح

(۱) سیرۃ النبی ج ۶/ ۱۸۸

پانے کی خوشخبری سنائی وہ بھی ہیں: والذین لأماناتھم وعھدھم راعون [مؤمنون:۸] (اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں)۔(۱)

رحم

رحم انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کرید کرد یکھئے تو سب کی تہہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو، وہ کم ہے، اسی لئے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

اللہ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے، وہ رحمان (بڑا رحم والا) ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام رحیم (رحم سے بھرا ہوا) آتا ہے، قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے، اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے۔

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے اُسی کو صلۂ رحم کہتے ہیں، کیوں کہ قرابتوں کے سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہیں اور رحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ، رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: الرحم شجنة من الرحمن (بخاری) (رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے) یعنی قرابت کی رحم دلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے، اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں)۔(۲)

(۱) سیرۃ النبی ج ۶/۱۹۹۔۲۰۰۔
(۲) سیرت النبی ج ۶ ص ۲۰۷۔۲۰۹۔

عدل

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں ''عدل'' کہتے ہیں (مفردات، راغب اصفہانی) اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں، جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پورا اترے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف کرنے کا حکم ہے: ان اللّٰہ یأمر بالعدل والاحسان [نحل:۹۰] (بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے) عدل قانون کا اقتضاء ہے اور احسان کرنا اور درگذر کرنا، اخلاق کا مطالبہ ہے۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، یعنی عدل والا، واللّٰہ یقضی بالحق [مومن: ۲۰] (اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے)، یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت ہے: واللّٰہ یقول الحق [احزاب:۴] (اللہ حق بات کہتا ہے)، یہ عدل قولی کی مثال ہے۔

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہوا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے۔(۱)

عہد اور عقد

عام طور پر لوگ ''عہد'' کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے. وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے، جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے، اس لحاظ

(۱) سیرۃ النبی ج ۶ ص ۲۱۰۔۲۱۲۔

سے یہ مختصر سالفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لئے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے، اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے۔ ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے۔:"والموفون بعهدهم إذا عاهدوا [بقرہ:۱۷۷] (اور اپنے قول وقرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے)، قرآن مجید میں قریب قریب اسی ''عہد'' کے معنی میں ایک اور لفظ ''عقد'' کا استعمال کیا گیا ہے (یا ایھا الذین اٰمنوا أوفوا بالعقود [مائدہ:۱] (مسلمانو! اپنے قراروں کو پورا کرو۔) ''عقد'' کے لفظی معنی ''گرہ'' اور ''گرہ لگانے کے'' ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاحِ شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے۔ (تفسیر کبیر ج۵ ص۵۸۵)۔

لیکن ''عقد'' کا لفظ صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور ''عہد'' کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں تک کہ تعلقات کو اُس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہوتی ہے حسنِ عہد میں داخل ہے۔ (۱)

احسان

عربی میں ''احسان'' کے معنی اچھا کام کرنے کے اور کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنے کے ہیں، اردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں اِلی یا بِ کے صلے کے ساتھ ہوگا۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں مُحسِنٌ یا مُحسِنِینَ یا مُحسِنُونَ کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں ان سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لئے جائیں گے، اس اچھے کام کرنے اور اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان وکرم بھی داخل ہوسکتا ہے، لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے۔ جیسے: ان اللہ لا یضیع أجر المحسنین. [توبہ: ۱۲۰] (بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا)۔

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/۲۱۶۔۲۲۰۔

احسان کے لئے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے:

ولا تنسوا الفضل بینکم (آپس میں فضل کو مت بھولو یعنی احسان کو مت بھولو) ابن جریر طبری ج۲ ص۳۲۰)۔(۱)

معروف اور بر

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک اور جامع لفظ ''معروف'' کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً وشرعاً معلوم ہو، معروف میں داخل ہے۔ قرآن کا حکم ہے: وأمر بالعرف [اعراف:۱۹۹] (اور نیکی کرنے کو کہہ) اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ کل معروف صدقة (ہر نیکی ثواب کا کام ہے) (سیرۃ النبی ج۶ ص۲۲۳)

اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ بِر استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں سب کو شامل کرلیا ہے: لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین [ممتحنہ:۸] (جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اُن کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو خدا تم کو منع نہیں کرتا، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔(۲)

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے، جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقے سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کردے۔(۳)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/۲۲۱

(۲) سیرۃ النبی ج۶ ص۲۲۳۔

(۳) سیرۃ النبی ج۶ ص۲۳۵۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی، غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شان جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق اور نرم دلی، نرم خوئی ہے جس طرح حسن فطرت، زینت و آرائش سے دوبالا ہوجاتا ہے، اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہوجاتا ہے: ان ربی لطیف لما یشاء، انه هو العلیم الحکیم [یوسف:۱۰۰] (بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے، جس بات کا چاہے، بے شک وہی علم والا، حکمت والا ہے)

راغب اصفہانی لطیف کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں: وہ اپنے بندوں کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے، (لفظ لطف: المفردات فی غریب القرآن)

امام بیہقیؒ کتاب الأسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں: خدا کا نام لطیف اس لئے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے، اور ان کے لئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے..... لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا، اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے، جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا..... ابن الأعرابی کا قول ہے: لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہونچا دیتا ہے (ص:۴۷)

امام غزالی کہتے ہیں: اس صفت کا مستحق وہی ہے، جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے سختی سے نہیں، اس تک پہونچاتا ہے، جس کے حق میں وہ مفید ہیں، جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں، اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لئے ہے۔ (روح المعانی تفسیر سورۂ شوری)۔(۱)

اواہ

اواہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے جو بہت دعائیں مانگتا ہو،

(۱) سیرۃ النبی ج۶ ص۲۳۶

دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے، اور تیسرا دردمند کہتا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں، وہ ہر شخص کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے، اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے، اس لئے جلد پسیج جاتے تھے، اور یہ اس لئے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے لئے ملانا چاہتا تھا، چنانچہ اسی لئے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون جیسے سنگ دل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالی کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں: فقولا له قولا لینا لعله یتذکر أو یخشی [طه:۴۴] (سو تم اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت پائے یا خدا سے ڈرے)۔(۱)

تواضع وخاکساری (خفض جناح)

کبریائی اللہ کی صفت خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں: وله الکبریاء فی السموات والأرض وهو العزیز الحکیم [جاثیہ:۳۷] (اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا)۔ اس لئے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کریں، اور عاجزی وفروتنی برتیں، تواضع وخاکساری کے بہت سے مظہر ہیں، قرآن مجید نے ان میں نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے، اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو پہلے کفار سے درگذر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پرمحبت تواضع کا حکم دیا ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ [حجر:۸۸] (اور اپنا بازو مومنوں کے لئے جھکا دو) دوسری جگہ فرمایا: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ [شعراء:۲۱۵] (اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے، جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے)۔

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پُرمحبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا

(۱) سیرۃ النبی ج۶/۲۳۶

چاہئے:وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ [بنی اسرائیل:۲۴] (اور ماں باپ کے لئے عاجزی کا بازو مہر ومحبت سے جھکا دے) خفض جناح یعنی بازو کا جھکا دینا تواضع وخاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے، اس سے یہ استعارہ کیا گیا ہے کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے، اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

تواضع وخاکساری اور دناءت وپستی میں بڑا فرق ہے، تواضع وخاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر وغرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دناءت وپستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لئے انسان اپنی خودداری کو کھودے، چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر وغرور کا حکم دیا ہے، صحابہؓ جب عمرہ کے لئے آئے تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا، اس لئے کفار نے طنز کیا کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب ضعف کی وجہ سے خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو۔ (مسلم کتاب الحج، باب استحباب الرمل فی الطّواف وصحیح بخاری عمرۃ النبی ﷺ) (۱)۔

استقامت

استقامت کے لفظی معنی ''سیدھا رہنے'' یا ''سیدھا چلنے'' کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے، اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرے کو برداشت کیا جائے، مگر حق سے منھ نہ پھیرا جائے اور اس راستے پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

(۱) سیرۃ النبی ج ۲۴۰/۶۔

آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے کہ انما الھکم الہ واحد، فاستقیموا الیہ واستغفروہ [حم سجدہ:۶] (تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اس کی طرف سیدھے رہو، اور اس سے گناہ بخشواؤ)۔

ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے، جس کا نام ''مداومت'' ہے یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے، اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجیے اور کبھی نہ کیجئے، اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب اچھے کاموں میں سے سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے، جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا: إلا المصلین، الذین ھم علیٰ صلاتھم دائمون [معارج:۲۲۔۲۳] (لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں)، (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)، اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے، اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے بار بار اسی کی تلقین فرمائی ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ (ﷺ) کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا، فرمایا: وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے (صحیح بخاری) خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے، جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔ (صحیح بخاری)۔(۱)

استغناء

استغناء کے معنی ''بے نیازی'' کے ہیں۔ اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے: وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (آل عمران: ۹۷) (اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے)۔ اور اس بے نیازی میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے: وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ

(۱) سیرۃ النبی: ج ۲۶۱/۶۔۲۶۵۔

الُفُقَرَاء [سورۂ محمد :۳۸] (اوراللہ بے نیاز ہےاورتم ہی محتاج ہو)۔

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو، اسلام کے آئینِ اخلاق میں اس استغنااور بے نیازی کی تعلیم دواصولوں پر قائم ہے۔اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے،اس لئے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے:ونعم الوکیل[آل عمران:۱۷۳] (اور کیسا اچھا کارساز ہے)۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے،قناعت ہے یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے اس سے طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے:ولا تتمنوا ما فضل اللّٰہ بہ بعضکم علی بعض [نساء:۳۲] (اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی،اس کی ہوس مت کرو)۔

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال ودولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز وناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں،اس لئے وہ باوجود دولتمند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں،لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا تاہم خدا نے جو کچھ اس کو دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا۔اس لئے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے،اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے،اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:لیس الغنی عن کثرۃ العروض، ولکن الغنی غنی النفس (بخاری)۔(دولت مندی مال اسباب کی کثرت کا نام نہیں،اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے)(۱)۔

استخلاف

استخلاف کے معنی عربی زبان میں خلیفہ بنانے اور حکمراں بنانے کے ہیں،یعنی اس ایک لفظ کے لغوی معنی کے اندر مادی وروحانی، دنیاوی ودینی دونوں قسم کی سرداری

(۱) سیرۃ النبی ج۶ص ۲۶۸۔

وسیادت کے معنی داخل ہیں، علاوہ لغت کے ہم یہاں بطور نمونہ کے چند مستند مفسروں کی رائے نقل کرتے ہیں،سب سے قدیم مستند مفسر امام ابن جریر طبریؒ استخلاف کی تفسیر فرماتے ہیں:لیورثھم اللّٰہ أرض المشرکین من العرب والعجم فیجعلھم ملوکھا وساستھا. (ج۱۸۔ص۱۰۹)(اللہ تعالیٰ عرب وعجم کے غیر مسلم سے ملک لے کر مسلمانوں کو اس کا وارث بنائے گا کہ وہ اس کے بادشاہ اوراس کے منتظم کار ہوں گے۔

علامہ بغویؒ کی مشہور تفسیر معالم میں ہے:

لیورثھم أرض الکفار من العرب والعجم فیجعلھم ملوکھا وساستھا وسکانھا. (خدا مسلمانوں کو کفار کی زمین کا وارث کرے گا،تو ان کو اس کا بادشاہ،منتظم اور باشندہ بنائے گا)۔

قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں:

لیجعلنھم خلفاء متصرفین فی الأرض تصرف الملوك فی ممالکھم.

(خدا مسلمانوں کو خلیفہ بنائے گا، جو زمین کا اسی طرح انتظام کریں گے،جس طرح بادشاہ اپنی سلطنت کا کرتے ہیں)۔

علامہ ابن کثیرؒ جن کی تفسیر تمام تفسیروں میں مستندترین تفسیر ہے،اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ھذا وعد من اللّٰہ تعالیٰ لرسولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بأنہ سیجعل أمتہ خلفاء الأرض،أی أئمۃ الناس والولاۃ علیھم ولھم تصلح البلاد وتخضع لھم العباد. (خدا کا پیغمبر سے وعدہ ہے کہ اس کے پیروؤں کو وہ زمین کا حکمراں،لوگوں کا امام وپیشوا اور اپنے امور کا منتظم ومدبر بنائے گا،اور انہی سے ملکوں کی حالت درست ہوگی، اور لوگ ان کی اطاعت کریں گے)۔

ان تفسیروں کے علاوہ دیگر کتب تفسیر میں استخلاف کے یہی معنی لکھے ہیں،اس تفسیر سے جس پر تمام مسلمان علماء اور ائمہ کا اتفاق ہے، یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ خلیفہ دینی

ودنیاوی، مادی وروحانی دونوں قوتوں کا بیک وقت رئیس وسردار ہے، کوئی روحانی خلیفہ وامام اس وقت نہیں ہوسکتا، جب تک وہ مادی ودنیاوی طاقت کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا ہو۔(۱)

ذبح عظیم

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے جس اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا خدا کی طرف سے خواب میں حکم ہوا تھا، یہود کہتے ہیں: وہ حضرت اسحاقؑ تھے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک حضرت اسماعیلؑ تھے۔ اور اسی لئے ذبیح اللہ مسلمانوں میں حضرت اسماعیلؑ کا لقب مشہور ہے، اس کے لغوی معنی ہیں: خدا کا ذبح کیا ہوا، یا خدا کی راہ میں ذبح کیا ہوا۔ اس لقب کا ماٴخذ قرآن پاک کی سورۂ صافات کی یہ آیت ہے: یا بنی! إنی أریٰ في المنام أني أذبحك فانظر ماذا تریٰ. [صافات:۱۰۲] (حضرت ابراہیم نے کہا: میرے پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کررہا ہوں، تیری رائے کیا ہے؟ حضرت اسماعیل نے جواب میں کہا: یا أبت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللّٰہ من الصابرین [صافات:۱۰۲]، (اے میرے باپ! جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کرگذر، خدا نے چاہا تو مجھے تو ثابت قدم رہنے والوں میں پائے گا) مقدس باپ نے اپنے بیٹے کے اس صبر وثبات کو دیکھا تو ان کو لے کر قربان گاہ کو روانہ ہوگئے، جو ان کی جائے قیام سے کئی دن کی مسافت پر تھی، وہاں پہونچ کر بیٹے کو لے کر اور آگے بڑھے، اور بیٹے کو پیشانی کے بل گرا کر چھری ان کی گردن پر رکھ دی، آواز آئی: اے ابراہیم! قد صدقت الرؤیا انا کذلك نجزی المحسنین [صافات:۱۰۵] (تو نے خواب سچ کر دکھایا، ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزائے خیر دیتے ہیں) ابھی یہ منظر آنکھوں سے دور نہیں ہونے پایا تھا کہ ندا آئی: وفدیناہ بذبح عظیم [صافات:۱۰۷] (اور ہم نے اس کو (اسماعیل کو) ایک بڑی قربانی دے کر چھڑایا)۔

اس آیت میں ذکر ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ میں نے ایک دوسری بڑی قربانی کا

(۱) مقالات سلیمان: ج/۳،ص/۳۹۲۔۳۹۴

فدیہ دے کر اسماعیل کو ان کی اس قربانی سے نجات بخشی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ بڑی قربانی کیا تھی؟ جس کو حضرت اسماعیلؑ کی اس قربانی کا فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا۔ مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں کہ جنت کا ایک مینڈھا لاکر حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کردیا گیا کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی جگہ قربان کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا۔ اور اس مینڈھے کو حضرت اسماعیلؑ کی جگہ قربان کیا۔ مگر یہ سب روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ نہیں۔ ان سب کا ماخذ تورات ہے: ''تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا، جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں، تب ابراہام نے جاکر اس مینڈھے کو لیا، اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختنی قربانی کے لئے چڑھایا (پیدائش:۱۳۔۲۲)۔

قرآن میں اس مینڈھے کا ذکر نہیں، ایک بڑی قربانی کا ذکر ہے۔ اگر یہ بڑی قربانی مینڈھے یا بکرے کی صورت میں ہوتی تو قرآن اس کو بڑی قربانی کیوں کہتا؟ ہمارے مفسرین نے اس کے یہ جوابات دیئے ہیں:

۱۔ چونکہ یہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا، اس لئے اس کو بڑی قربانی کا لقب ملا۔

۲۔ یہ وہی مینڈھا ہے جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا اور خدا نے قبول فرمایا تھا تو چونکہ خدا اس کو قبول کرچکا تھا اس لئے اس کو بڑی قربانی فرمایا۔

۳۔ ان روایات میں سب سے بہتر جواب حسن بصری کا ہے۔ فرمایا: اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قربانی کے لئے پیش ہوا، بلکہ وہ مطلق قربانی ہے جو اس کے بدلہ میں پوری ملت کے لئے قیامت تک حضرت ابراہیمؑ کی یادگار سنت قرار پائی۔(۱)

ایمان بالغیب

قرآن مجید میں اتقائے صادق کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ایمان

(۱) مقالات سلیمان: ج/۳،ص/۳۰۶۔۳۰۸

بالغیب ہو: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ . [بقرہ:۲-۳]
(قرآن پاک ان پرہیزگاروں کی ہدایت کرتا ہے، جوغیب پرایمان رکھتے ہیں، اورنماز پڑھتے ہیں)۔

سب سے پہلے ہم کویؤمنون بالغیب (وہ غیب پرایمان رکھتے ہیں) کی تفسیر کے لئے غیب کے معنی پرغور کرنا چاہیے، مفسرین اس کی توضیح میں نہایت مختلف الاقوال ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔غیب سے مراد خدا ہے، کیوں کہ وہ نظروں سے غائب ہے۔

۲۔غیب سے مراد قضاوقدر ہے۔

۳۔غیب سے مقصد قرآن مجید ہے،اورقرآن مجید میں جوغیب کی باتیں بتائی گئی ہیں۔

۴۔غیب دل کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ متقی وہ ہیں، جودل سے ایمان لائے ہیں۔

۵۔اسلام کے وہ احکام جوبظاہر خلاف عقل معلوم ہوتے ہیں، وہ غیب ہیں، کیوں کہ ان کی حقیقت انسان کی عقل سے غائب اورمخفی ہے۔

۶۔اسلام کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ غیب سے مرادمہدی ہیں، جوابھی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

۷۔امام ابومسلم اصفہانی کہتے ہیں: غیب مصدر بمعنی فاعل ہے،اورترکیب میں حال ہے، یعنی متقی وہ لوگ ہیں، جورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اورمسلمانوں کے سامنے بھی ایمان کا اعتراف کرتے ہیں، اور پیچھے بھی، یعنی وہ منافق نہیں ہیں جن کی نسبت آگے چل کرخدا خودفرماتا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے تو وہ ایمان کا اقرار واعتراف کرتے ہیں، اور ان کے پیچھے اپنے لوگوں میں بیٹھ کرانکارکرتے ہیں۔

۸۔جمہورمفسرین کہتے ہیں، غیب سے مطلب بن دیکھے ہوئے یعنی متقی وہ لوگ ہیں جوخدایارسول پربن دیکھے ایمان لاتے ہیں۔

۹۔اکثرصحابہؓ سے مروی ہے کہ غیب سے مراد جنت، دوزخ، حشر، نشر، حیات

بعدالموت، عذاب قبر، میزان، صراط وغیرہ ہے۔

لیکن ان اقوال پرایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ غیب سے قضاوقدر، قرآن مجید، دل، مہدی مراد لینا تاویل کی حدود سے نکل جانا ہے، اصفہانی کی تفسیر میں بھی تکلف ہے، بقیہ اقوال کم وبیش تفاوت کے ساتھ متحدالمقصد ہیں، اورایک ہی خیال ہے، جومختلف تعبیروں سے ادا کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہرمذہب میں دوقسم کی باتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱)اول وہ جن کا تجربہ یامشاہدہ جواس سے ممکن ہے، اور برابر ہوتا رہتا ہے، یا یہ کہو کہ جن کا تعلق طبیعیات یامادیات سے ہے۔

(۲) دوم وہ امور جن کا تجربہ یامشاہدہ ہمارے موجودہ حواس کے دسترس سے باہر ہے، یا یہ کہو کہ جن کا تعلق مابعدالطبیعیات یاروحانیات سے ہے۔

قرآن مجید کی اصطلاح میں مذہب کی اسی دوسری قسم کوغیب کہتے ہیں۔(۱)

البلاغ المبین

قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہونچا دینا (البلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے، یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہ انسانوں تک پہونچا دینا اس کا کام ہے، اس کے معنی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے اور نہ اس کا اس کوحق، ان کے نزدیک رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اورنامہ برکی ہے، جوایک جگہ سے دوسری جگہ خط توپہونچا دیتا ہے، مگراس خط کے مفہوم ومعنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بندلفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں، لیکن وہ یہ خیال نہیں کرتے جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے

(۱)مقالات سلیمان: ج۳،ص:۱۷۵-۱۷۶

نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشر (خوشخبری سنانے والا)، نذیر (ڈرانے والا)، سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ)، صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتبیٰ (مقبول)، مصطفیٰ (برگزیدہ)، مبین (بیان اور شرح کرنے والا)، معلم (سکھانے والا)، مزکی (پاک وصاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا)، حاکم (فیصلہ کرنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف والقاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہونچانے والا قاصد ہے؟۔

اس لئے "انما علیٰ رسولنا البلاغ المبین" کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبین اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہونچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوالینا نہیں، اور نہ پیغام پہونچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر وانکار اور عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے، قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں، ان کا منشاء یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی ۱۳ر مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے۔(۱)

حکمت، موعظہ، مجادلہ

تبلیغ ودعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے، عقل وحکمت، موعظہ حسنہ، اور مناظرہ بطریق احسن، مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ ودعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں، یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات جن میں مؤثر اور دل پذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے، اور تیسرے جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے، قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت، دوسرے کو موعظت حسنہ، اور تیسرے کو

(۱) (سیرۃ النبی ج ۴/۱۰۸۔۱۰۹)

جدال سے تعبیر کیا ہے، اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں، جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے، خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی بات پیش کر کے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقہ برتتے ہیں، یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشیں دلیلیں پیش کرتے ہیں، یا اس کو مخلصانہ نصیحت پیش کرتے ہیں اور مؤثر انداز سے اس کو نیک وبد اور نشیب وفراز سے آگاہ کرتے ہیں، یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں۔ پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا نام موعظہ حسنہ، اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے۔ تبلیغ ودعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔: "ادْعُ إِلِى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ "[نحل:۱۲۵] (اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کر)۔(۱)

قول لین

حکیمانہ استدلال ہو، یا وعظ ونصیحت ہو، یا جدال ومناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے، اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو، لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لینے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں، جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے بات کرنے کی تاکید کی، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ یہ ارشاد بھی ہوتا ہے: اذهبا الىٰ فرعون انه طغىٰ فقولا له قولا لينا، لعله يتذكر أو يخشى:[نازعات:۴۳۔۴۴]

(۱) سیرۃ النبی ج۔۴۔ص ۱۸۷۔۱۸۸

(تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے)۔(۱)

شهد

قرآن پاک نے رمضان کے روزے کا حکم الفاظ میں دیا ہے: فمن شهد منكم الشهر فليصمه[بقره: ۱۸۵](تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے)۔

لفظ ''شهد'' کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں، جو اس ماہ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر رہنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ماہ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو، یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے کہ شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہ صیام کا وہاں گزر نہ ہو، یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی جہاں روز وشب کا وہ نظام موجود ہو، جو باقی متمدن دنیا میں ہے۔ مثلاً جن مقامات پر کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں، ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں، جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح میں ہے، ثابت ہے۔ لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے، تاکہ روزے کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے، چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا، اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ (فمن شهد منكم الشهر فليصمه). (۲)

(۱) سیرت النبی ج۔۴، ص۱۸۸۔
(۲) سیرۃ النبی ج۵/۱۵۷۔

ایاما معدودات:

ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر مقبول احمد صاحب نے (جو عراق میں رہ رہے تھے، اور عربی کی شد بد سے واقف ہو گئے تھے) یہ اعتراض کیا کہ اسلام میں صرف چند دن کے روزے فرض ہیں، تیس روزے فرض نہیں ہیں، وجہ یہ ذکر کی کہ روزوں کے لئے ''ایام'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور أیام جمع قلت ہے، جس کے ضمن میں تین سے لے کر دس تک کی عدد آتی ہے، اس لئے روزے بھی تین سے لے کر دس تک فرض ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ أیام جمع قلت ہے، لیکن قاعدہ صرف اسی قدر نہیں ہے کہ اگر اسی قدر ہو تو حسب ذیل آیتوں میں وہ کون بے وقوف ہوگا جو ایام سے صرف تین سے نو تک یا دس تک سمجھے گا: تلك الأيام نداولها بين الناس [آل عمران: ۱۴۰](یہ دن ہیں، جن کو ہم لوگوں کے درمیان دست بدست الٹتے ہیں)

کیا اشخاص اور قوموں کی صدیاں اور سالہا سال جن میں ہزاروں دن (ایام) داخل ہیں، صرف نو یا دس دنوں میں محدود ہیں؟

قیامت میں نیکوکاروں سے کہا جائے گا: كلوا واشربوا هنيئا بما أسلفتم في الأيام الخالية[حاقہ: ۲۴](خوش خوش کھاؤ پیو، اس کے بدلہ میں جو تم گذشتہ دنوں (ایام) میں کرتے تھے۔

کیا یہ ''أیام خالیہ'' ہر جنتی کے دس ہی دن ہوں گے، خواہ اس کی عمر سو برس کی کیوں نہ ہوئی ہو، یہ کیسی نادانی کا دعوی ہے ؟

قرآن پاک میں ایک اور جگہ ہے: وذكرهم بأيام الله [ابراہیم: ۵](اور ان کو اللہ کے دنوں (ایام) کی یاد دلاؤ)۔

اللہ کے دن سے مقصود وہ دن ہے جب اللہ تعالی کی کسی عجیب قدرت کا اظہار ہوا ہو، تو کیا تاریخ میں اس قسم کے صرف تین سے دس تک دن گذرے ہیں، یا ان کی تعداد

سیکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی لفظ کی دو جمعیں آتی ہوں، ایک قلت کی اور ایک کثرت کی، تو عموماً کمی دکھانے کے لئے جمع قلت اور کثرت دکھانے کے لئے جمع کثرت لائیں گے، لیکن یہ قاعدہ ان الفاظ کے لئے نہیں، جن کی ایک ہی جمع آتی ہو، ان الفاظ کے لئے یہ قلت وکثرت کی سرے سے کوئی تخصیص وتحدید ہی نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ عربی میں دس سے زیادہ دنوں کے لئے ہم کوئی لفظ ہی نہ بول سکیں، مثال یہ ہے کہ سیف (تلوار) کی جمع سیوف بھی آتی ہے، جو جمع کثرت ہے، اور اسیاف بھی آتی ہے جو جمع قلت ہے۔ تو اکثر جہاں کمی دکھانی ہوگی وہاں اسیاف، اور جہاں کثرت دکھانی ہوگی وہاں سیوف بولیں گے، مگر بایں ہمہ یہ قاعدہ بھی کلیہ نہیں، لفظ قرء (حیض یا طہر) اس کی جمع قلت أقراء آتی ہے، اور جمع کثرت قروء، اب قاعدہ کے مطابق تین کے ساتھ أقراء آنا چاہئے، نہ کہ قروء، مگر قرآن پاک میں تین کے ساتھ قروء آیا ہے، کیونکہ رسمی قواعد پر عبارت کی شستگی اور توازن الفاظ کو فوقیت اور ترجیح حاصل ہے۔

الغرض قاعدہ کا اگر تعلق بھی ہے تو صرف ان الفاظ سے جن کی دونوں قسموں کی جمعیں آتی ہیں، ورنہ وہ الفاظ جن کی ایک ہی قسم کی جمع آتی ہے، صرف جمع قلت یا صرف جمع کثرت، ان میں یہ فرق کبھی ملحوظ نہیں ہوتا، مثلاً دیکھو کہ رِجل (پاؤں) کی جمع صرف ایک آتی ہے، اور وہ ارجل ہے جو جمع قلت ہے، مگر اس کا اطلاق دس اور دس سے ہزار ہا زیادہ پاؤں پر بھی ہوتا ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ وضو میں پاؤں دھونے کا حکم صرف دس پاؤں تک محدود ہو۔

اس کے برخلاف لفظ رَجُل (مرد) کہ اس کی جمع صرف رجال آتی ہے، جو جمع کثرت ہے، تو اب چاہئے کہ ثلاثۃ رجال اور عشرۃ رجال نہ بول سکیں کہ اس کا اطلاق دس سے زیادہ پر ہوگا، تین سے دس پر نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ سرے سے یہ قاعدہ ہی نہیں، ورنہ چاہئے کہ ایسے الفاظ جن کی صرف جمع قلت آتی ہے، ان کے لئے دس سے زیادہ بول ہی نہ

سکیں، اور جن کی صرف جمع کثرت آتی ہے ان کی دس یا دس سے کم کی جمع بھی نہ بول سکیں، بھلا ایسی حماقت کا قاعدہ کسی زبان میں بھی ہوسکتا ہے؟! نحو کی سب سے مستند اور مشہور کتاب رضی شرح کافیہ میں اس کی وضاحت موجود ہے:

''اور جاننا چاہئے کہ جب کسی اسم کی صرف جمع قلت آئے جیسے رجل کی جمع أرجل (پاؤں) یا صرف جمع کثرت آئے جیسے رجل (مرد) کی جمع رجال، تو وہ قلت وکثرت میں یکساں بولے جاتے ہیں، اور کبھی جمع قلت وکثرت ہونے کے باوجود بھی ایک دوسرے کے موقع پر مستعار بولے جاتے ہیں، جیسے قرآن میں ثلاثۃ قروء ہے، حالانکہ اس کی جمع قلت أقراء ہے''۔ (رضی ج۲ص۱۵۵، مطبع نول کشور ۱۸۶۴ء)(۱)

فمن شهد منكم الشهر فليصمه:

روزے کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے، اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے فرمایا گیا کہ أياما معدودات [:بقرۃ:۱۸۴] (چند گنے ہوئے دن)، ظاہر ہے کہ سال کے تین سو ساٹھ دنوں میں انتیس اور تیس دن کے روزے چند گنتی کے دن تو ہیں ہی۔

بعض مفسرین نے اللہ تعالی کے قول "فليصمه" کا ترجمہ کیا: (تو اس مہینے میں روزہ رکھے)، اس سے شبہ پیدا ہوا کہ مہینہ کے چند دن روزہ رکھ لیا جائے تو بہتر ہے، جبکہ اس کا اصل ترجمہ ہے: (وہ اس مہینہ (رمضان) بھر روزہ رکھے)۔

عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو مطلق جار زمانی اور مطلق ظرف زمانی مفعول میں امتیاز پیدا کرتا ہے، مثال کے طور پر ان دو لفظوں پر غور کرو:

ظرف زمانی جار يقوم فی الليل (رات میں کھڑا ہوتا ہے)

ظرف زمانی مفعول يقوم الليل (رات بھر کھڑا رہتا ہے)

(۱) مقالات سلیمان ج۳/۲۵۴-۲۵۹۔

اب اسی پر فعل صوم کو قیاس کرو:

ظرف زمانی جار فلیصم فی الشھر (مہینہ میں روزہ رکھے)

ظرف زمانی مفعول فلیصم الشھر (مہینہ بھر روزہ رکھے)

اب غور کرو کہ قرآن میں روزہ کا حکم فی الشھر (مہینہ میں) کرکے نہیں ہے، بلکہ الشھر (مہینہ بھر) کرکے ہے، کیا اب بھی کسی کو شک ہوسکتا ہے کہ قرآن میں مہینہ بھر کے روزے کا ذکر نہیں، قرآن نے انتیس اور تیس دنوں کے بجائے مہینہ کا لفظ اس لئے اختیار کیا ہے کہ قمری مہینہ میں دنوں کی تخصیص رویت ہلال کے بغیر نہیں ہوسکتی، اس لئے مہینہ کا لفظ استعمال کیا، تاکہ بہترین اختصار کے ساتھ انتیس دنوں کا مہینہ ہو، یا تیس دنوں کا مہینہ ہو، ہر ایک پر مہینہ کا لفظ صادق آسکتا ہے۔

مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینہ بھر کا روزہ رکھا تو کہیں گے: صام شھراً، اس کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا روزہ سمجھا جائے گا، اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے: صام سنة (سال بھر روزہ رکھا)، اس سے ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے، اور چونکہ لفظ ''شہر'' یعنی مہینہ کہا گیا ہے، اس لئے مہینے کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینے کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جس کا عرب میں رواج تھا اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہیں۔ جیسی روایت ہو، وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئے گا، جیسا کہ سرور کائنات علیہ الصلاۃ تمام صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدینؓ اور جمیع فرق اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے، اور احادیث صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔ (سیرۃ النبی: ج،۵/۱۵۷۔ ومقالات سلیمان ج ۳/۲۶۲۔۲۶۶)

عضین

اہل لغت نے عضین کو جو جمع ہے اور منصوب ہے، دو لفظوں سے اشتقاق کیا ہے، ایک نے اخیر حرف واو مان کر عضو سے جس کے معنی اجزائے جسم کے ہیں، اس صورت میں

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جنہوں نے قرآن کے ٹکڑے کرڈالے۔

دوسرے اہل لغت نے اس کا اشتقاق عضہ سے کیا ہے، یعنی آخری حرف ہ جیسے سنہ کی اصل سنۃ، اور اس کے معنی جھوٹے، خارج از عقل بات، جادو، خیال آرائی وغیرہ ہیں، اب معنی یہ ہوں گے کہ جنہوں نے قرآن کو جھوٹی جادو، خیال آرائی اور یقین میں نہ آنے والی بات بنالیا ہے، عضین یہاں جعلوا کا بہرحال مفعول ثانی ہے، اور جس طرح اَرضۃ سے اَرضین اور سنۃ سے سنین بحالت نصب وجر جمع ہے، یہ بھی ہے۔ حضرت مولانا تھانوی نے جو ترجمہ اختیار کیا ہے، میں اس کو پسند کرتا ہوں، (واضح رہے کہ حضرت تھانویؒ نے آیت کما أنزلنا علی المقتسمین الذین جعلوا القرآن عضین [حجر:۹۰۔۹۱] کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: جیسا کہ ہم نے ان لوگوں پر (عذاب) نازل کیا ہے، جنہوں نے حصے کر رکھے تھے یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دئے تھے، جو مرضی کی موافق ہوا مان لیا اور جو خلاف مرضی ہوا اس سے انکار کردیا، اس سے مراد یہود ونصاری ہیں) (تم پر بھی نازل کریں گے۔(۱)

تختانون

شروع اسلام میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی الگ رہتے تھے، بعض طبائع کو اس میں زحمت محسوس ہوتی تھی، اس لئے قرآن مجید نے اس میں آسانی کردی، اور یہ قید صرف دن کے لئے باقی رہ گئی، سورۂ بقرہ میں اسی مضمون کے بیان کے موقع پر فرمایا: عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ تَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَكُمْ.[بقرہ: ۱۸۷] (خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے)۔

سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خیانت کے سلسلہ میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس خیانت کا تعلق جماعت سے تھا، دوسری بات یہ ہے کہ اس طرز ادا سے استمرار کا مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ ایک جماعت میں یہ خیانت نفس

(۱) مکتوبات سلیمانی: ج،۲/۱۲۶۔

جاری تھی؟ خود ہی ارشاد فرمایا کہ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ لفظ ''تختا تون'' اختیان سے ہے، اور اختیان کے معنی خیانت کرنے کے نہیں، بلکہ خیانت کی خواہش پیدا ہونے کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ یہ حکم بعض طبائع کے لئے پراز مشقت تھا، اس لئے ان کے دلوں میں وساوس نفسانی پیدا ہوتے تھے، گو وہ اس پر عمل نہ کرتے تھے۔

اپنی اس تحقیق کے ظاہر فرمانے کے بعد سید صاحبؒ نے فرمایا کہ کتابوں میں اس کو تلاش کرو، بالآخر امام راغب کی مفردات میں بعینہ یہی بات مل گئی اور سید صاحب بہت خوش ہوئے۔(۱)

غُلف

مولانا اویس نگرامیؒ لکھتے ہیں: سید صاحب نے بائبل کا مطالعہ بہت غور و خوض سے کیا تھا، دار المصنفین میں بائبل کا جو نسخہ ان کے زیر مطالعہ تھا، اس کے شروع سادہ اوراق حوالوں سے بھرے ہوئے تھے، قرآن مجید کی ان آیات کی تحقیق میں جن کا تعلق اہل کتاب ہے، اس مطالعہ سے بے حد فائدہ اٹھاتے تھے، مثلاً قرآن مجید میں یہود کا ایک قول نقل ہے: وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ [بقرہ:۸۸] . ہمارے مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم (ﷺ) سے یہود نے کہا کہ ہمارے دل تنگ ہیں، اس لئے آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے، سید صاحب فرماتے تھے کہ مفسرین کا یہ قول بہ اعتبار مقصد اور مطلب کے صحیح ہے، مگر درحقیقت یہ لفظ یہود کا ایک معاون ہے، ایسے ہی مواقع پر وہ لفظ ''نامختون'' بولتے تھے جس کے حوالے اعمال ۷-۱۰۰۔۱۱۰/۱۰اور رومیوں باب ۲ میں موجود ہے، غلف اسی مفہوم کا عربی ترجمہ ہے۔(۲)

---

(۱) امام راغب اصفہانی کی مفردات میں اختان کے مندرجہ ذیل معنی ذکر کئے گئے ہیں:
والاختيان مراودة الخيانة، ولم يقل تخونون أنفسكم، لأنه لم تكن منهم الخيانة ، بل كان منهم الاختيان، فإن الاختيان تحرك شهوة الانسان لتحرى الخيانة ، وذلك هو المشار اليه بقوله تعالىٰ: إن النفس لأمارة بالسوء تعمیر حیات، مئی ۱۹۶۴ء، مضمون: سید صاحب اور علوم قرآن از مولانا محمد اویس نگرامی ندوی۔
(۲) تعمیر حیات مئی ۱۹۶۴ء

ذنب، اثم

عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں: مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے، جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے، لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے، خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے، غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر، بھول چوک سے ہو یا قصداً، اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں، لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی قابل مؤاخذہ ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ " حسنات الأبرار سيئات المقربين "(نیکیوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں)۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے، جرم، اثم یا حنث کا نہیں۔ ذنب کا لفظ، بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل ہے اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا، مگر جن علمائے لغت نے ان الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں: انہوں نے اس کی تصریح کی ہے، ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس اور ادیب الاب ہنری کوس لا کی کتاب فرائد اللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں:

الاثم الذنب الذى يستحق العقوبة عليه ، ولايصح أن يوصف به إلا المجرم ، وبين الاثم والذنب فرق من حيث ان الذنب مطلق الجرم ، عمدا كان أو سهواً ، بخلاف الاثم ، فانه ما يستحق فاعله العقاب ، فيختص بما يكون عمداً ، و الحنث أبلغ من الذنب لأن الذنب يطلق على الصغيرة ، والحنث على الكبيرة ، والجرم لا يطلق الا على الذنب الغليظ.
(ص:۹۶-۹۷، مطبوعہ کاثولیکیہ، ۱۸۸۹ء)

کسی نبی کو اگر استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریحاً عصیان و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگزاشت ہے، جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ

اپنے رحم وکرم اور لطف وعنایت سے فرماتا رہتا ہے، اور اسی لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔ اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے اُن کا دامن پاک وصاف رکھا جاتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادۂ غفلت گوامت کے حق میں قابل مؤاخذہ نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبے کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں، کیونکہ ان کا قول وفعل شریعت بن جاتا ہے، اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول وفعل کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہوجاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار کردیا جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کرکے ان کو بشارت سنادی جاتی ہے، اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک وصاف رکھا جاتا ہے: فتلقی آدم من ربه کلمات فتاب علیه [بقرہ:۳۷] (تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں، تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا)۔ لقد تاب اللّٰه علی النبی [توبہ:۱۱۷] (یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا)۔ (سیرۃ النبی ج ۴/۶۵۔۶۶) لیغفر لك اللّٰه ما تقدم من ذنبك وما تأخر [فتح:۲] (تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے)۔ کامل اور عام عفو ومغفرت کا یہ مرتبۂ بلند خود بندے کی زندگی میں انبیاء کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ (۱)

کفر

کفر کے لغوی معنی ''چھپانے'' کے ہیں اور محاورے میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان ودل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں ''کفرانِ نعمت'' کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی ''کفر'' وہ لفظ ہے، جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں، اللہ

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۶۵۔۶۶

پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار، اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے۔ جس کے مرتکب کا نام کافر ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح ''کفر''، اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل ''شکر'' سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کا بالمقابل بولے گئے ہیں: انا هديناه السبيل اما شاكرا واما كفورا [دہر:۳] (ہم نے انسان کو راستہ بتادیا، اب وہ یا شکر گذار (شاکر) ہوا یا ناشکرا (کافر) (۱)۔

فحشاء، منکر اور بغی

''رذائل'' (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہوجاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہوجاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی وبربادی کا سبب بن جاتے ہیں، یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہوجاتا ہے۔

اس قسم کے ''رذائل'' کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر ان کو ''منکر'' (ناشناسا) اور ''فحشاء'' (بے حیائی) اور کبھی ''فاحشۃ'' (فحش) ''سیئۃ'' (برا) ''سوء'' (برائی) ''مکروہ'' (ناپسندیدہ) ''خطأ'' (ناصواب یا بھول) ''اثم'' (گناہ) ''عدوان'' (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے، ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ ''رذائل'' سے متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں۔

پہلا لفظ ''فحشاء'' جس کی دوسری صورت ''فاحشۃ'' کی ہے، ''فحش'' سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حسد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں (صحاح از جوہری، ولسان) اور اس

(۱) سیرۃ النبی: ج ۵/۲۴۷

کے دوسرے لازمی معنی ''قبح'' یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کردی ہے، اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی ''فحشاء'' کہلاتی ہے۔قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرمادیں، اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدیِ حدود اور ''فحشاء'' اور ''فاحشہ'' کا مرتکب ہوتا ہے، اسی لئے زنا کا نام ہی ''فاحشہ'' رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہوگئے ہیں اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش اور فحش کاری پر ہوتا ہے۔

دوسرا لفظ ''منکر'' ہے، اس کے لغوی معنی ''ناشناسا'' کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لئے اس کو ''معروف'' (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر حلقے میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ ''منکر'' (ناشناسا) ہے، حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: ''قوم منکرون'' یعنی لوگ انجانے اور ان پہچانے ہیں، حضرت یوسفؑ کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انہوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ اُن کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے: فعرفهم وهم له منكرون [یوسف:۵۸] (یعنی یوسفؑ نے تو ان کو پہچان لیا مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے)۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے۔ یہ کیفیت بھی منکر ہے۔

تیسرا لفظ ''بغی'' ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہے۔

رذائل تین یعنی ''فحشاء''، ''منکر'' اور ''بغی'' میں منحصر ہیں، صفاتِ ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرتاً ناپسند

کرتے ہیں اور ان کے جائز کردینے سے دوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

منطقی اصطلاح میں ''فحشاء''، ''منکر'' اور ''بغی'' میں مانعۃ الخلو ہے، یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع ہوسکتا ہے، مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی، یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

''فحشاء'' میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے۔ جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ، ''منکر'' سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگدلی، اولاد کی نالائقی، اور ''بغی'' جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھالیتی ہے۔ جیسے چوری، ڈاکہ، قتل وغیرہ: قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ [اعراف۔۳۳] (اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوئے ہوں، یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے)۔(۱)

زُور اور اِفک

''زُور'' اگرچہ ایک عام لفظ ہے، جس میں کذب و بہتان وغیرہ شامل ہیں، لیکن اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا: ہاں، یا رسول اللہ ﷺ، فرمایا کہ شرک اور ماں باپ کی نافرمانی، راوی کا بیان ہے کہ آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات اور برابر یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہوجاتے، (ابواب البر والصلۃ) اسی طرح قرآن کی آیت "فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور" [حج:۳۰] (بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کہنے سے بچتے رہو،) میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی، وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہوگا

(۱) سیرۃ النبی ج۶ ص۲۷۰۔۲۷۴

کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

''اِفک'' اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہیں: کسی پر جھوٹ باندھنا۔ مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے افک کہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ اِفک سے تعبیر کیا ہے۔ [نور:۱۲] اور قرآن مجید سے معلوم ہتا ہے کہ یہ افک بڑے خبث طینت کا کام ہے، فرمایا: تنزل علیٰ کل أفاك أثیم [شعراء:۲۲۲] (اور شیطان تو اُترا کرتے ہیں، ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر)، جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جو کچھ سنے، اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے، ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ سماعون للکذب [مائدہ: ۴۲] (یعنی جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے، یہ یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا۔ (۱)

خیانت

ایک جائز حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو، اس کے ادا کرنے میں ایمان داری نہ برتنا، خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانتداری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے، خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے

(۱) ایضا: ج۶ ص۲۷۹۔۲۸۰

رہنا۔ جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسے کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے: یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ لاَ تَخُونُواْ اللّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُواْ أَمَانَاتِکُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُون [أنفال:۲۷] (اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بددیانتی کرو)۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہوسکتی ہے، یہاں تک کہ چشم وابرو کے اشاروں سے بھی ہوسکتی ہے۔ فرمایا: یعلم خائنه الأعین وماتخفی الصدور [مؤمن:۱۹] (اللہ تعالیٰ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو، اور جو چھپا ہے سینوں میں)۔ (۱)

نقض عہد

نقض عہد کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ جس کو ہم غداری اور دغابازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے، عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں۔ اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے، کفار جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، ان کے ذکر میں خدا فرماتا ہے: الَّذِیْنَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لاَ یَتَّقُونَ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُونَ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِیَانَةً فَانبِذْ إِلَیْهِمْ عَلَى سَوَاء إِنَّ اللّهَ لاَ یُحِبُّ الْخَائِنِیْن [انفال:۵۶۔۵۸] (جن سے تو نے معاہد کیا پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ (خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پاوے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں، اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے، اللہ کو دغاباز خوش نہیں آتے۔ (۲)

(۱) سیرۃ النبی ج۶ ص۲۸۶۔۲۸۸

(۲) سیرۃ النبی ج۶ ص۲۸۸

استراق سمع

اہل عرب چغلخوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں، یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں، اور ایندھن کے لئے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں، اور آتش فتنہ وفساد کے لئے ایندھن بہم پہونچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ''حمالۃ الحطب'' یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔

بعض لوگ ''استراق سمع'' کرتے ہیں یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔اس قسم کے لوگوں کو لغت میں ''قتات'' کہتے ہیں، اور ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: لا یدخل الجنۃ قتات (ابوداود، کتاب الادب) (جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا)۔اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں، تاکہ ان کا اثر بڑھ جائے، اسی لئے عربی زبان میں چغل خوری کو ''وشایہ'' کہتے ہیں، جس کے معنی نقش ونگار کے ہیں اور ادھر کی اُدھر لگانے کے لئے چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے، اسی مناسبت سے چغل خوری کو ''سعایہ'' بھی کہتے ہیں، جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ تحریر وکتابت اور رمز واشارت سے بھی چغل خوری کی جاسکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں، بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں، یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ ''فلاں شخص یہ کہتا تھا'' بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ''فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔''

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ''محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا'' چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے، بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو

دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہوجائے۔(۱)

خمر (شراب)

''خمر'' کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لئے ہر وہ چیز جس کا کھانا پینا، عقل اور ہوش کو چھالے وہ خمر میں داخل ہے۔حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر کھڑے ہوکر فرمایا: شراب وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے (صحیح بخاری)

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا، کس طرح وہ مقبول عام ہوچکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنائے اور اشارے سے گزر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کردی گئی، لوگ سمجھ نہیں سکے۔ابوداؤد کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا: اے خدا! شراب کے بارے میں ہم کو صاف صاف بتادے۔ان کے اصلی لفظ یہ ہیں: اللّٰھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیاً. (اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کردے)۔اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اتری: یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۔[بقرہ:۲۹۹] (لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں۔لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے)۔

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے، یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا، ایک صاحب نے امامت کی، مگر نشہ کے خمار میں قل یاایھا الکافرون کی سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری: لاتقربوا الصلاۃ وأنتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا ماتقولون [نساء:۴۳] (نشہ کی

(۱) سیرۃ النبی ج۶ ص۲۹۳

حالت میں نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو)۔

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا، اس لئے نماز کے علاوہ اوراوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعدؓ بن وقاص کی دعوت کی۔اس میں شراب کا دور بھی چلا، یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں، اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر یہ حکم آیا (صحیح مسلم فضائل سعدؓ و بن قاص): يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ [مائدہ:۹۰] (اے ایمان والو: بے شک شراب، جوا، بت، اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو، تا کہ فلاح پاؤ)۔

اس کے بعد شراب قطعا حرام ہوگئی، حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے حضرت ابوعبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے، ابوطلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا، ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ کی زبانی روایت ہے: كنت أسقىٰ أباعبيدة وأبا طلحة وأبى بن كعب فجاء هم آت فقال: ان الخمر حرمت (میں ابوعبیدہ اور ابوطلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہوگئی۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے، جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگر چہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے، تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کر دی، کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی اور دفعۃً جام وسبو توڑ ڈالے، یہ صرف ابوطلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا، بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ

گئیں، بخاری: أبواب المظالم، باب صب الخمر في الطريق میں ہے: "فجرت فى سكك المدينة". (مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی)۔

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔(۱)

خلیفہ

لفظ خلیفہ خلف سے مشتق ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لئے ایک کی غیر موجودگی میں خواہ وہ اس کی موت کی سبب سے ہو یا غیبو بت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے، قرآن پاک میں ہے: فخلف من بعدهم خلف [اعراف:۱۶۹ ومریم:۵۹] (تو ان کے بعد اس کے جانشیں آئے)، یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے۔دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا: "واخلفنى فى قومى" [اعراف :۱۴۲] (میری قوم میں میرے جانشیں یا نائب بنو)، یہ زندگی میں ہی جانشینی کی ایک شکل ہے۔تیسری آیت ہے "ولو نشاء لجعلنا منكم ملائكة فى الارض يخلفون" [زخرف۔۶۰] (اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے)۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشیں ہوتے چلے جاتے۔

---

(۱) سیرۃ النبی ج/۴، ص:۱۴۹۔۱۵۳

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن الغير، إما لغيبة المنوب عنه و إما لموته، و إما لعجزه، و إما لتشريف المستخلف (خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں، اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی موت کے سبب ہو، یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہوجانے کے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لئے ہو)[ص:۱۵۵]۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں، اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لئے موزوں ہوسکتے ہیں۔(۱)

کبر وغرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو ''تکبر'' کہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا، أنا خير منه [اعراف:۱۲] (میں اس سے بہتر ہوں)، وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا: قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ [اعراف:۱۳] (یہاں سے اتر جاؤ، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا، تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی)۔

کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے، جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسروں کی تحقیر بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں

(۱) سیرۃ النبی ج/۷، ص/۸۱۔۸۲

ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں، اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا: نہیں، تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے (ابوداود)، تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا ہے۔

قرآن مجید میں بعض جگہ اس کو ''عزۃ'' (ہیکڑی) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے (بل الذين كفروا في عزة وشقاق [ص:۲] (جو لوگ منکر ہیں، ناحق کی ہیکڑی اور مخالفت میں پڑے ہیں)۔ بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار (سرکش) اختیار کیا ہے۔ (كذالك يطبع الله علىٰ كل قلب متكبر جبار. [مومن ۳۵] جتنے مغرور اور سرکش ہیں، اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے، دو موقعوں پر اس کے لئے مختال [نساء:۳۶، نحل:۲۳] کا لفظ آیا ہے۔ یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو۔(۱)

خود بینی، خودنمائی (أعجبتكم كثرتكم)

خود بینی، خودنمائی اور خودرائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے، لیکن ''خود بینی'' کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط ناز کرسکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہوجاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں، گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں اور اس کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، اسی کا نام ''عُجب'' اور ''خود بینی'' ہے، اسی سے نفس میں خودنمائی اور خودرائی پیدا ہوتی ہے۔ اور اکثر حالتوں میں ہو تو کبر وغرور کا سبب بن جاتی ہے۔

(۱) سیرۃ النبی ج۶ ص۳۳۲۔۳۳۳

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کرسکتا ہے، خدا کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرت الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لئے، اور شکست فتح سے بدل گئی، خدا نے فرمایا: وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا [توبہ:۲۵] (اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کردی تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا)۔ لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور عطیہ سمجھے، اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا: لاتفرحوا بما آتاكم [حدید:۲۳] (خدا نے جو دیا ہے، اس پر اتراؤ نہیں)۔(۱)

ریا (الذین هم یراؤون)

''ریا'' کے لغوی معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت اُن کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لئے اعمال کی راستی وناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض ونیت پر ہے، صحیح حدیث میں ہے کہ "إنما الأعمال بالنيات" (عمل نیت سے ہے)، اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض وغایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کردیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی وکمزور ہوجاتی ہے۔ نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور برائی کا اظہار کرکے لوگوں میں اپنی نسبت حسنِ ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کرکے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے، اور ان کی برائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اس کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد

(۱) سیرۃ النبی ج ۶ ص ۳۴۱۔۳۴۲۔

ہو، فرمایا: ولاتكونوا كالذين خرجوا من ديارهم بطراً ورياء الناس [انفال:۴۷] (اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو، جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے)، ریا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے، بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریاء کا نام شرک خفی اور شرک اصغر رکھا ہے۔(۱)

حسد (أم يحسدون الناس)

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم وفضل، مال ودولت، عزت وشہرت، یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو ''رشک ومنافست'' کہتے ہیں، اور یہ کوئی بداخلاقی نہیں، بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ چیزوں کو دوسرے کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اس کا نام ''حسد'' ہے۔

قرآن سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان کیا تھا کہ ان کو قرآن وایمان کی دولت عطا فرمائی تھی، جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے: أم يحسدون الناس على ماآتاهم الله من فضله [نساء:۵۴] (یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے، اس پر جلے مرتے ہیں)۔

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

۱۔ یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کرلی جائے، گو وہ اس کو نہ حاصل ہوسکے، یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے، اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر

(۱) سیرۃ النبی ایضا: ج ۶ ص ۳۳۸۔۳۳۹

ہوجائیں، "ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء" [نساء:۸۹](ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہوگئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو، اور (وہ) تم (سب) ایک ہی طرح کے ہوجاؤ)۔

۲۔ دوسری یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہوجائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو مل نہیں سکتی، اس لئے بالفرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کرلی جائے۔

۳۔ تیسری یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کرلی جائے، ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لئے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے۔

قرآن مجید میں ہے: "ولا تتمنوا ما فضل اللہ به بعضکم علیٰ بعض" [نساء:۳۲] (اور خدا نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ ارمان نہ کرو،) اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو، بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لئے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں، اسی لئے فرمایا: واسألوا اللہ من فضله [نساء:۳۲] (اور خدا سے اس کا فضل مانگو)، تیسری صورت میں بالکل مذموم نہیں، بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے، اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں۔

حسد کے سات اسباب ہیں:

۱۔ بغض وعداوت۔

۲۔ ذاتی فخر کا غلط خیال۔

۳۔ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع ومنقاد بنانا چاہتا ہے۔

۴۔ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں، اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہوجاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے، اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں۔

۵۔ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہوجاتا ہے۔

۶۔ جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے۔

۷۔ خبث باطن اور بدطینتی ہے۔

انہیں وجوہات کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی، اور فرمایا: إیاکم والحسد، فان الحسد یأکل الحسنات، کما تأکل النار الحطب، (تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ (کتاب الأدب، ابوداؤد)۔(۱)

جہاد

جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلہ کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں اور اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں۔ یعنی حق کی بلندی اور اس کی اطاعت وحفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی ومالی ودماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنے عزیز واقارب کی، اہل عیال کی، خاندان وقوم کی، جان تک کو قربان کردینا، اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو

(۱) سیرۃ النبی ج ۶/ ۳۴۵۔۳۴۹

روکنا، اوراس کے لئے جنگ کے میدان میں ان سے اگرلڑنا پڑے، تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیاررہنا یہی جہاد ہے۔اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اورضروری اوراتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہےاور نہ ہوسکتی ہے،صرف ''دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ'' کے تنگ میدان میں محصور کردیا ہے، قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ ''قعود'' (بیٹھنایا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے،جس سے مقصود سستی ،تغافل اورترک فرض ہے: لا يستوى القاعدون من المؤمنين غير أولى الضرر والمجاهدون فى سبيل اللّٰه بأموالهم وأنفسهم، فضل اللّٰه المجاهدين بأموالهم وأنفسهم على القاعدين درجة، وكلا وعد اللّٰه الحسنى، وفضل اللّٰه المجاهدين على القاعدين أجرا عظيما [نساء:۹۵] (مسلمانوں میں وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو، اور پھر بیٹھے رہیں،اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کررہے ہوں، برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان ومال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہرایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے،اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے) اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اورآرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں،اس لئے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے،یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے، بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے۔اسی لئے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اسی سورۂ نساء کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں ، جہاد بالنفس اور جہاد

بالمال،یعنی اپنی جان کے ذریعے جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعے جہاد کرنا۔

جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ اور جدوجہد کے ہیں،تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہوسکتا ہے۔علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے،اور اسی کا نام ان کے ہاں ''جہاد اکبر'' ہے۔خطیب نے تاریخ میں حضرت جابر صحابیؓ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی سے واپس آئے تھے، فرمایا: تمہارا آنا مبارک،تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے، (کنز العمال) ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے (دیلمی)۔اسی موقع کی یہ آیت بھی ہے:والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا، وإن اللّٰه مع المحسنين [عنکبوت:۶۹] (اور جنہوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی)، ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے، اور بے شبہ خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے)۔ سورۂ حج میں ہے: وجاهدوا في اللّٰه حق جهاده [حج:۷۸] (اور محنت کرو اللہ کی راہ میں پوری محنت) یہ اللہ کی راہ میں محنت اور جہاد کرنا جہاد اکبر ہے۔جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے۔

یعنی حق کی راہ میں عیش وآرام، اہل وعیال اور جان ومال ہر چیز کو قربان کردینا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''پہلوان وہ ہے جو غصے میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے'' (صحیح مسلم: کتاب الایمان) یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کرسکے جس کا اکھاڑا خود اس کے سینے میں ہے۔

جہاد کی ایک اور قسم ''جہاد بالعلم'' ہے، دنیا کا تمام شروفساد، جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے:ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتيى هى أحسن [نحل:۱۲۵] (تو لوگوں کو اپنے پروردگا رکے راستہ کی طرف آنے کا بلاو احکمت ودانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا

کردے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر)

دین کی دعوت وتبلیغ بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقۂ دعوت کا نام جہاد بالقرآن ہے، اس قرآنی جہاد کو اللہ تعالیٰ نے ''جہاد کبیر'' فرمایا ہے: ولا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا [سورۂ فرقان:۵۲] (تو کافروں کا کہا نہ مان، اور بذریعہ قرآن کے توان سے جہاد کر، بڑا جہاد)

حق کی حمایت اور نصرت کا کام بھی اکثر روپئے پر موقوف ہیں، اس لئے جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں: ان الذین آمنوا وھاجروا اجاھدوا بأموالھم اوأنفسھم فی سبیل اللّٰہ [انفال:۷۲] (بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا)

ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان ومال وماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے۔(۱)

ظلم

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو (سیرۃ النبی ج ۱/۷۷)۔

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ کفر وشرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں، قرآن میں اس کے لئے دو اور لفظ بغی (سرکش) اور عدوان (تعدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے: قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَالإِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَق [اعراف:۳۳] (کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے)، دوسری جگہ فرمایا: وَیَنْھَی عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنکَرِ وَالْبَغْیِ [نحل:۹۰] (اور

(۱) سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۱۳ تا ۲۱۴

خدا بے حیائی اور ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے)۔

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے، جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو پوری قوم اور ملک کے امن وامان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہونچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہونچانے کی اجازت اس لئے دی گئی، تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا: وَالَّذِیْنَ إِذَا أَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنتَصِرُونَ وَجَزَاء سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا [شوریٰ:۳۸-۳۹] (اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں، اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے، یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے)۔(۱)

خلق جدید

جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا، وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لئے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ بَلْ ھُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْد [ق:۱۵] (بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں)

منکرین کی زبان سے کہلوایا: أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقاً جَدِیْدا [اسراء:۴۹]

(کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے)

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے: إِنَّکُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ [سبا:۷]

(بیشک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو)۔

پھر تمثیل دے کر فرمایا: کَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہ [انبیاء:۱۰۴]

(جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا، اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے)

اسی لئے اس عالم کی اس نئی خلقت وپیدائش والے جسم کو بعینہ اسی جسم کے مطابق

(۱) سیرۃ النبی: ج ۶/۳۲۹

سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ ''جسم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لئے ہماری زبان میں روح کے غلاف وقالب کے لئے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر، کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہ گذشتہ گوشت وپوست کا ہونا اس لئے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب وثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ: إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَاراً كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا لِيَذُوقُواْ الْعَذَابَ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَزِيْزاً حَكِيْماً [نساء:۵۶] (بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو اور کھالیں دیں گے جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بیشک اللہ غالب اور حکمت والا ہے)۔

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی، تو پہلا حصۂ جسم جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا، اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوا وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور مقدمہ کا مدعا علیہ ہے، ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے، اور وہ روح انسانی ہے۔(۱)

برزخ

برزخ کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمان میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھارا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ آپس میں ملنے نہیں دیتا: بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ [رحمان:۲۰] (ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا)، اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے: وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴/ ۳۶۴

فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخاً وَحِجْراً مَّحْجُوراً [فرقان:۵۳] (اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا: یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے)۔

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے، اس کا نام برزخ ہے، سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُون [مومنون:۱۰۰] (اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے، اس دن تک جب کہ وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے)۔

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام قبر ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو، یا قعر دریا میں، یا کسی درندہ یا پرند کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا: وان اللّٰہ یبعث من فی القبور [حج :۷] (بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں، اٹھائے گا) اب ظاہر ہے کہ یہ بعث صرف انہی مردوں کے لئے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہوں، بلکہ ہر میت کے لیے ہے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لئے قبر سے مقصود ہر وہ مقام جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔(۱)

علم الیقین وعین الیقین:

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں: علم الیقین، اور عین الیقین، کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کر لو تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے، قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صوتوں کو سورۂ تکاثر میں بیان کیا ہے:

أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ثُمَّ

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴/ ۳۳۰

لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ [تکاثر:۱۔۸] (تم کو دولت ونعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا، ابھی نہیں، تم آگے جان لوگے، پھر ابھی نہیں، تم آگے جان لوگے، ہرگز نہیں، اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے، پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لوگے)۔

بنا بریں اگر انسان اپنے اندر علم الیقین حاصل کرے جو کمال ایمان کا اعلی درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے۔

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے وحی الٰہی نے اس کے جواب میں کہا: يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ [عنکبوت:۵۴] (وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو) ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں، اس کے جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے: وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ائْذَن لِّي وَلَا تَفْتِنِّي أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ [توبہ:۴۹] (اور ان میں کوئی ایسا ہے، جو کہتا ہے کہ مجھے جہاد میں عدم شرکت کی اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالئے، ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے)۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا، بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں، اس لئے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئیگی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اٹھ جائے گا، اس وقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے، اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب وعذاب اور جنت ودوزخ کے مناظر ان کے سامنے آجائیں گے، اور اس وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کرلیں گے: ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ [تکاثر :۷] (پھر تم دوزخ کو عین

یقین سے دیکھ لوگے)۔

یہ موت کے بعد سماں کا ہوگا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں، اس کے بعد جب قیامت آئے گا تو ہر راز فاش ہو جائے گا: يوم تبلى السرائر [طارق:۹] (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت ودوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک وشبہ کا شائبہ باقی نہ رہے گا، وہ علم حقیقی او یقین تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے: وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ذَلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ.... .....فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ [ق:۲۰۔۲۲] اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن.....تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے)۔

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آجائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آجائے گی، فرمایا:

فَإِذَا جَاءتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَى، يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَى وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَى [نازعات:۳۴۔۳۶] (جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آجائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی)۔

شاعر (ابوالعتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب وكل الناس داخله

ياليت شعري بعد الباب ما الدار

(موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ سے داخل ہوں گے، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے)۔(۱)

أمتنا اثنتين :

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے: ربنا أمتنا اثنتين واحييتنا اثنتين فاعترفنا بذنوبنا فهل الى خروج

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/ ۳۳۷۔۳۳۸

مـــن سبيـــل (مومن:۱۱)(ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے؟)

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالی نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتاً فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُون [بقرہ:۲۸](کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم پہلے مردہ تھے، پھر تم کو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مارے گا، پھر تم کو جلائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے، جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا، یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی، جس کے بعد پھر موت نہیں، قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ [زمر:۳۰۔۳۱](بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں، پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے)۔

ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُون [مومنون:۱۵۔۱۶](پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے)۔(۱)

سکرۃ الموت:

قرآن میں ہے: وَجَاءتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ [ق:۱۹](اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آ گئی، یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا).

(۱) سیرۃ النبی:۴/۳۳۰۔۳۳۱

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت حقیقت کا کوئی منظر سامنے ضرور آ جاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

بالحق من أمر الآخرة فتبينه للانسان حتى تثبته وعرفه. حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔(تفسیر ابن جریر طبری ج۲۶ ص۹۱)

حافظ ابن کثیرؒ محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: يقول عزوجل: وجاءت أيها الانسان سكرة الموت بالحق أى كشفته لك عن اليقين الذى كنت تمتري فيه. (اللہ تعالی نے فرماتا ہے کہ اے انسان! موت کی بیہوشی حق کو لے کر آ گئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا)۔(تفسیر ابن کثیر برفتح البیان ج۹ ص۲۹۸)

قاضی شوکانی محدثؒ کی تفسیر میں ہے:

ومعنى بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ما جاءت به الرسل من الأخبار بالبعث والوعد والوعيد. (اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس قیامت اور جزاء وسزا کی خبریں لے کر آئے تھے ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے)۔(ج۵ ص۷۳)

مفتی آلوسی حنفیؒ کی تفسیر کی یہ عبارت ہے:

والمعنى أحضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذي نطقت به كتب اللّٰه تعالى ورسله عليهم السلام (اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقت امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ تعالی کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔(ج۲۶/۱۶۵)

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف۲ ص۱۴۰۲ کلکتہ) اور ابوحیان اندلسی مالکی کی تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے: فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيد [ق:۲۲](ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج

تیری نظر تیز ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے، لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔(۱)

اقرأ كتابك:

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے، پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی، اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے، موجودہ سائنس (جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی، یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے، اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوام وجود سے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لئے گویا بھرا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے: هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ [یونس۔۳۰] (اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا، اس کو آزمالے گی)، كُلُّ امْرِءٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ [طور:۲۱] (ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے گرو ہے)۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ [مدثر:۳۸] (ہر جان اپنے علم کے بدلے گرو ہے)، فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ [زلزال:۷۔۸] (تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھے گے، اور جو چیونٹی بر ابر بدی کرے گا، وہ اس کو بھی دیکھے گا)، يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَراً وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ [آل عمران:۳۰] (جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کئے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کئے وہ بھی)۔

یہ بات کہ ہر انسان کا ہر عمل و فعل صحیفہ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے، اس

(۱) سیرۃ النبی: ج۴/۳۲۸۔۳۲۹

کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے، ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے خدائی شاہد اس کو سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ [ق:۱۷۔۱۸] (جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگراں اس کے پاس حاضر رہتا ہے)۔

کبھی اس کو اعمال کی کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم بَلَى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ [زخرف۔۸۰] (کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادے ان کے پاس اعمال کو لکھتے ہیں)، إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ [یونس۔۲۱] (بیشک ہمارے فرستادہ تمھاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں)۔

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِن قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوداً إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ [یونس:۶۱] (اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا، اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو)۔

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامہ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فرد عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو، فرمایا: وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَاباً يَلْقَاهُ مَنشُوراً، اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيباً [بنی اسرائیل:۱۳۔۱۴] (اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ (عمل) اس کی گردن میں چپکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم دفتر کر کے نکالیں گے، جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے، آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو

تو کافی ہے)۔

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامہ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب وکتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلمبند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے، اسی طرح یہ اعمال انسانی فراموش نہ ہوں گے، بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے ۔فرمایا: وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَـٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِراً وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَداً)[کہف:۴۹](اور نامہ اعمال رکھا جائے گا، تو گنہگاروں کو تو دیکھے گا اس میں جو کچھ لکھا، اس سے ڈر رہے ہوں گے، اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اس کو شمار کرلیا اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے، اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا)۔

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامۂ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے، تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے، مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، اسی لئے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیوں کر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہرحال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا، اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا، اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔(۱)

نفخ الصور: (صور قیامت)

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے: فاذا نفخ فی الصور [حاقہ:۱۳، ق:۲۰] (پھر جب صور پھونکا جائے گا)، صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں، اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال وجلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا،

(۱) سیرۃ النبی: ج۴/۳۷۵-۳۷۶

اس لئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ تورات میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی: لمن الملك اليوم (آج کس کی بادشاہی ہے)، پھر اللہ تعالی جواب دے گا: للّٰہ الواحد القهار [مؤمن:۱۶](اس ایک سب پر غالب آنے والے کی)، غرض وہ دن آسمان وزمین اور نظم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرہ حساب کے اعلان کا ہوگا، اس لئے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لئے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالی واقعۃ اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔(۱)

میزان

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ، یا دونوں برابر، دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کر علم جب ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لئے وزن اور حساب سے عموماً عدل وانصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے، اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا: جزاءاً و فاقا،[نبأ:۲۶](پورا پورا بدلہ۔)

اس برابری اور کمال عدل وانصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا: فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَآئِبِينَ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُوْلَـئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم [اعراف:۷-۸](پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے، اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں، جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں، سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے)۔

فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُه فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَة وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُه

(۱) سیرۃ النبی ج۴/۳۵۶-۳۵۷

فَأُمُّهُ هَاوِيَة [قارعہ:۶۔۹] (تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے)۔

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود، اعمال خیر کی کمی وبیشی ہے، پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق وعدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الٰہی میں موجود ہوگا، اور وہ کسی طرح بیش وکم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے، ایک جگہ ہے: اللّٰهُ الَّذِیْ أَنزَلَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ [شوریٰ۔۱۷] (وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا، اور میزان کو)۔

یعنی کتاب الٰہی، حقانیت کے ساتھ اتری ہے، اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ ج ۱۲/۲۵)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے، اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے فرمایا ہے: وَوَضَعَ الْمِیْزَان [رحمٰن:۷] (اور خدا نے ترازو رکھی ہے)۔(۱)

حساب

کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے، اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے، جو وزن سے ہے، چنانچہ سورہ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے، اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا: وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئاً وَإِن کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَیْنَا بِهَا وَکَفَی بِنَا حَاسِبِیْنَ [انبیاء:۴۷] (اور ہم قیامت کے دن کے لئے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۳۷۷۔۳۷۸۔

، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم لے آئیں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے)۔

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں: ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے، اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا، اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہرحال وزن وحساب کے مادی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے، تو وہ بھی حق پر ہے۔(۱)

دارالسلام:

انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسباب راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے، اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن وسلامتی کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا، لیکن یہاں (جنت میں) آکر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ، بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی، وہ پرند جو عمر بھر چار عناصر کے قفص میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحی محمدیؐ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں، وہاں اس کا ایک نام دارالسلام بھی بتایا ہے، جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہل جنت کی نسبت ارشاد ہے: لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِندَ رَبِّهِم [انعام:۱۲۸]
(ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے)

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے، وہ حقیقت میں اس امن وسلامتی کی نوید وبشارت ہے، اسی لئے فرمایا: وَاللّٰهُ یَدْعُو إِلَی دَارِ السَّلَامِ [یونس:۲۵] (اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلامؓ ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا، وہ یہ تھی

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴/۳۷۸

لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا (مسند احمد)۔

جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در ودیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے:

وَالمَلاَئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ سَلاَمٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ [رعد:۲۳-۲۴] (اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا، تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے)۔

وہاں امن وسلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا:

إِلَّا قِيلاً سَلاَماً سَلاَماً [واقعہ:۲۶] (لیکن سلامتی سلامتی کی پکار)۔

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے:

ادْخُلُوهَا بِسَلاَمٍ ذَلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ [ق:۳۴]

(اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو، یہ زندگی جاوید کا دن ہے)

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْواً إِلَّا سَلَاما [مریم:۶۲]

(اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بیہودہ بات نہ سنیں گے)۔

جنت کا ایک اور نام قرآن میں ''مقام امین'' (امن والا مقام) بتایا گیا ہے، فرمایا: إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ [دخان:۵۱] (بے شک پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے)۔(۱)

رحمۃ اللہ

خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آجاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند

(۱) سیرۃ النبی: ج۴/۴۳۰-۴۳۱

تعالیٰ کے قہر وغضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر وغضب کا نام ونشان نہ ہوگا، وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض وکرم کی بارش ہوگی، اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا: يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيم [توبہ:۲۱] (ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لئے ہمیشہ کا آرام ہے)۔

اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے، یہ آواز سنائی دے گی۔

وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُون [آل عمران:۱۰۷]

(لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اس میں وہ سدا رہیں گے)۔(۱)

نورھم یسعی

جنت نور کا وہ مقام ہے، جہاں ظلمت وتاریکی کا نام ونشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے، کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا، اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان کے انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا: نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم [تحریم:۸] (ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا)۔

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ [حدید:۱۲] (جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان

(۱) سیرۃ النبی ج۴/۴۳۱۔

کے سامنے اوران کے داہنے چمکے گا،آج تم کوخوشخبری ہو،وہ باغ ہیں،جن کے نیچےنہریں بہتی ہیں،ان میں ہمیشہ رہا کروگے،یہی بڑی کامیابی ہے)۔

اس دن اہل نفاق،اہل ایمان سے آرزوکریں گے کہ ذراٹھہرجائیے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لئے روشنی ہوجائے:

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ [حدید:۱۳](جس دن منافق مرداورمنافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گے کہ ذراٹھہروکہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں)۔(۱)

رضوان

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقام رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اورخوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پرعتاب فرمائے گا،نہ اس سے ناراض ہوگا،بلکہ اس کو اپنی رضامندی اورخوشنودی کی لازوال دولت عطافرمائے گا،متقیوں کے لئے اللہ تعالی نے جونعمتیں رکھی ہیں،ان میں جنت،نہریں، پاک بیویاں اوران سب کے بعدروح کی مسرت رکھی ہے،لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کوظاہرفرماتا ہے،چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکرکوجگہ دی گئی ہے:يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ[توبہ:۲۱](ان کا پروردگاران کواپنی رحمت اورخوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے،اوران باغوں کی جن میں نعمت الٰہی قائم رہے گی)۔

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطورتکملہ کے جنت کا ذکرآتا ہے،فرمایا:

وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ، سَابِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ

(۱) سیرۃ النبی ج۴/۴۳۲

وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ)[حدید:۲۰۔۲۱](اورآخرت میں سخت عذاب ہے،اورخدا کی بخشش اوررضامندی بھی ہے،اوردنیا کی زندگی تودھوکے کا سامان ہے،اپنے رب کی بخشش اوراس جنت کی طرف دوڑو،جس کا پھیلاؤ آسمان اورزمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے،یہ ان کے لئے بنائی گئی ہے جواللہ اوراس کے رسولوں پریقین رکھتے ہیں۔یہ اللہ کی مہربانی ہے،جس کوچاہتا ہے دیتا ہےاوراللہ بڑی مہربانی والا ہے)۔

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کوگنا کران کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پرکیا گیا ہے،فرمایا:

لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ[آل عمران:۱۵](جنھوں نے پرہیزگاری کی،ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں،جن کے نیچےنہریں بہتی ہیں،ان میں وہ سدارہیں گےاوران کی پاک بیویاں،اوراللہ کی خوشنودی)۔

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کررضوان الٰہی کوقرار دیا ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ [توبہ:۷۲] (اللہ نے باایمان مردوں اورعورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچےنہریں بہتی ہیں،ان میں سدارہیں گے،اوررہنے کے ستھرے گھراور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے،وہی بڑی کامیابی ہے)

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً [فجر:۲۷۔۲۸](اے اطمینان والی روح! تواپنے رب کے پاس اسی طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہواوروہ تجھ سے راضی ہو)۔

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے:

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ [مائدہ:۱۱۹] (خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش)۔

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے کہ ''خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں، سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں، فرمائے گا: (جنت کی نعمتیں پاکر) اب تم خوش ہوئے، عرض کریں گے، پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام گذشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار ان سے بہتر کیا ہے، فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی وخوشی تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا (صحیح بخاری)(۱)

طبتم فادخلوها خالدین

موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے۔لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا: طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ [زمر:۷۳] (تم پاک ہو چکے ہو تو جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ)۔

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی کہ فرمایا: مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ [نحل:۹۷] (مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کئے، ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے، اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے)۔

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے: وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً [صف:۱۲] (اور پاک گھر)

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۳۲۔۴۳۳

جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ، [آل عمران:۱۵] (اور پاک بیویاں)۔

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی:

وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ [حج:۲۴] (اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی)

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی: شَرَاباً طَهُورا [دہر:۲۱] (پینے کی پاک چیز)۔

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک، صاف، طیب وطاہر اور تمام روحانی وجسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی۔(۱)

سبحانک اللّٰهم

اس آرام ولطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم، جہاں ہر طرف انوار الٰہی برسیں گے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم، جہاں ہر طرف انوار الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا، جہاں قدس ونزاکت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گے، وہاں حمد وثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے:

دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ [یونس:۱۰] (جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی، اور ان کی آپس کی دعا سلامتی ہوگی، اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو)۔

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح وتہلیل کی نئی نئی

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۴۳۳۔۴۳۴

پرلطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِىْ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤاً وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيْد [حج:۲۳۔۲۴] (بیشک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی، اور وہ راہ دکھائے جائیں گے اچھی بات کی، اور وہ دکھائے جائیں گے، اس سراپا حمد (ذات) کی راہ) وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمد الٰہی کا سرور سرمدی گائیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا، فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِيْنَ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاء فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِيْن وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِىَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ [زمر:۷۳۔۷۵] (جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے: تم پر سلامتی ہو، تم پاک ہو چکے، تو جنت میں چلے جاؤ، اہل جنت کہیں گے: اس اللہ کی حمد ہو، جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں، تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور دیکھے گا کہ فرشتے عرش الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی)۔

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْواً إِلَّا سَلَاماً، وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَعَشِيّاً [مریم:۶۲] (وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات، مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور

شام ہوگی)۔

اس صبح وشام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوان نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح وشام کی تخصیص کیا تھی، وہ ہر وقت سامنے ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح وتہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے، اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا: یسبحون اللہ بکرۃ وعشیا (کتاب الجنۃ، باب فی صفۃ الجنۃ) (وہ صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس کریں گے)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اہل جنت کو خدا کی تسبیح وتقدیس کا الہام ہوا کرے گا (مسلم) اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں: وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيْد. [حج:۲۴] (اور اچھی بات کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا)۔(۱)

جزاؤهم عند ربهم:

اہل جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ، قرب خاص کا مقام ہوگا، بندے اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جابجا ان کے لئے یہ آتا ہے: جزاء هم عند ربهم (ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس)، یہ قرب خاص کے اشارے ہیں، اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے: إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ فِىْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ [قمر:۵۴۔۵۵] (بے شک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں میں سچائی کی نشست گاہ میں اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے)۔(۲)

---

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۳۳۴۔۴۳۵

(۲) سیرۃ النبی ج ۴/۳۳۴۔۴۳۵

وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ:

جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالی کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی، یا وہ نور مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا، اور اہل جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ [قیامہ:۲۲۔۲۳] (کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے)۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبداللہؓ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے، دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے، اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا" (صحیح بخاری.)

اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں: ایک تو شدت یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک وشبہ دیکھ رہے ہو، اسی طرح بے شک وشبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدار الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم خدا کے دیدار سے ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں، بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے، ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی: تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَام [احزاب:۴۴] (ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہوگی)۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا: سَلَامٌ قَوْلًا مِن رَّبٍّ رَّحِيم [یٰس:۵۸] (رحمت والے

پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا)۔

بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔ (صحیح بخاری ج ۲ / باب کلام الرب)

یہ رویت کیوں کر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں، اہل عقل زیادت ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہل حقیقت اس کو اسماء وصفات کی ناقابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے۔ ع

بیا کیں نہ داور بہارا بہ پیش داور اندازیم سیرۃ النبی ج ۴ / ۴۳۶

ختم اللّٰہ علی قلوبھم

قرآن مجید کے پہلے سیپارہ میں ارشاد خداوندی ہے: "ختم اللّٰہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی أبصارھم غشاوۃ، ولھم عذاب عظیم [بقرہ: ۷] (اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی کی، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، ان کے لئے "عذاب عظیم ہے") اگر خدا ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے، اور اسی وجہ سے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا کچھ قصور نہیں، یہ قصور خدا ہی کا ہے، ایسی حالت میں ان کو سکھ دکھ یا گناہ ثواب نہیں ہوسکتا؟ پھر خدا ان کو سزا و جزا کیوں دیتا ہے، کیوں کہ انھوں نے گناہ یا ثواب خود مختاری سے نہیں کیا، یا اولاد سب کے یہاں ایک ہی طریقہ سے ہوتی ہے، مگر پیدا ہونے کے بعد کوئی گورا ہوتا ہے، کوئی کالا، کوئی امیر، کوئی غریب، کوئی اندھا، کوئی لولا، اس کی کیا وجہ ہے؟ (خان محمد صابر، خانقاہ ڈوگراں، شیخوپورہ، پنجاب)

جواب: ۱۔ انسان کو اللہ تعالی نے ارادہ اور نیت کی آزادی بخشی ہے، وہ اپنے اسی اختیار سے خیر یا شر کو اختیار کر کے ثواب یا عذاب کا مستحق ہوتا ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ: [کہف:۲۹] (تو جو چاہے مؤمن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے)۔

۲۔انسان جس پہلو کو اپنے اختیار سے پسند کرتا ہے، اور اس کام کو کرتا ہے تو بار بار کرنے سے وہ کام اس پر آسان ہو جاتا ہے، اور اس کا عادی ہو جاتا ہے، خواہ وہ شر ہو، خواہ خیر ہو، اگر خیر اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے تو اس کو توفیق اور ہدایت کہتے ہیں، اور اگر شر آسان ہو جاتا ہے تو اس کو ضلال (گمراہی) اور خذلان (عدم توفیق) کہتے ہیں۔

۳۔ان دو باتوں کے سمجھ لینے کے بعد آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مہر لگانے کو جو فرمایا ہے، وہ وہی عدم توفیق ہے، یہ عدم توفیق اور مہر لگانا نتیجہ ہے انسان کے اپنے فعل کا، جس کو اس نے پہلے اختیار سے کیا، اس کا نتیجہ دل و دماغ پر مہر ہے، یعنی وہ اب احکام خداوندی اور نصائح سے مستفید ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔

۴۔اب جس آیت کو آپ نے پیش کیا ہے، اور بھی بہت سی آیتیں اس معنی کی قرآن میں ہیں، مگر ان سب آیتوں میں کفار اور فساق اور ان کے فعل بد اور اختیار شر کا ذکر پہلے ہے اور مہر یا اضلال اور عدم توفیق کا ذکر اس کے نتیجہ کے طور پر ہے یعنی ان کا معلول اور نتیجہ ہے، لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ مہر خداوندی یہ علت ہے، اور بندہ کا اختیار شر معلول اور نتیجہ ہے۔

۵۔یہاں غور فرمائیں، اوپر یہ ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ [بقرہ:۶] (جن لوگوں نے کفر کیا، برابر ہے ان کے لئے چاہے ان کو تم ہشیار کرو، یا نہ ہشیار کرو، وہ ایمان نہ لائیں گے)۔

دیکھئے پہلے انہوں نے اپنے اختیار سے کفر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق ان سے روک لی، اور پھر ان کے کفر پر اصرار اور بار بار عمل کرنے سے خیر کی توفیق ان سے روک لی، اور پھر ان کے کفر پر اصرار اور بار بار عمل کرنے سے خیر کی توفیق ان سے سلب ہو گئی، اور شر کا کام آسان ہو گیا، یہی اللہ تعالیٰ کی مہر ہے، وہ کفر پر مجبور ہو گئے، بلکہ پہلے انہوں نے کفر کا کام کیا، اور جیسے وہ کام کرتے گئے، خیر کے راستے بند ہوتے چلے گئے، یہی وہ مہر ہے، اسی سورہ بقرہ میں دو رکوع کے بعد دوسری آیت ہے:

يُضِلُّ بِهِ كَثِيْراً وَيَهْدِيْ بِهِ كَثِيْراً [بقرہ:۲۶] (اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ سے بہتوں کو گمراہ بناتا ہے، اور بہتوں کو راہ دکھاتا ہے)۔

اس کے بعد ہی فوراً ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِيْنَ [بقرہ:۲۶] (اور اللہ تعالیٰ گمراہ نہیں کرتا، مگر ان کو جو اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑتے ہیں)۔

یہاں بھی دیکھئے ''إِلَّا الْفَاسِقِيْنَ'' کا فسق و فجور سبب ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عدم توفیق جس کو گمراہی کہا ہے، اس کے نتیجہ کے طور پر پیچھے ہے۔

ایک اور آیت میں ہے: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ [نساء:۱۵۵]

(یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے قلوب پر مہر لگا دی)

دوسری آیت میں ہے: كذلك يطبع اللّٰه على كل قلب متكبر جبار [مومن:۳۵] (اسی طرح اللہ ہر مغرور ظالم کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں)۔

یہاں بھی غرور اور ظلم اختیاری سبب ہے، اور مہر اس کا نتیجہ۔ ماخوذ (ماہنامہ معارف دسمبر ۱۹۴۵ء) امید ہے کہ اب بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی اور اعتراض رفع ہو کر تسکین پیدا ہو گئی ہوگی۔ مولانا شبلی مرحوم کا ایک مضمون مقالات شبلی (مذہبی) جلد اول مسئلہ قضا و قدر پر ہے، اس کو ضرور پڑھیں۔(۱)

أساطير الأولين

مشہور مؤرخ گبن نے ایک موقع پر لکھا ہے: ''محمد کی تمام تعلیمات ایک کتاب سے مأخوذ ہیں، جس کا نام اساطیر الأولین ہے، جس کا چند مقامات میں قرآن میں بھی ذکر آیا ہے، اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشر و نشر کے واقعات پر مشتمل ہے''۔

اس غریب نصرانی کو کیا معلوم کہ اس کے قلم سے جو حرف نکل رہا ہے وہ جہل و نامعلومی کا ایک دفتر ہے، قرآن میں بے شک لفظ ''اساطیر الأولین'' متعدد مقامات پر آیا

(۱) مقالات سلیمان ج ۳/۴۱۶۔۴۱۹۔ وسیرۃ النبی ج ۴/۴۴۴۔۴۴۸

ہے،لیکن تم کوکس نے بتایا کہ یہ ایک کتاب کا نام ہے؟ اگر یہ استدلال صحیح ہے کہ قرآن میں کسی لفظ کا متعدد بار استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی قدیم کتاب کا نام ہے، تو خودلفظ اسلام، رسول اللہ، اور صلاۃ کو کسی قدیم کتاب کا نام کیوں نہیں قرار دیتے کہ لفظ اساطیر سے زیادہ تو یہ الفاظ قرآن میں بار بار آئے ہیں۔

اساطیر الأ ولین کی لغوی تشریح

''اساطیر الاولین'' دولفظوں سے مرکب ہے، اساطیر اور اولین۔

اساطیر اسطور کی جمع ہے، جس کے معنی داستان اور قصہ کے ہیں، ''اولین'' اول کی جمع ہے، جس کے معنی گزشتہ پہلے اور اگلے کے ہیں، دونوں لفظوں کے مرکب معنی ہیں: اگلوں کے قصے، پہلوں کی کہانیاں، گذشتہ اقوام واشخاص کی داستانیں۔

قال الراغب:ما سطرالاولون فی الکتاب من القصص و الأحادیث، قال الجوهری : الأساطیر : الأباطیل ، الترهات ، قال السدی: أساجیع الأولین، قال ابن عباس: أحادیث الأولین ، وقال قتادة : کذب الاولین وباطلهم. (امام راغب اصفہانی اساطیر کے معنی لکھتے ہیں: پہلوں نے کتابوں میں جو قصے کہانیاں لکھیں، امام لغت جوہری کہتا ہے: اساطیر کے معنی ''بیہودہ اورخرافات باتیں'' سدی کہتا ہے کہ اس کے معنی ''اگلوں کے قوافی'' ہیں، ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اگلوں کی باتیں اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ اگلوں کے جھوٹ اور کذب اس کے معنی ہیں)۔

اورتعجب ہے کہ اسطور جو اساطیر کا واحد ہے، کوئی ایسا لفظ نہیں، جس سے ایک یورپین محقق نا آشنا ہو، کیا اس نے اسی لفظ کو انہی معانی کے ساتھ لاطینی اور جرمن میں ہسٹوری (History) اور انگریزی میں ہسٹری اور اسٹوری (Story) کی صورت میں نہیں پڑھا ہے، اور اگر پڑھا ہے اور یقیناً پڑھا ہے، تو کیا تعصب وعداوت ہے کہ قرآن کے اس لفظ کو اس معنی میں نہیں لیتے۔

أساطیر الأ ولین کی معنوی تشریح

انسان کی فطرت یہ ہے کہ واقعات ماضیہ کی تاریخ، اقوام فاتیہ کی سرگذشت اوراشخاص گزشتہ کی داستانِ زندگی سے نہایت دلچسپی لیتا ہے اور اس سے عبرت ونصیحت حاصل کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ دنیا میں جس کثرت سے تاریخ اقوام اور سرگذشت اشخاص کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، کسی دوسرے علم وفن کی کتابیں نہیں پڑھی جاتی ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں بغرض اعتبار واستبصار نہایت کثرت سے اقوام ماضیہ کے اخبار تاریخی، اشخاص گزشتہ کے واقعات زندگی اور ممالک فانیہ کے حالات بقاء وفنا بیان ہوئے ہیں، کفار وملحدین جو چشم بصیرت اور گوش اعتبار سے محروم تھے، کہتے تھے کہ قرآن میں قصص پارینہ اور افسانہائے کہنہ کے سوا اور کیا دھرا ہے؟ قیامت، معاد، اور حالات اور ماورائے مادہ کو بعید از عقل سمجھ کر ان کو ''داستان کہن'' کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ بہ ترتیب قرآن سب سے پہلی آیت جس میں ''اساطیر الاولین'' کا لفظ ہے، سورۂ انعام کی آیت ہے، جس کی شان نزول میں مذکور ہے:قال ابن عباس: حضرعند رسول اللّٰہ ﷺ أبوسفیان والولیدبن المغیره والنضر بن الحارث وعقبة وعتبة وشیبة أبناء ربیعة وأمیة وأبی ابنا خلف والحارث بن عامر واستمعوا الی حدیث الرسول فقالوا للنضر : ما یقول محمد : فقال : لاأدری ما یقول لکنی أراه یحرك شفتیه، ویتکلم بأساطیر الأولین کالذی کنت أحدثکم به عن أخبارالقرون الأولیٰ، قال أبوسفیان: انی لا أریٰ بعض ما یقول حقا ، فقال أبوجهل : کلا ، فأنزل اللّٰہ تعالیٰ تلك الآیة. (ومنهم من یستمع الیك، وجعلنا علی قلوبهم أکنة أن یفقهوه وفی آذانهم وقرا--------- ان هذا الا أساطیر الأولین[أنعام : ۲۵](ابن عباسؓ فرماتے ہیں: (شدید ترین کفار مکہ) ابوسفیان، ولید، نضر، عقبہ، عتبہ، شیبہ، امیہ، ابی اور حارث آنحضرتؐ کے پاس آئے اور آپ کا کلام سنا، لوگوں نے نضر سے

پوچھا کہ محمدؐ کیا کہتا ہے، اس نے جواب دیا کہ یہ تو میں خود نہیں جانتا کہ وہ کیا کہتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ لب ہلاتا ہے، اور اگلوں کے قصے کہتا ہے، جس طرح میں تم کو گذشتوں کے قصے بیان کرتا تھا، ابوسفیان نے کہا کہ محمدؐ جو کہتا ہے، اس میں سے بعض باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں، ابوجہل نے کہا: ہرگز نہیں۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ومنهم من يستمع اليك ، وجعلنا على قلوبهم أكنة أن يفقهوه وفي آذانهم وقرا..... ان هذا الا أساطير الأولين.

خود ان آیات پر غور کرنا چاہئے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

قرآن مجید میں یہ لفظ نو جگہ آیا ہے، لیکن ہر جگہ ان معانی کے سوا جو ہم نے بیان کئے ہیں، کوئی اور معنی نہیں بن سکتے، چہ جائیکہ کسی کتاب کے نام کی طرف اشارہ ہو، ہم ان تمام آیتوں کو نقل کرتے ہیں:

(۱) يقول الذين كفروا ان هذا الا اساطير الأولين.[أنعام : ۲۵]

(کافر کہتے ہیں، کہ یہ (قرآن) تو صرف اگلوں کی کہانی ہے)۔

(۲) واذا تتلىٰ عليهم آياتنا قالوا قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل هذا إن هذا إلا أساطير الاولين.[مؤمنون : ۸۳](جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو کہتے ہیں، ہم سن چکے، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے، یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے)۔

(۳) واذا قيل لهم ماذاأنزل ربكم قالوا أساطيرالأولين. (فرقان : ۵)

(ان منافقین سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے خدا نے کیا نازل کیا تو کہتے ہیں، وہی اگلوں کی کہانیاں)۔

(۴) قالوا أإذامتنا وكنا ترابا وعظاما ء أنا لمبعوثون، لقدوعدنا نحن وآباء نا هذا من قبل إن هذا إلا أساطير الأولين. [نمل:۶۸]

(حیرت سے کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مرکر صرف مٹی اور ہڈی رہ

جائیں گے، تو کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے، یہ تو ہم سے اور اس سے پہلے ہمارے بزرگوں سے بھی کہا گیا تھا، یہ کچھ نہیں، یہ خیالات تو صرف پرانے لوگوں کی قصہ کہانی کی باتیں ہیں)۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاؤُوا ظُلْماً وَزُوراً وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلاً [فرقان:۴-۵] (کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن اختراع ہے، خدا کی طرف سے نہیں، محمدؐ نے خود گڑھا ہے، اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کو مدد دی ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تو پہلوں کی کہانی ہے، جس کو محمدؐ نے لکھا لیا ہے، اور صبح وشام اس کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے)۔

(۶) وقال الذين كفروا ء اذاكناترابا وآباء نا أئنالمخرجون لقدوعدنا هذا نحن وآباء نا من قبل ان هذا الا أساطير الأولين [نمل:۶۸۶۷] (کافر کہتے ہیں، کہ کیا جب ہم اور ہمارے اسلاف مٹی ہوجائیں گے، ہم پھر قبر سے نکالے جائیں گے؟ یہ تو ہم سے اور ہم سے پہلوں سے یہی وعدے کیے گئے تھے کچھ نہیں یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے)۔

(۷) وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَا أَتَعِدَانِنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتْ الْقُرُونُ مِن قَبْلِي وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ [احقاف:۱۶-۱۷] (جس کافر بیٹے نے اپنے مسلمان ماں باپ کو جھڑک کر کہا: کیا تم دونوں اس کا مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ قبر سے اٹھایا جاؤں گا، مجھ سے پہلے کتنی قومیں گذر گئیں (اور ان کا نشان بھی نہیں) اس کے ماں باپ نے اس کو خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ اے بدبخت ایمان لا! خدا کا وعدہ سچا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ یہ صرف پرانے لوگوں کی کہانی ہے، یہی وہ لوگ ہیں، جن پر خدا کا عذاب واجب ہو چکا)۔

[۸] وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاء بِنَمِيمٍ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَلِكَ زَنِيمٍ أَن كَانَ ذَا مَال اذا تتلى عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ

الْأَوَّلِيْــنَ [ن:۱۰۔۱۵] (تو ان کی اطاعت نہ کر، جو ذلیل ہیں، اور قسمیں بہت کھایا کرتے ہیں، جو عیب جو اور غماز ہیں، جو اس لئے کہ صاحب فرزند و مال ہیں، نیکی سے لوگوں کو روکتے ہیں، جو حد سے متجاوز ہیں، جو گنہگار ہیں، اور جو بدنہاد و بد اصل ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو (بے پروائی سے) کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں)۔

(۹) وما یکذب بہ إلا کل معتد أثیم ، إذاتتلیٰ علیه آیاتنا قال أساطیر الأولین. [مطففین:۱۲۔۱۳] (قرآن کی تکذیب وہی کرتے ہیں، جو ظالم اور گنہگار ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو کہتے ہیں کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں)۔

قرآن مجید کی ان آیات کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اساطیر کسی کتاب دینی کا نام نہیں ہے، جس سے قرآن ماخوذ ہو، بلکہ کفار کا اس سے مقصود کہیں تو یہ ہے کہ اس میں قصے اور کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں، اور کہیں یہ مقصود ہے کہ قیامت، معاد اور حیات مابعد الموت کچھ معقول بات نہیں، صرف اگلوں کی بیہودہ کہانی ہے، جس پر پرانے لوگ اپنی بیوقوفی سے یقین رکھتے تھے۔

بدقسمتی دیکھو کہ یہ بعینہ وہی اعتقاد فاسد ہے، جو کبھی کفار کا تھا، اور آج ان مسلمان متفرنجین کا ہے، جو قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے۔ جو خدا کے ظہور وجلال کے منکر ہیں، جو اعمال کے مواخذہ سے بے پرواہ ہیں، مرنے والو! کیا موت تمہیں کبھی نہ آئے گی، ہاں! ایک بار آئے گی، جس کے بعد تم کو زندہ چھوڑ کر پھر کبھی نہ آئے گی۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللّٰهِ حَتَّى إِذَا جَاءَ تْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يَا حَسْرَتَنَا عَلَى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ أَوْزَارَهُمْ عَلَى طهورهم ، ألا ساء ما يزرون ، وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُو نَ أَفَلَا تَعْقِلُوْن [انعام۔۳۱۔۳۲] (جو قیامت کے منکر ہیں، وہ یقیناً نقصان اٹھائیں گے، جب ناگہاں وہ گھڑی آجائے گی تو حسرت سے کہیں گے اس گھڑی کی نسبت ہماری سست اعتقادی پر افسوس (خاموش! کہ اب افسوس وحسرت کا وقت نہیں) آج ان کی پشت گناہ کے بوجھ سے

گراں ہے، کیا برا بوجھ ہے، مغرور! تم جس دنیا کی زندگی پر مغرور رہو، اس میں لہو ولعب کے سوا اور کیا دھرا ہے، دار آخرت نیک لوگوں کے لئے بہترین محل اقامت ہے، نادانو! کیا نہیں سمجھ سکتے)۔ (الہلال کلکتہ، ۱۵/اپریل ۱۹۱۴ء) (۱)

ربا

سود جس کو انگریزی میں (Interest) کہتے ہیں، عرب اس کو ربا کہتے ہیں، عربی میں ربا کے معنی زیادتی، اضافہ کو کہتے ہیں، اسی مناسبت سے قرض کے اصل رأس المال سے جو زیادہ وصول کیا جائے اس کو ربا کہتے ہیں۔ جواز سود کی کوشش میں اسلام کے ایک نادان دوست کی مضحکہ خیز تحقیق یہ ہے کہ قرن اول میں چونکہ قرآن پر اعراب نہ تھا، اس لئے مسلمانوں نے بجائے رُبا کے رِبا پڑھا، ورنہ اصلی لفظ رُبا تھا۔ جو فارسی مصدر ربودن سے مشتق ہے۔ جس کے معنی چھیننے اور جھپٹنے کے ہیں۔ اس بنا پر اصل قرآن مجید نے سود کو حرام نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ عام مسلمان سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس مال کو حرام کیا ہے جو چھین جھپٹ کر حاصل کیا جائے۔ اس تحقیق کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

صیاد نہ تو نخچیر مکن   چیزے کہ نہ خواندۂ تو تفسیر مکن

ایک دوسرے مضمون نگار کا جواز سود پر بڑا استدلال یہ ہے "کہ ہمارا سب سے بڑا استدلال یہ ہے کہ سود بہت پچھلے زمانہ سے تمام قوموں میں رائج ہے۔ برابر قومیں یکے بعد دیگرے سود لیتی رہی ہیں اور اس زمانہ میں ان کے لئے بہت سے انبیاء اور رسل مبعوث ہوئے، مگر کسی نے سود کو ناجائز نہیں قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے سوا اور قومیں جیسے یہود و نصاریٰ سود لیتی ہیں"۔ (اودھ اخبار جولائی ۱۹۰۹ء)۔

جب اس مقدمے پر نظر کی جائے کہ کسی قوم کے اعمال وافعال سے اس کے مذہبی احکام کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تو یقیناً ہم کو صحف انبیاء کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔ سب سے پہلے اولین کتب آسمانی تورات میں حضرت موسیٰ کی معرفت یہ کہا گیا ہے کہ تو کچھ قرض

(۱) مقالات سلیمان ج۳/۲۰۷۔۲۱۶

دیوے تو بہت تقاضہ مت کر اور اس سے سود مت لے (خروج: باب ۱۰، ۲۵۔۲۶)

اور احبار میں ہے: اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تہی دست ہو جائے تو اس کی دستگیری کرو، خواہ وہ اجنبی ہو، خواہ مہمان، تا کہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے۔ تو اس سے سود اور نفع مت لے۔

زبور میں سود کے متعلق حضرت داؤد کی معرفت کہا گیا: وہ جو سود کے لئے قرض نہیں دیتا اور بے گناہوں کو ستانے کیلئے رشوت نہیں لیتا، وہ جو یہ کرتا کبھی نہیں ٹلے گا۔ (زبور: سام۔۱۵)

انجیل میں ہے: اسی طرح مددگار بھی معتبر ہوئے نہ کہ دوزبان یا کہ شرابی یا ناروا نفع لینے والے۔ (پولوس کا خط (بال)

عرب میں یہودی قومیں کثرت سے آباد تھیں اور یہ نہایت سختی کے ساتھ سود لیتی تھیں۔ جیسا کہ سورۂ نساء کی اس آیت سے ظاہر ہے: فبظلم من الذین هادو حرمنا علیهم طیبات أحلت لهم.....واخذهم الرباوقدنهو اعنه (نساء:۱۶۱) ''جو لوگ یہودی ہیں ان پر بوجہ اس کے کہ وہ ظلم کرتے ہیں اور خدا کے راستہ سے لوگوں کو بہت روکتے ہیں اور سود لیتے ہیں، میں نے ان کے لئے وہ پاک چیزیں جو ان کے لئے حلال تھی حرام کر دی، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے''۔

یہودیوں کی اثر سے عرب میں بھی سود کا رواج پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت عباس بن عبدالمطلب اس قسم کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن جریر طبری: ج ۳۔ص۔ ۶۵)۔ جب یہ لوگ ایمان لائے تو ان آیتوں [سورۂ بقرہ۔۳۸، آل عمران۔۱۴، روم۔۴] میں خدا نے ان ناجائز منافع سے روکا۔

تصریحات بالا سے اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہودی، عیسائی، مسلمان، اور بعض دیگر فرقوں میں متفقاً سود حرام ہے، اور تمام انبیاء نے بالاجماع اس ناجائز کسب معاش سے لوگوں کو روکا ہے، کیا ایسی متفق علیہ ناجائز شے کے حلال کرنے کی ہمت کی جا سکتی ہے؟۔(۱)

(۱) مقالات سلیمان: ج۔۳ص۔۳۲۲۔۳۳۵

ضلالت

''ضلالت'' کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں، بلکہ نادانستہ بھولنے، بہکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں، عورتوں کی شہادت کے موقع پر: أن تضل احداٰهما فتذکر احداهما الاخری [بقرہ:۲۸۲]

(کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلائے اس کو دوسری، نہ چوکتا ہے میرا رب، نہ بھولتا ہے)۔

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ ''ضال'' کے معنی عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں، بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں، جس میں گمراہ کو گمراہی معلوم ہوتی ہے، لیکن ہنوز ہدایتِ الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی ہے، جہل کی برائی تو معلوم ہو گئی ہے، مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا، جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا، نبوت پا کر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو، حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: فَعَلْتُهَا إِذاً وَأَنَا مِنَ الضَّالِّيْنَ [شعراء:۲۰] (میں نے اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا)۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی، نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مر جانا، مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں، جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے، اس قبلِ نبوت کی زندگی کو بعد نبوت زندگی کے لحاظ سے جسے

یہاں ''ضلالت'' کہا گیا ہے، دوسری جگہ اس کو ''غفلت'' (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَـٰذَا الْقُرْآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ [یوسف:۳] (ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں کیوں کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا ہے، اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا)۔

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے، جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرمادیا ہے:

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحاً مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَـٰكِن جَعَلْنَاهُ نُوراً نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاء مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ. [شوریٰ:۵۲]

(اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنادیا، جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے)۔(۱)

دلوک

مفسرین میں سے بعض نے ''دلوک'' سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں، یعنی مقابل نقطہ نگاہ سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے:

ودلكت الشمس تدلك دلوكا غربت ، وقيل : اصفرت ومالت للغروب، وفي التنزيل العزيز : "أقم الصلاة لدلوك الشمس الى غسق الليل"

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ص:۶۷۔۶۸

وقد دلكت زالت عن كبد السماء.....وقال الفراء عن ابن عباس في دلوك الشمس : انه زوالها الظهر۔ قال : ورأيت العرب يذهبون بالدلوك الى غياب الشمس۔ قال الشاعر:۔

هذا مقام قدمي رباح ذبب حتى دلكت براح (يعني الشمس)

(آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب ہوا، اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہوگیا اور غروب کے لئے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ ''دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر'' اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی وہ آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا.....اور فراء نے کہا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ دلوک شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے: ''یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی۔ یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا)

قال أبو منصور وقد روينا عن ابن مسعود انه قال: دلوك الشمس غروبها، وروى ابن هانى عن الاخفش أنه قال: دلوك الشمس من زوالها الىٰ غروبها، وقال الزجاج : دلوك الشمس زوالها في وقت الظهر، وذلك ميلها للغروب وهو دلوكها أيضا ، يقال دلكت براح وبراج أى قد مالت للزوال حتى كاد الناظر يحتاج اذا تبصرها أن يكسرالشعاع عن بصره براحته .....فان قيل : ما معنى الدلوك في كلام العرب قيل : الدلوك الزوال ، ولذلك قيل للشمس اذازالت نصف النهار دالكة ، وقيل لها اذا أفلت دالكة ، لانها في الحالتين زائلة..... قال الفراء في قوله براح جمع راحة وهي الكف يقول: يضع كفه على عينيه ينظر هل غربت الشمس بعد.

(ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ دلوک شمس آفتاب کا

غروب ہے، اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا ہے کہ ''دلوک شمس'' ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں اور یہ بھی اس کا دلوک ہے، محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت براح و براج یعنی آفتاب زوال کیلئے جھک گیا، یہاں تک کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا چاہے تو اس کی کرن کی شدت کو توڑنے کیلئے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے.....تو کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لیے آفتاب کو دالکۃ کہتے ہیں جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے، تب بھی اس کو دالکۃ کہتے ہیں، کیونکہ وہ ان دونوں حالتوں میں جھک جاتا ہے.....فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے یہ راحۃ کی جمع ہے، جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں)۔

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجاج کہتا ہے:

والشمس قد كادت تكون دلفا أدفعها بالراح كي تزحلفا

(اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دبلا ہو جائے، میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے)۔

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے۔ اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے۔ دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی

ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں۔ بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گذرا تسامحاً یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے، اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے، اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ:

أقم الصلوة لدلوك الشمس (آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر) سے مراد تین نمازیں ہیں، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں، ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، عصر، جب اس کا دلوک سمت نظر سے ہوتا ہے اور مغرب، جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے، اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیت پاک سے جو سورۂ اسراء میں واقع ہے، اوقات پنج گانہ میں اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔(۱)

اطراف النہار

وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن آناء الليل فسبح وأطراف النهار [طہ:۱۳۰] (اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے، اور اس (آفتاب) کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ، اور دن کے کناروں میں) آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے، اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔

(۱) سیرۃ النبی: ج۵ ص:۷۵۔۷۷

یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ''اطراف'' کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں: صبح اور شام، یا تین ہیں، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح، دوپہر، اور شام، پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہوجاتا ہے اور ظہر غائب ہوجاتی ہے، دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آجاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے، مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں، مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین (دو مشرق اور دو مغرب) ہے، دوسری جگہ انھیں کو ''مشارق اور مغارب'' کہا گیا ہے، سورۂ تحریم میں ہے: فقد صغت قلوبکما (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں، قلوب (بصیغہ جمع) نہیں ہوسکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے، اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں، اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں، یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں: ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے انھیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں، صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبھا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لئے متعین ہوگیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔(۱)

علی الذین یطیقون:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْن [بقرہ:۱۸۴] (اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت ہو فدیہ ادا کریں، ایک مسکین کا کھانا۔

۱۔ بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے، ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں،

(۱) سیرۃ النبی: ج۵ص:۷۷۔۷۸

چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یطیقونہ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے، اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیہ ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے (الفوز الکبیر، باب ناسخ ومنسوخ)

۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے، اور یہ اجازت ان لوگوں کے لئے ہے جو روزوں سے معذور ہوں جیسے بڈھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ یطیقون کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اطاقۃ کو وسع کے معنی میں سمجھا گیا ہے، اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیں، تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو ناسخ ماننا پڑے گا اور یا آج کل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط ہے، اس کے معنی تو ہوں گے کہ غربا روزے رکھیں اور امراء فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہوجائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے، اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف اور آیت مابعد کہ فمن شھدمنکم الشھر فلیصمہ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزے رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کرسکنے کے ہیں، اس لیے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔

اطاقۃ کا باب افعال سے مصدر، اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا، فعل بنانے

کے لئے باب افعال مستعمل ہے اور طاقہ کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں، والطوق الطاقة ای أقصیٰ غایته وهو اسم لمقدارما یمکن أن یفعله بمشقة منه ،(طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے، جس کو کوئی مشقت ومشکل کے ساتھ کر سکے)۔ اطاقۃ کے اس معنی کی تائید قرآن پاک میں ہے:رَبَّنَا وَلاَ تُحَمِّلْنَا مَا لاَ طَاقَةَ لَنَا بِهِ [بقرہ:۲۸۶](اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ، جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے'' جس کی ہم کو طاقت نہیں، کے یہ معنی ہیں: جس کی ہم کو وسعت نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا، فرمایا:لاَ يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَهَا. [بقرہ:۲۸۶](اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔

اس لئے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالئے جس کو ہم اٹھا ہی نہیں سکتے ہوں، صحیح نہ ہوگا، بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بمشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں(لاطاقة لنا الیوم بجالوت وجنوده) [بقرہ:۲۴۹]۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بہ مشکل مقابلہ کر سکتے ہیں، حدیثوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے، ابوداؤد میں ہے:عن أبی جبیر عن ابن عباس: وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین ، قال: کانت رخصة للشیخ الکبیر والمرأة الکبیرة ، وهما یطیقان الصیام أن یفطرا ولیطعما مکان کل یوم مسکینا.

(حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے اجازت ہے کہ وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے

بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں)۔

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ ''یطیقان الصیام'' کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

ان وجوہ سے "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهُ فِدْيَةٌ "کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، بلکہ یہ ہوگا، کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔(۱)

لعنت

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ ''لعنت'' ہے، لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے، اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹ الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے، مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو:ثم نبتهل فنجعل لعنة اللّٰه علی الکذبین [آل عمران:۶۱](پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں)۔(سیرۃ النبی: ج۶ ص:۲۷۵۔۲۷۶)

شدید

قرآن پاک میں ایک آیت ہے، جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی اور بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں، اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے:مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء

(۱) سیرۃ النبی: ج۵ ص:۱۵۸۔۱۵۹

بَیۡنَهُم [فتح:۲۹] (محمد، خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں، اور آپس میں مہر ومحبت رکھتے ہیں)۔

اشداء علی الکفار کا یہ ترجمہ کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگدلی، بے رحمی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد، اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں، اور مقابلہ میں مسلمان ان پر بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے محاورہ کے مطابق اشداء علی الکفار کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے البحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں: أذلة علی المؤمنین أعزة علی الکافرین [مائدہ:۵۴] (فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر)۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں ہے:

یقوم أرهطی أعز علیکم من اللّٰه [ہود:۹۲]

(اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے؟)

دوسری آیت میں ہے: عزیز علیه ماعنتم [توبہ:۱۲۸] (تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے)

لسان العرب میں ہے: ورجل شدید قوی والجمع أشداء (ج ۴، ص ۲۱۸ مصر) مرد شدید، یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء آتی ہے۔

قرآن پاک میں: أشد قوة أشد خلقا، أشد تثبیتا، أشد منهم بطشا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرے مشتقات میں

بھی یہ معنی مراد لئے گئے ہیں: اشْدُدْ بِهِ أَزْرِیْ [طہ:۳۱] (اس سے میری کمر کو مضبوط کر)

وَبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعاً شِدَاداً [نبأ:۱۲] (اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے)۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ [ص:۲۰] (اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی)۔

فشدوا الوثاق [قتال:۴] (پھر مضبوط باندھو)۔

شدید کے مشترک معنی یہ ہے کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرامؓ کی صفت تھی، انھوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروانہ کی، تکلیفوں کے تیروں کی بوچھار سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا، اور جس کی تصدیق کر چکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ سألقی فی قلوب الذین کفروا الرعب [آل عمران:۱۵۱ وانفال:۱۲] کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھادوں گا۔ وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا: وقذف فی قلوبهم الرعب [احزاب:۲۶۔ حشر:۲] (ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا)۔

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب کے بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامان جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے: وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ [انفال:۶۰] (ان کیلئے تم سے جو طاقت ہو سکے، اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو)۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز وسامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور آنحضرتؐ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے۔ فرمایا: جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ

اس کے لئے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لئے باندھتا ہے، اس کے لئے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لئے باندھتا ہے وہ اس کے لئے عذاب ہے(صحیح بخاری)، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی وقومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لئے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل وانصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔(۱)

قوامون علی النساء

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعُضَهُمُ عَلَى بَعُضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنُ أَمُوَالِهِمُ [نساء:۳۴] (مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی، اور اس لئے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا)۔

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم وطاقت اور عقل وفراست وغیرہ میں جسمانی وذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اس لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہئے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دَین مہر، نان ونفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لئے انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے

(۱) سیرۃ النبی: ج ۶ رص: ۸۵۔۸۷

کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے۔

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهُجُرُوهُنَّ فِي الُمَضَاجِعِ وَاضُرِبُوهُنَّ فَإِنُ أَطَعُنَكُمُ فَلَا تَبُغُوا عَلَيُهِنَّ سَبِيلًا [نساء:۳۴] (اور جن بیویوں کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں اسے علیٰحدگی برتو، اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو)

لغت میں نشوز کے معنی ''اٹھ جانے'' کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں، وہ مفسر ابن جریر کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:ومعنی ذٰلك اذا رأیتم منهن ماتخافون أن ینشزن علیکم من نظر الی مالاینبغی لهن أن ینظرن الیه ویدخلن ویخرجن، استربتم بأمرهن (تفسیر طبری ج ۵ر۳۸ مصر) (اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے نشوز کا ڈر ہو، یعنی ادھر دیکھنا جدھر انہیں دیکھنا نہیں چاہئے، اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے)۔

عن محمد بن کعب القرظی اذا رأی الرجل تقصیرها فی حقه فی مدخلها ومخرجها، قال یقول لها بلسانه قد رأیتك منك کذا وکذا فانتهی (ایضا) (محمد بن کعب قرظی روایت سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے، تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی، یہ دیکھی تو اب باز آجا)۔

فقہ کی کتابوں میں ہے:الناشزة هی الخارجة عن منزل زوجها، المانعة نفسها منه (عالمگیری، نفقات) (نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے)۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی

جائیں، کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے، اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغض رکھے (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں، اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیت مذکور پوری یہ ہے: الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا [نساء:۳۴] (مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس لئے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور (دوسرے) اس لئے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں، اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت وآبرو کی) حفاظت کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ، اور ان کو خوابگاہوں میں علیحدہ کردو، اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو)۔ (سیرۃ النبی: ج ۶ ص: ۱۲۸۔۱۳۰)

الجار ذی القربی

انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو، اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لئے ہر مذہب میں ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے، وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہونچ سکتے

ہیں۔ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہونچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے، جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لئے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برائیوں کا سد باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے، ارشاد باری تعالی ہے: وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ [نساء:۳۶] (اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)

اس ''قریب اور بیگانہ'' کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ ''قریب'' کے معنی رشتہ دار وعزیز اور بیگانہ کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں، دوسرے کی رائے ہے کہ ''نزدیک'' کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور ''دور'' سے مطلب دوسرے مذہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ، لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیم محمدیؐ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسائیوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی، جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو یا ہم مذہبی ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بحر حال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرتؐ نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہؓ کے مجمع میں آپؐ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دل نشیں انداز سے فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، جان نثاروں نے پوچھا: کون یارسول اللہ (ﷺ)! فرمایا: وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں، ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا: جو خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے (صحیح بخاری) ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ فرمایا: جو شخص خدا اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو

ایذا نہ دے۔(۱)

وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ

وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ [ضحیٰ:۹] (اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر)۔

یہاں سوال کرنے والے کے معنی اغنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم، وسعت کو چاہتا ہے، یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو، طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وأما من سألك من ذی حاجة فلا تنهر، زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے ، یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے، اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو۔ بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو۔ اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔(۲)

العزة

أيبتغون عندهم العزة فان العزة لله جميعا [نساء:۱۳۹] (کیا یہ ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے)

عزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ وشرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے، اس لئے ہر جگہ اس کے وہ معنی لئے جائیں گے، جو سیاق وسباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے: کسی کا ایسی حالت ومنزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے (دیکھو لسان العرب ومفردات راغب اصفہانی وابن جریر طبری آیات عزت: سورہ بقر ونساء وص ومنافقون)(۳)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/ص:۱۳۷
(۲) سیرۃ النبی ج۶/ص:۱۴۷
(۳) سیرۃ النبی: ج۶/ص:۲۴۶

أعدوا لهم ما استطعتم من قوة

مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے: أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ [فتح:۲۹] (وہ کافروں پر زور آور ہیں)۔

اشدآء کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زور مند اور قوی دست کیا جا سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصا اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے: وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ [انفال:۶۰] (اور ان کے لئے تم سے جو ہو سکے یعنی زور وقوت اور گھوڑے باندھنا تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے، مرعوب کرو)۔

اس ''قوت'' کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامان جنگ وقتال سے کی گئی ہے، مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیراندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ معناً مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے (تفسیر طبری) غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان واسلحہ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں، اور ان سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔(۱)

الغائط

اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ، پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایۃ کرنا چاہئے، پائخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث میں

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/ص:۲۵۳

قضائے حاجت کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید میں اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں: أو جآء أحد منکم من الغائط [نساء:۴۳] (یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہوکر) آیا ہو)۔

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لئے استعارۃ اس سے پائخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائیں خانہ ہے، چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لئے استعارۃ ان کو پائیں خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہوگیا، اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی۔(۱)

لباس التقویٰ

ولباس التقویٰ ذٰلك خیر [اعراف:۲۶] (اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے)۔

پرہیزگاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمال صالحہ اور شرم وحیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہئے، اسی لئے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے، مشہور تابعی مفسر ابن زیدؒ نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد وورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں (روح المعانی) لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیزگاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہئے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہے، اس کو آنحضرتؐ نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرمادیا ہے، شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

''اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے، اور دامن دراز

(۱) سیرۃ النبی: ج۶، ص:۳۵۰

نہ رکھے، اور جو منع ہوا ہے، سو نہ کرے، اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے، اور اپنی زینت نہ دکھاوے'' (تفسیر اعراف آیت مذکور)(۱)

حسنة الدنیا والآخرة

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار [بقرہ:۲۰۱] (اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے، اور آخرت میں بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا)۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے بتائی ہے، علم وعبادت، تندرستی، روزی، مال ودولت، فتح ونصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تجدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا: للذین أحسنوا فی هذه الدنیا حسنة، ولدار الآخرة خیر، ولنعم دارالمتقین [نحل:۳۰] (اور جنہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے)۔

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے، اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے: فَآتَاهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الآخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْن [آل عمران:۱۴۸] (تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے)۔

دنیا کا ثواب فتح ونصرت، ناموری وعزت، مال ودولت، اور حکومت وسلطنت ہے۔(۲)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶، ص:۳۸۰

(۲) سیرۃ النبی: ج۷، ص:۱۷-۱۸

متفرقات قرآن

حنیف

ایک بار درس قرآن کے موقع پر لفظ ''حنیف'' کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''کتب احادیث میں نبوت سے قبل کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ کے متعلق ایک لفظ ''یتحنث'' کا آتا ہے، جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ عبادت کیا کرتے تھے، فرمایا کہ میرے ذوق میں یہ لفظ اصل میں ''یتحنف'' ہے، یعنی حضور ﷺ کا دین حنفی (ابراہیمی)''۔

اتفاق کی بات، میں کسی ضرورت سے ابن کثیر کی البدایہ النہایہ جلد ۳/ ۵ دیکھ رہا تھا، اس میں ابن الاعرابی کے حوالہ سے یہی قول درج ہے، میں نے سید صاحب کے ملاحظہ میں پیش کیا، حسب معمول تبسم فرمایا اور اظہار طمأنیت فرمایا۔(۱)

حنیف، حنف سے مشتق ہے، عربی میں اس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں، اس لئے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے، یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہوسکتا ہے (لسان العرب)۔

اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی ہے تو حنیف کے وہ معنی ہوسکتے ہیں جس میں عبرانی وسریانی میں وہ مستعمل ہے یعنی کافر ومنافق، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام کو ترک کر کے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس میں اہل عرب اس کو بولتے ہیں، یعنی دین دار اور خدا پرست، اس بنا پر اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تعیین، موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی، اصل میں اس کا ابتدائی استعمال للہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، یعنی **الحنیف للہ**۔ (خدا

(۱) تعمیر حیات مئی ۱۹۶۴ء

کی طرف جھکنے والا)، **الحنیف للدین**، (سچے مذہب کی طرف جھکنے والا)، کثرت استعمال اور زبان زدگیٔ عام سے اس قید کی ضرورت نہ رہی اور مطلق حنیف (جھکنے والا) کے معنی بھی **حنیف للّٰہ** (سچے مذہب کی طرف جھکنے والا) ہی کے سمجھے جانے لگے، چنانچہ قرآن مجید میں اس لفظ کا دونوں طرح استعمال ہوا ہے، سورۂ حج میں ہے: **حنفاء للّٰہ** (خدا کی طرف مڑنے والے بن کر) لیکن سورۂ بینہ میں بغیر صلہ کے آیا ہے: **مخلصین لہ الدین حنفاء** (اپنے اعتقاد کو خدا کے لئے خالص کر کے مڑنے والے بن کر) یہاں حنفاء کے معنی **حنفاء للّٰہ** سمجھنے چاہئیں۔

ہمارے مفسرین کو اس باب میں تزلزل رائے ہے کہ لفظ ''حنیف'' کی لغوی تحقیق میں انہوں نے قرآن مجید سے اعانت نہیں لی، ''حنیف'' حنف سے مشتق ہے، حنف کے معنی ہٹنے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں، حالانکہ یہ مذہب حق ہے، اس کے معنی سیدھے ہونے کے ہونے چاہئے، یورپین مصنف ہم کو بتاتے ہیں کہ سریانی میں اس کے معنی کافر کے اور عبرانی میں منافق ہیں، اور طعنہ دیتے ہیں کہ مقدس پیروان محمدؐ نے اس کی لفظی تحقیق کی پرواہ نہیں کی (لائف آف محمدؐ مارگولیوتھ ص/۱۶۶).....اور مشورہ دیتے ہیں کہ قبیلہ بنوحنیفہ کے جھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے نام کو اس لفظ کا ماخذ بنائیں، یعنی یہ کہ مسیلمہ سے ''مسلم'' اور حنیفہ سے ''حنیف'' کا لفظ لیا گیا ہے (حنیف کا لقب اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھا، مسیلمہ نے آنحضرتؐ کے اخیر عمر میں دعویٰ نبوت کیا تھا)۔ یورپ کے مشرقی تبحر کا ظرف بایں ہمہ ادعائے وسعت بہرحال تنگ ہے، اس لئے اس کی ہم کو شکایت نہیں کہ مایہ ناز فرنگ نہ صرف آغاز تاریخ اسلام سے ناآشنا، بلکہ آئین زبان عرب سے بھی آگاہ نہیں، (کسی عربی قاعدہ کے مطابق بنوحنیفہ سے حنیف اور مسیلمہ سے مسلم مشتق نہیں ہوسکتا)۔ دنیا میں کس نے اپنا امتیازی لقب دشمن کے نام اور خاندان پر رکھا ہے، اصل یہ ہے کہ نری عربی دانی اور بات ہے اور اسلامی واقفیت اور چیز ہے:

عشق بازان دیگراند و عشق سازان دیگراند
آنچہ در فرہاد می بینیم در پرویز نیست

اہل عرب کے نزدیک حنیف حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا، اس لئے ان کے مذہب کا نام ملت حنیف انہوں نے رکھا تھا، عرب کے بعض نیک دل لوگ جو عرب کے تمام موجودہ مذاہب بت پرستی، یہودیت، اور عیسائیت کے مفاسد سے گھبرا کر تلاش مذہب میں نکلتے تھے وہ آخر اسی آستانہ دین حنیف پر آ کر تسلی اور اطمینان پاتے تھے۔

ہر زبان میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملیں گی، بلکہ اصطلاحات عموماً اسی طرح بنتی ہیں، مثال کے لئے حنیف کے ہم معنی لفظ ''مسلم'' کو لیجئے، مسلم کے اصلی معنی سونپنے والے ہیں، کوئی شخص اپنے دوست کو کسی دشمن کے حوالہ کر دے تو عربی میں اس کو مسلم کہیں گے، اور یہ مذموم معنی ہوں گے، اس کا ابتدائی استعمال مسلم للہ (اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دینے والا) تھا، جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت میں ہے: بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ [بقرہ:۱۱۲] (ہاں جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کیا)۔

لیکن کثرت استعمال سے صرف مسلم رہ گیا اور معنی وہی مسلم للہ کے سمجھے جانے لگے اور اب کسی کو خطور بھی نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی بڑا مفہوم بھی ہے، اصل یہ ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ابراہیمؑ کی بعثت صابئ قوم کے اندر ہوئی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے دلائل اور عمل دونوں طریقوں سے ان کے مذہب کی تردید کی، باطل پرستیوں سے سخت تنفر ظاہر کیا، اور خدائے برحق پر ایمان لائے، اسی بناء پر انہوں نے خود یا بعد کو ان کے پیروؤں نے اپنا لقب ''حنیف'' اختیار کیا ہے، یعنی ستارہ پرستی وغیرہ سے مڑ کر خدا پرستی کی طرف آنے والا، اس قول کی صحت قرآن مجید کے موقع استعمال سے ثابت ہوتی ہے، ستارہ پرستی کی تردید میں ایک ایک ستارہ کو لے کر حضرت ابراہیمؑ کا اس کی ربوبیت سے انکار کرنا جہاں قرآن میں مذکور ہے اس کے آخر میں ہے: قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفاً وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ [انعام:۷۸-۷۹] ''(بالآخر) ابراہیمؑ نے کہا! لوگو! میں ان سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میں اپنا منھ ان کی طرف سے پھیر کر اس

ذات پاک کی طرف جھکتا ہوں، جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا حنیف بن کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں)۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ اعلان گویا دین ابراہیمی کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے، اس اعلان کی یہ عبارت کہ ''میں ہر طرف سے منھ پھیر کر خالق ارض وسما کی طرف منھ کرتا ہوں، اور اس کے بعد یہ کہنا کہ حنیف بن کر اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ، اور حنیفا کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی کہ جو ستارہ وغیرہ باطل پرستیوں سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رخ کرے، قرآن مجید کی دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حنیف کے معنی اول یہی ہیں: وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً [یونس:۱۰۵] (سچے مذہب کی طرف اپنا منھ کرو (باطل پرستیوں سے) منھ موڑ کر)۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ [روم:۳۰] (پھر اپنا منھ سچے مذہب کی طرف سیدھا کرو (باطل پرستوں سے) منھ موڑ کر، خدا کی یہ بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر ان لوگوں کو پیدا کیا)۔ بعد کو بڑھتے بڑھتے اس لفظ کے معنی زاہد وعابد ودیندار کے ہو گئے۔

جاہلی شاعر جران العود کا شعر ہے:

وأدركن أعجازاً من الليل بعدما أقام الصلوة العابد المتحنف

(سواریوں نے رات کے آخری حصہ کو پالیا، جب کہ عابد دیندار اپنی نماز ادا کر چکا)۔

جاہلیت کا مشہور شاعر ابوذویب ہذلی کہتا ہے:

أقامت به لمقام الحنيف شهرى جمادىٰ وشهرى صفر

(اس نے وہاں قیام کیا جس طرح دیندار (حنیف) جمادی کے دو مہینے اور صفر کے دو مہینے قیام کرتا ہے)۔ یہ دونوں شعر لسان العرب میں ہیں۔

یہاں پہنچ کر ہم کو ایک دقیق نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے، جس طرح ''صابی'' کے معنی عبری میں پاک اور طاہر کے ہیں، لیکن عربی میں کافر کو کہتے ہیں، حنیف کا حال اس کے بالکل

ضد ہے،عبرانی وآرامی میں کافرومنافق کے ہم معنی اورعربی میں دیندارو موحد کے مرادف ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں لفظ مقابل کے فرقوں کے نام ہیں، اوران کے اچھے اور برے مفہوم صرف مذہبی اتحادمخالفت پرمبنی ہیں، یہی سبب ہے کہ مسلمان خوداپنے کوحنفاء کہتے تھے،لیکن کفاران کوتعصب سے صباۃ (صابی کی جمع) کالقب دیتے تھے۔

قرآن مجید کی آیتوں پرنظرکرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حنیف کا مقابل مشرک ہے،اسی بناء پرقرآن مجید میں جہاں جہاں حنیف کالفظ آیاہے،اس کے ساتھ ساتھ شرک کی نفی بھی کی گئی ہے: حَنِيفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔[انعام:۷۹] (موحدبن کراورمیں مشرکوں میں نہیں)۔ حُنَفَاء لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ[حج:۳۱] (خدا کے موحدبن کرنہ مشرک)۔

وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [یونس:۳۰] (اپنامنھ سچے مذہب کی طرف کرموحدبن کراورمشرکین میں سے نہ ہو)۔

بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔[بقرۃ:۱۳۵]

(بلکہ ابراہیمؑ موحد کا مذہب، وہ مشرکوں میں سے نہ تھا)۔ فَاتَّبِعُواْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْن [آل عمران:۹۵] (ابراہیمؑ موحد کے مذہب کی پیروی کرو، وہ مشرکوں میں سے نہ تھا)۔ وَلَكِن كَانَ حَنِيْفاً مُّسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْن۔ [آل عمران:۶۷] (بلکہ ابراہیمؑ موحد مسلم تھااورمشرکوں میں سے نہ تھا)۔

دِيْناً قِيَماً مِّلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْن ۔[انعام:۱۶۱] (پکا مذہب ابراہیم موحد کا، اوروہ مشرکوں میں نہ تھا) إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلّهِ حَنِيْفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [نحل:۱۲۰] (ابراہیمؑ پیشواتھا،متواضع اورخدا کا موحداورمشرکوں میں سے نہ تھا)۔أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْن ۔[نحل:۱۲۳] (ابراہیمؑ موحد کے مذہب کی پیروی کراوروہ مشرکوں میں سے نہ تھا)۔

ان آیتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہب دراصل حضرت ابراہیمؑ کا تھا

اوران ہی کی یادگار کے طورپران کی نیک دل اولاد میں اس کا کسی قدرحصہ باقی رہ گیا، یہوداورنصاریٰ مسلمانوں کوکہتے تھے: مذہب حق تو یہودیت یاعیسائیت ہے، یہ تیسرا کون سا مذہب ہے؟ قرآن نے جواب دیا کہ یہ دونوں توبعد کی شاخیں ہیں، اصل مذہب وہ ہے جس کی دعوت ''قوموں کے باپ'' ابراہیمؑ نے دنیا کودی، (توراۃ میں ہے کہ ابراہیم کے لفظی معنی قوموں کے باپ کے ہیں)۔

وَقَالُواْ كُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُواْ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ[بقرہ:۱۳۵] (انہوں نے کہا کہ یہودی یاعیسائی ہوجاؤتوراہ راست پاؤ، کہوکہ نہیں بلکہ ابراہیمؑ موحد کا مذہب اوروہ مشرکوں میں سے نہ تھا)۔

فرماتا ہے :أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأَسْبَاطَ كَانُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَى قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللّهِ. [بقرہ:۱۴۰] (تم کہتے ہوکہ ابراہیمؑ اوراسماعیلؑ اوراسحاقؑ اوریعقوبؑ اوراولاد یعقوب یہودی یاعیسائی تھے، کہوکہ تم زیادہ جانتے ہو یا خدااوراس سے بڑھ کرظالم کون ہوگا جوخدا سے اپنی شہادت چھپاتا ہو)۔

یعنی ظاہر ہے کہ یہودیت اورعیسائیت ان پیغمبروں سے بہت بعد کی چیزیں ہیں، اس لئے اسلام اس اصلی اورسچے مذہب کا داعی ہے جوان پچھلی آمیزشوں سے پاک ہے: ومن يرغب عن ملة ابرٰهيم الامن سفه نفسه. [بقرہ:۱۳۰] (بیوقوف کے سوا اورکون مذہب ابراہیمؑ سے پھرے گا)۔

کیونکہ:مَا كَانَ إِبْرَاهِيْمُ يَهُودِيّاً وَلَا نَصْرَانِيّاً وَلَكِن كَانَ حَنِيْفاً مُّسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [آل عمران:۶۷] (ابراہیمؑ نہ یہودی تھا، نہ عیسائی، بلکہ موحد مسلم تھااورمشرکوں میں سے نہ تھا۔

اورائے اسمٰعیلی عربو! یہی:مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيْمَ [حج:۷۸] (مذہب تمہارے باپ ابراہیمؑ کا ہے)۔

باپ کی یہ وراثت بیٹوں میں موجود تھی، اس مذہب کے قبول کی رسمی علامتوں میں سے سب سے بڑی علامت ختنہ ہے جو اولاد ابراہیمؑ کے ساتھ مخصوص ہے، عربوں میں یہ رسم ہمیشہ سے موجود تھی، عبادت کی چیزوں میں بیت الوہیم یعنی بیت اللہ کا طواف، دین ابراہیمی کی سب سے پرانی یادگار ہے، عرب نے اپنے باپ کی اس پرانی یادگار کو بھی ہمیشہ باقی رکھا، باقی توحید وغیرہ کے اصلی عقائد وہ اکثر سینوں سے مٹ کر محو ہو گئے تھے، اسی بنا پر عرب میں حنیف کے معنی صرف یہ رہ گئے تھے کہ ''جو مختون ہو اور جس نے حج کیا ہو'' (لسان العرب لفظ ''حنیف'')۔

اسلام سے کچھ پہلے جب یہودی اور عیسائی مذہب عربوں میں فروغ پانے کے لئے ہر طرح کوشاں تھے، پرانے مذہب کو جس کا صرف ڈھانچہ رہ گیا تھا، بعض نیک دل اور نکتہ فہم عربوں نے نئے سرے سے زندہ کرنا چاہا، لیکن اس کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ خود صناع عالم کی کارفرمائی کے بغیر انسانی مسیحائی اس کو حیات ثانی نہیں بخش سکتی تھی۔

آغاز اسلام میں جن چند نیک لوگوں کے نام حنفاء کے لقب سے لئے جاتے ہیں، وہ خود اپنے مذہب سے آگاہ نہ تھے، اور حق کے متلاشی تھے، قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عثمان بن حویرث، امیہ بن صلت، زید بن عمرو بن نفیل، قیس بن نشیہ، عبداللہ بن جحش وغیرہ بت پرستی سے بیزار ہو کر حق کی راہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یا عیسائی ہو گئے (مثلاً قس اور ورقہ) یا اصل حنفی مذہب کی تلاش میں سر ٹکرا کر مر گئے (مثلاً زید اور امیہ) اور یا اسلام کی روشنی جب چمکی تو حق کو دیکھا اور دین حنیف کا سراغ پایا اور قبول کیا (مثلاً عثمان اور عبداللہ بن جحش اور قیس بن نشیہ وغیرہ)۔

زمانہ جاہلیت میں ایسے متعدد شعراء گذرے ہیں جن کے کلام میں حق کی باتیں الفاظ کی تاریکی میں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں، مثلاً لبید (قبل اسلام) زہیر، امیہ بن ابی الصلت، علاف بن شہاب تمیمی، قس بن ساعدہ الایادی، وغیرہ شعراء کے کلام میں توحید، حشر ونشر اور محاسن اخلاق کی تعلیم ملتی ہے، آج کل کے بعض عرب عیسائی مصنفوں نے اس قسم

کے عرب شاعروں کو عیسائی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اپنی کوشش کی بنیاد ریت پر قائم کی، اور ایک دلیل بھی وہ دعوی کی استواری میں پیش نہ کر سکے، میرے خیال میں یہ شعراء حنفی العقاید تھے، چنانچہ ان میں سے بعض کے کلام میں اس کی تصریح بھی ملتی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بعد کو بعض سادہ لوح مسلمانوں یا شریر لوگوں نے بہت سے جھوٹے شعر بنا بنا کر ان لوگوں کی طرف منسوب کر دئے ہیں، قرآن کی آیتوں کی آیتیں لے کر ان کو موزوں کر کے ان کے نام سے شعر کہہ دئے ہیں۔ آج کل کے عربی داں عیسائی ان اشعار کو بڑی چالاکی سے اس ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ دیکھو محمدؐ نے شعرائے جاہلیت کے کلام کو الٹ پلٹ کر قرآن بنا دیا ہے، ان اشعار میں صحیح اور غلط اور سچے اور جھوٹے کی تمیز صرف عربی زبان کے باریک بیں اور نکتہ شناس ادیب ہی کر سکتے ہیں، جو جاہلیین اور مولدین کے کلام کو بیک نظر دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ان میں موتی اور پوت کون ہے؟ (۱)

شرک

عرب کا سب سے وسیع الاثر مذہب شرک تھا، شرک کے یہ معنی ہیں کہ ایک خدا کو مان کر اس کی اعانت وامداد کے لئے اس کے اعوان وانصار کا یقین رکھا جائے۔

عرب میں زیادہ تر اسی عقیدے کے لوگ تھے، وہ گو ہر قسم کے دیوتاؤں اور دیویوں کے قائل تھے، بتوں کو سجدہ کرتے تھے، جنات اور فرشتوں کو نذر چڑھاتے تھے، تاہم ایک قوت اعظم کے وجود سے وہ بے خبر نہ تھے، ان صدہا معبودوں کے جھرمٹ میں ان کو وہ جلوہ اقدس بھی نظر آتا تھا، جس کو وہ اللہ کہتے تھے، آسمان وزمین کی پیدائش اور اس کارخانۂ فطرت کے اور بڑے بڑے کام اسی کے دست قدرت کا نتیجہ سمجھتے تھے، یہی سبب ہے کہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں زیادہ تر اللہ ہی کا نام آتا ہے، اور اسی کی طرف تمام افعال کی نسبت ہوتی ہے، گو اس کے ساتھ بتوں اور دیوتاؤں کے نام بھی جا بجا ان کے اشعار میں ملتے ہیں، لیکن

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲ ص: ۱۶۶-۱۷۲

ان بتوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں کو اللہ کے عزیز واقارب یا اس کی بارگاہ کے مقرب درباری جانتے تھے، اوران کی عبادت اور پرستش اس لئے کرتے تھے، تاکہ وہ خوش ہوکر اللہ تعالیٰ کو ہم سے راضی رکھیں، قرآن مجید نے متعدد موقعوں پر کفار عرب کو ٹوکا ہے کہ جب اصلی قوت اللہ کے ہاتھ میں ہے تو اوروں کو کیوں پوجتے ہو؟ اور جب تم یہ مانتے ہو کہ آسمان، زمین، چاند، ستارے سب اسی کے بنائے ہیں تو ان کو خدا کیوں کہتے ہو؟

قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَ بَلْ أَتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ [مؤمنون:۸۴۔۹۱]

(اگر تم کو علم ہے تو بتاؤ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے یہ سب کس کا ہے؟ وہ کہیں گے خدا کا، کہو کہ پھر تم کیوں نہیں سمجھتے، ان سے پوچھو کہ سات آسمانوں کا اور عظیم الشان عرش کا مالک کون ہے؟ یہی کہیں گے کہ سب اللہ کا ہے، کہو کہ پھر اس سے ڈرتے نہیں، اگر جانتے ہو تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر شئے کی حکومت ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے پناہ دیتا ہے، اوراس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، جواب دیں گے: یہ قدرت تو اللہ کی ہے، ان سے کہو کہ پھر تم کیوں بے عقل ہو گئے ہو، حق یہ ہے کہ سچی بات ہم نے ان کو پہنچادی اور وہ جھوٹے ہیں، نہ تو خدا نے کسی کو بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، ورنہ ہر خدا اپنی مخلوقات کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر غالب آجاتا، یہ مشرکین جو باتیں بیان کرتے ہیں، خدا ان سے پاک ہے)۔

ان آیات میں مشرکین کے عقائد کا بہ تفصیل ذکر ہے، ولدیت کی اس میں جو تردید ہے وہ عیسائیوں سے متعلق نہیں، بلکہ مشرکین کے متعلق ہے، وہ فرشتوں کو خدا کے

فرزند سمجھتے تھے، دوسری آیتوں میں اس کی توضیح آئے گی، آیات ماسبق کے ہم معنی یہ آیتیں بھی ہیں:

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ [یونس:۳۱] (پوچھو تم کو آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے، کون تمہارے حاسہ سمع اور حاسہ بصارت پر قدرت رکھتا ہے، کون ذی حیات چیز سے مردہ (جامد) شئے اور مردہ (جامد شئے) سے ذی حیات چیز پیدا کرتا ہے اور کون دنیا کا انتظام چلاتا ہے، جواب دیں گے: اللہ، کہو کہ پھر اس سے ڈرتے نہیں؟)

مشرکین کو اس بات کی چڑھ تھی کہ محمد ﷺ تنہا اللہ کا نام کیوں لیتے ہیں، اس کے ساتھ دیوتاؤں کو کیوں شریک نہیں کرتے: وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا [اسرائیل:۴۶] (جب تو اپنے پروردگا کا نام تنہا قرآن میں لیتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہیں)۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ [زمر:۴۵] (جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل جن کو آخرت کا یقین نہیں، کڑھنے لگتے ہیں اور جب ان کے سوا اوروں کا نام لیا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں)۔

اذادعی اللّٰہ وحدہ کفرتم وان یشرك به تؤمنوا [مومن:۱۲] (جب تنہا خدا کا نام پکارا جاتا ہے تو تم انکار کر بیٹھتے ہو اور اگر اس کا کسی کو شریک کیا جائے تو مانتے ہو)۔

سورۂ نمل میں نہایت بلیغانہ انداز میں قرآن نے خدا کی مختلف قدرتوں اور صفتوں کو گنایا ہے اور ہر فقرے کے بعد پوچھا ہے: ء إلٰـه مع اللّٰـه (کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟) ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدائے برحق کے قائل تھے، اب ذیل کی آیتوں سے ثابت ہوگا کہ وہ دیگر معبودوں کا کیا رتبہ سمجھتے تھے، ان کو کس نظر

سے پوجتے تھے: ویعبدون من دون اللّٰہ مالا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا عند اللّٰہ. [یونس:۱۸] (خدا کے سوا وہ اس کو پوجتے ہیں جو نہ ان کو نقصان پہونچاتا ہے نہ فائدہ، اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے معبود اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں)

سورۂ زمر میں ہے: والذین اتخذوا من دونہٖ أولیآء ما نعبدھم الا لیقربونآ الی اللّٰہ زلفی[زمر:۳]. (اور جن لوگوں نے خدا کے سوا اوروں کو مددگار بنایا اور جو کہتے ہیں کہ ہم تو ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ خدا سے ہم کو قریب کردیں)۔

عرب میں بت پرستی کا شیوع تھا، مٹی، پتھر اور لکڑی کی مورتیں بنائی جاتی تھیں، ان کی پوجا ہوتی تھی، قرآن میں ان بتوں کے لئے چار الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں: أصنام، اوثان، نصب وانصاب، تماثیل، خاص اہل عرب کے بتوں کے لئے ایک دفعہ صرف دوسرا (اوثان) اور دو دفعہ تیسرا (نصب وانصاب) لفظ آیا ہے، اہل عرب اپنے ہی گونگے، بہرے اور لنگڑے خداؤں کو پوجتے تھے، ان کے لئے قربانی کے چڑھاوے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے، ان کے آگے فال کے پانسے ڈالتے تھے، قرآن نے ان کو حرام کیا[مائدہ:۱۹۱۔۱۹۵]

فرشتوں کے متعلق ان کا اعتقاد یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اسی لئے ان کو عورت فرض کرتے تھے۔ قرآن نے کہا: ألکم الذکر ولہ الانثی، تلك اذا قسمة ضیزیٰ، ان ھی الا أسماء سمیتموھآ أنتم وآباؤکم مآأنزل اللّٰہ بھا من سلطٰن. [نجم:۲۲] (کیا تمہارے بیٹا ہو اور اللہ کے بیٹی ہو، یہ تو نامنصفانہ تقسیم ہے، یہ فقط چند نام ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیا، اور خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری)۔ (اہل عرب لڑکی سے ناراض ہوتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ گھر میں لڑکی پیدا ہو گویا لڑکی کو برا سمجھتے تھے اور لڑکے کو پسند کرتے تھے، لیکن خدا کے بارے میں ان کا اعتقاد الٹا تھا، یہ اس کی تردید ہے)۔

پھر آگے چل کر خدا فرماتا ہے: إِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَیُسَمُّونَ

الْمَلَائِکَةَ تَسْمِیَةَ الْأُنثَی [نجم:۲۷] (جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کا نام عورت کا رکھتے ہیں)۔

سورۂ طور میں ہے: أَمْ لَہُ الْبَنَاتُ وَلَکُمُ الْبَنُونَ [طور:۳۹] (کیا اس کے لڑکیاں ہوں اور تمہارے لڑکے ہوں)۔

سورہ انبیاء کی آیت: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَداً سُبْحَانَہُ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُونَ [انبیاء:۲۶] (یہ مشرک کہتے ہیں کہ خدا نے لڑکا بنایا ہے، نہیں، بلکہ وہ معزز بندے ہیں۔ (یعنی فرشتے)۔

مشرکین بھوت پریت اور جنات کے بھی قائل تھے، ان کو خدا یا خدا کے ہم پایہ سمجھتے تھے، ان کی دہائی مانگتے تھے، اور ان کے غضب سے ڈرتے تھے: وَجَعَلُوا لِلّٰہِ شُرَکَاء الْجِنَّ وَخَلَقَھُمْ وَخَرَقُوا لَہُ بَنِیْنَ وَبَنَاتٍ بِغَیْرِ عِلْمٍ [انعام:۱۰۱] (اور جہالت سے جنوں کو خدا کا شریک بنایا، حالانکہ خدا نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور خدا کے لئے بیٹے بیٹیاں جھوٹ گھڑی ہیں)۔

صحیح مسلم کی کتاب التفسیر میں ہے کہ ذیل کی آیت ان عربوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جو جنات کی پرستش کرتے تھے: أُولَـئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُونَ یَبْتَغُونَ إِلَی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَةَ أَیُّھُمْ أَقْرَبُ وَیَرْجُونَ رَحْمَتَہُ وَیَخَافُونَ عَذَابَہُ [بنی اسرائیل:۵۷] (وہ جن کو یہ مشرکین پکارتے ہیں ان میں سے (ان کے خیال میں) جو زیادہ مقرب ہیں اپنے پروردگار کی طرف قربت کا ذریعہ ڈھونڈتے ہیں، اور اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خوف زدہ ہیں)۔

سورۂ جن میں اللہ تعالیٰ نے جنوں کا مقولہ نقل فرمایا ہے: وَأَنَّہُ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ یَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوھُمْ رَھَقاً [جن:۶] (اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے، اور انہوں نے ان جنوں کو اور مغرور بنا دیا)۔

خدا اور جنات میں رشتہ ناتا کرتے تھے:

وجعلوا بينه وبين الجنة نسباً [صٰفٰت:۱۴۸] (خدااور جنات میں رشتہ قائم کیا ہے)۔

مشرکین عرب کو سب سے زیادہ دو باتوں کی تسلیم سے سخت انکار تھا، ایک حشر ونشر کے اعتقاد اور دوسرے رسالت ونبوت کے دعوئے سے، چنانچہ رہ رہ کر ان کو تعجب ہوتا تھا کہ ''کیا مر کر بھی کوئی جی سکتا ہے، اور آدمی ہو کر بھی کوئی خدا کا فرستادہ بن سکتا ہے، قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں ان کے تعجب اور اچنبھے پن کو نقل کیا ہے:

مَا هَـٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَراً مِثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذاً لَّخَاسِرُونَ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَاباً وَعِظَاماً أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ [مؤمنون:۳۳۔۳۷] (یہ تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہے، جو تم کھاتے ہو، وہ وہ کھاتا ہے، جو تم پیتے ہو وہ وہ پیتا ہے، اگر اپنی ہی طرح کے ایک آدمی کی تم نے پیروی کی تو تم اس وقت گھاٹے میں رہو گے۔ کیا تم سے یہ شخص کہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈی ہو جاؤ گے تو پھر (قبروں سے) نکالے جاؤ گے، تم سے جو کہا جاتا ہے وہ ناممکن ہے، یہ تو اسی دنیا کی زندگی ہے مرتے ہیں، اور جیتے ہیں اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جانے والے ہیں)۔

اسی سورہ میں آگے بڑھ کر ہے:

قَالُوا أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَاباً وَعِظَاماً أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَـٰذَا مِن قَبْلُ إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ [مؤمنون:۸۲۔۸۳] (وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو پھر اٹھائے جائیں گے، یہ بات تو ہم سے اور ہمارے بزرگوں سے بھی پہلے کہی گئی ہے، یہ صرف اگلوں کی کہانیاں ہیں)۔

یہی آیت تھوڑے تغیر کے ساتھ سورہ صافات اور سورہ واقعہ میں ہے۔ سورۂ مطففین میں ہے: أَلَا يَظُنُّ أُولَئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ [مطففین:۴] (کہ ان کو یہ گمان

نہیں کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے)۔

سورۂ ق میں ہے: بَلْ عَجِبُوا أَن جَاءهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَاباً ذَلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ [ق:۲۔۳]

(بلکہ ان کو تعجب ہے کہ ان ہی میں سے ایک ڈرانے والا بن کر ان کے پاس آیا۔ کافر کہتے ہیں: یہ تو تعجب کی بات ہے، کیا ہم جب مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، یہ واپسی تو مشکل ہے)۔

قرآن مجید میں مشرکین کے ان اعتقادات کی تردید وابطال کی اس قدر آیتیں ہیں کہ ان کا استقصا کرنا گویا قرآن کو ایک صفحہ میں جمع کرنا ہے، تاہم ان سینکڑوں آیتوں میں جو اصولی باتیں مذکور ہوئی ہیں وہ یہی ہیں۔(۱)

دہریت

قرآن مجید کی ان آیتوں سے بعض صاحبوں نے استدلال کیا ہے کہ عرب کچھ دہریہ بھی تھے، "وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ [جاثیہ:۲۴] (اور کہتے ہیں کہ نہیں ہے، لیکن ہماری دنیا کی زندگی، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو نہیں مارتا ہے، لیکن زمانہ)، ''إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ [مؤمنون:۳۷] (یہی ہماری دنیاوی زندگی ہے، اور بس مرتے ہیں اور جیتے ہیں، (یہی سلسلہ ہے) ہم دوبارہ زندہ کئے جانے والے نہیں)۔(۲)

صابی

کہتے ہیں کہ صابی 'عبری' لفظ صبع' کا آرامی تلفظ ہے، صبع عربی لفظ صبغ کے ہم معنی ہے، جس سے عربی میں دوسرا لفظ اصطباغ بنا ہے، اس کے اصلی معنی نہانے اور دھونے کے ہیں، اور اصطلاحاً بتسمہ کے معنی میں بولا جاتا ہے، چونکہ یہ فرقہ مذہباً دن میں کئی دفعہ غسل

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/۱۷۲۔۱۷۷
(۲) تاریخ ارض القرآن ۱۷۷

کرتا ہے، اس لئے ان کا آرامی نام صابی پڑا اور اسی سے عربی میں آیا، لیکن ہمارے سامنے ایک اور لغوی تشریح اس سے زیادہ سہل اور بامعنی موجود ہے، اصل یہ ہے کہ سامی زبانوں میں صبا کا لفظ ستاروں کے مفہوم میں عام طور سے مستعمل ہے، عبرانی میں اس کے معنی جماعت ستارگان کے ہیں۔ (لسان العرب لفظ صبا) عربی میں صبا کے معنی ستارے کے طلوع ہونے اور نکلنے کے ہیں، (مفاتیح العلوم خوارزمی طبع یورپ: ص، ۳۶ و کتاب الفہرست ابن ندیم)

مناویین کے لئے صابئین کا لفظ سب سے پہلے ان کے دشمنوں نے استعمال کیا لیکن آپ تعجب سے سنیں گے کہ خلافت عباسیہ نے جب ان کے وطن عراق میں اپنا سیاسی مرکز قائم کیا تو انھوں نے نہایت فخر کے ساتھ خلیفہ مامون کے عہد میں اس لقب کو اختیار کیا، اور چونکہ یہ یونانی زبان اور فلسفہ سے واقف تھے، اس لئے خلافت کے علمی صیغوں میں انھوں نے بڑے بڑے درجے حاصل کئے اور بعد کو ان میں عربی زبان کے اچھے اچھے ادیب بھی پیدا ہوئے، اور اس کوشش میں کہ وہ حقیقت میں اہل کتاب ہیں، انھوں نے اپنے مذہب کی ایسی تجدید و اصلاح کی کہ وہ اپنے کو اسلام کے قریب تر ثابت کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ بعض علمائے اسلام نے ان کے عقائد و طرز عبادات کو اسلام سے قریب تر بیان کیا، اور اس سے عیسائیوں کو یہ دھوکا ہوا کہ وہ سمجھے کہ اسلام کے بعض رسوم و عبادات ان ہی صابئین سے ماخوذ ہیں (سورس آف القرآن سر ولیم میور)، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے، اور خوشی کی بات ہے کہ اب ان حملہ آوروں کو بھی اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو رہی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ ''صابئین'' دی لٹریری ہسٹری آف پرشیا مصنفہ براؤن ج ۱ ص ۳۸۴)۔

قرآن مجید میں صابئ مذہب کا نام بقرہ، مائدہ اور حج تین سورتوں میں آیا ہے، اس کے علاوہ ان کے مذہب کا کوئی اور ذکر مذکور نہیں، چونکہ ہم کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان کا اصل ابتدائی مذہب بعد کی آمیزشوں سے پہلے، خدا کے اقرار کے ساتھ ساتھ ستاروں، روحوں اور ان کے مجسموں کی پرستش ہے تو بآسانی یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان عقاید کی تردید و ابطال میں قرآن مجید نے جو کچھ کہا ہے اس کا اصلی تخاطب ان ہی سے ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ صابئ قوم کی ہدایت و اصلاح کے لئے سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ مامور ہوئے، توارۃ میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو عراق کے شہر اُر یا حران سے تعلق تھا (تکوین) اور ان کا خاندان غیر خداؤں کو سجدہ کرتا تھا (یوشع ۲۴۔۲) قرآن مجید، حضرت ابراہیمؑ کی زبانی انہی صابئ مجسمہ پرستوں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

أَتَتَّخِذُ أَصْنَاماً آلِهَةً [انعام:۷۵] (کیا بتوں کو خدا ٹھہراتے ہو)۔

مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ [انبیاء:۵۲]

(یہ کیا مورتیں ہیں جن کو تم گھیرے رہتے ہو)۔

أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ [صآفات:۹۵۔۹۶]

(جن کو تم اپنے ہاتھوں سے گڑھتے ہو، ان ہی کو پوجتے ہو، حالانکہ تم کو اور تم جو بناتے ہو سب کو خدا نے پیدا کیا ہے)۔

إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ أَوْثَاناً وَتَخْلُقُونَ إِفْكاً [عنکبوت:۱۷]

(خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہو جھوٹ گھڑ کر)

يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيّاً [مریم:۴۴]

(میرے باپ! شیطان کو نہ پوج، وہ خدا کا نافرمان ہے)۔

ستارہ پرستی کی تردید میں حضرت ابراہیمؑ کا مکالمہ سب سے روشن دلیل ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَباً قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لا أُحِبُّ الآفِلِينَ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغاً قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ حَنِيفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ [انعام:۷۶۔۷۹] (جب اس پر رات نے پردہ ڈالا، ستارہ کو دیکھا، بولا یہ میرا خدا ہے، جب وہ چھپ گیا تو اس نے کہا: میں چھپ جانے والے کو پیار نہیں کرتا، جب چاند کو دیکھا، کہا: یہ میرا خدا ہے، جب وہ بھی

ڈوب گیا بولا: اگر میرا پروردگا ہدایت نہ کرتا تو میں گمراہوں میں ہوتا، جب آفتاب پر نظر پڑی، بول اٹھا: یہی میرا پروردگا ہے، یہ سب سے بڑا ہے، جب وہ بھی ڈوب گیا کہا اے بھائیو! میں اس سے برأت کرتا ہوں جس کو تم خدا کا شریک کہتے ہو، میں اپنا منھ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں مشرکوں میں سے نہیں)۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے کہ صابئ خدا کے منکر نہیں تھے، بلکہ خدائی میں اوروں کو بھی شریک ٹھہراتے تھے، بابلی مذہب کی تفصیل کرتے وقت ہم نے بتایا ہے کہ یہ آیت: فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ [صآفات:۸۸] (ایک نظر بھر کر ستاروں کو دیکھا)۔

بھی اسی ستارہ پرستی کی طرف اشارہ ہے۔

عدنانی عربوں کی مذہبی حالت جہاں بیان ہوئی ہے بتایا گیا ہے کہ نزول قرآن کے وقت کس قبیلہ میں کون سا ستارہ پوجا جاتا تھا، عربوں نے دنیا کے تمام طبعی کاروبار کو انہی ستاروں کے طلوع وغروب کی طرف منسوب کر رکھا تھا (کتاب الازمنہ والامکنہ امام مرزوقی، طبع حیدرآباد ج ا ص ۱۷۸)۔

ان کا خیال تھا کہ منازل قمر کے ۲۸ ستاروں میں سے ایک جب غروب ہوتا ہے تو دوسرا اس کے مقابل طلوع ہوتا ہے، وہ جب تک ڈوب نہ جائے اس کا عمل قائم رہتا ہے (فتح الباری ج ا ص ۲۳۴ بحوالہ: کتاب الانوار ابن قتیبہ)، اس کو اپنی اصطلاح میں نوء (نکھتر) کہتے تھے، انواء اسی کی جمع ہے صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ارشاد الٰہی ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ''فلاں نوء کے سبب سے ہم پانی برسائے گئے، وہ میرا منکر ہے اور ستارہ پر اس کا ایمان ہے (صحیح بخاری صلوۃ الاستسقاء)، صحیح مسلم کی روایت ہے کہ یہ آیت اسی عقیدہ کی تردید میں ہے: فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ [واقعہ:۷۵] (ستاروں کے جائے غروب کی قسم)۔

محقق مفسروں نے لکھا ہے کہ ان چیزوں کی خدا نے جو قسم کھائی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کی ہستی، قدرت، اور کمال صنعت اور اپنی محکومی، بندگی، اور غلامی کی خود گواہ اور شاہد

ہیں، اس بنا پر ذیل کی آیت پاک سے اسی ستارہ پرستی کے بطلان کی طرف اشارہ سمجھئے:

وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا [شمس:۱-۲] قسم ہے آفتاب اور اس کے دن چڑھنے کی اور چاند کی جب اس کے پیچھے چلے۔

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ [طارق:۱-۳] (قسم ہے آسمان کی اور رات کے مہمان کی اور رات کا مہمان کیا ہے، چمکنے والا ستارہ)۔

اہل تفسیر کہتے ہیں کہ چمکنے والے ستارہ سے مراد زحل ہے: وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى [نجم:۱] (قسم ہے اس ستارے کی جب وہ گرے.....)

النجم عرب میں خاص ثریا کو کہتے ہیں، اس کے گرنے سے مراد افق رویت کے نیچے چلا جانا ہے اور یہ اہل عرب کے نزدیک آغاز موسم کی علامت ہے:

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ [انشقاق:۱۸] (قسم ہے چاند کی جب وہ کامل ہو جائے)۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ [تکویر:۱۵-۱۶] (قسم ہے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپنے والے ستاروں کی)۔

اکثر ارباب تفسیر متفق ہیں کہ اس سے مراد سبع سیارہ ہیں۔

عام ستارہ پرستوں اور صابیوں میں فرق یہ ہے کہ وہ ان ستاروں کو درحقیقت خدا سمجھتے ہیں، اور صابئ خدا کے اقرار کے ساتھ ان ستاروں کو خدا کا مظہر سمجھ کر ان کی عبادت وتعظیم کرتے ہیں، اسی لئے قرآن نے صابیوں پر خدا کے اقرار کے ساتھ ستارہ پرستی کا الزام قائم کیا ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ [حج:۱۸] (کیا نہیں دیکھتے کہ ''خدا'' ہی کو سجدہ کرتا ہے آسمان اور زمین میں جو بھی ہے اور سورج اور چاند اور کل ستارے)

ومن ایتہ الیل والنہار والشمس والقمر لاتسجدوا للشمس

ولاللقمر واسجدوا للّٰہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون [حم سجدہ:۳۷]

(رات، دن، سورج اور چاند سب خدا کی نشانیوں میں سے ہیں، سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس خدا کو کرو، جس نے ان کو پیدا کیا، اگر تم درحقیقت خدا ہی کو پوجتے ہو)۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰہَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ذَلِكَ بِأَنَّ اللّٰہَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰہَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ [لقمان:۲۹-۳۰]

(اور چاند اور سورج کو اس نے مسخر کیا، ہر ایک اپنی مقررہ حد تک چل رہا ہے اور خدا تمہارے کاموں سے باخبر ہے، یہ اس لئے کہ "حق" وہی ہے اور اس کے سوا جس کو پکارتے ہو وہ باطل ہے۔ تم چاند اور سورج کو اس لئے پوجتے ہو کہ وہ بلند اور بڑے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہی اللہ بلند اور بڑا ہے)۔

بلندی اور بڑائی کے علاوہ سورج اور چاند کی عظمت کی تیسری دلیل "روشنی" ہے، اس لئے سورۂ یونس میں فرمایا ہے: هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاء وَالْقَمَرَ نُوراً [یونس:۵] (اسی نے آفتاب کو روشن اور چاند کو منور کیا)

سورۂ نوح میں ارشاد ہوا: وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً [نوح:۱۶] (اس نے آفتاب کو (خانۂ کائنات کا چراغ بنایا)۔

آفتاب و ماہتاب کے مسخر الٰہی ہونے کی آیتیں قرآن میں بکثرت ہیں، سورہ رعد، ملائکہ، زمر، عنکبوت، اور ابراہیم میں بالخصوص ہیں، اس بار بار کی تکرار سے ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب و ماہتاب پرستی کا رواج عرب میں کسی قدر زیادہ تھا، صابئین میں ارواح و ملائکہ پرستی کا رواج تھا، اسی لئے قرآن نے کہا: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعاً ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَؤُلَاء إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ [سبا:۴۰-۴۱] (جس دن ان کو قبروں سے

اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا تم ہی کو یہ پوجتے تھے، کہیں گے تو شرکت سے پاک اور ہمارا آقا ہے، بلکہ یہ جنوں کو پوجتے تھے اور اکثر لوگ ان ہی پر ایمان رکھتے تھے)۔(۱)

اللات

حضرت ابن عباسؓ اور بعض دیگر راویوں سے مروی ہے کہ لات "لت" سے مشتق ہے، جس کے معنی گھولنے کے ہیں (اردو میں اسی سے لتنا یا لت کرنا بنا ہے) عرب میں ایک شخص تھا جو زمانۂ حج میں ایک چٹان پر بیٹھ کر ستو گھول گھول کر حاجیوں کو پلایا کرتا تھا، اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے اسی چٹان کو پوجنا شروع کر دیا اور اس کا نام لات یعنی گھولنے والا رکھا۔ (صحیح بخاری تفسیر سورۂ نجم مع فتح الباری)

لیکن اس بیان سے علاوہ اس کے کہ یہ ایک غیر معقول توجیہ ہے، یہ لازم آتا ہے کہ لات (بالتخفیف) کے بجائے لات (تشدید کے ساتھ) ہو، اور یہ قرأت متواتر کے خلاف ہے، یاقوت نے معجم میں اس کو لیت سے مشتق کیا ہے، جس کے معنی پھیرنے کے ہیں، لات یعنی مصیبتوں کا پھیرنے والا، لیکن اس اصول پر اس کو لائت ہونا چاہئے، اور ان دونوں نظریوں پر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ اس حالت میں تائے اصلی ہو اور تائے تانیث نہ ہو، حالانکہ یہ مؤنث ہے۔

مستشرقین یورپ نے بکمال لیاقت ہم کو یہ بتانا چاہا ہے کہ اللہ اور اللات ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں، اللہ مذکر دیوتا کے لئے قریش میں مستعمل ہوتا تھا اور اللات یعنی دیبی اس لفظ اللہ کی قریش نے تانیث بنائی تھی۔ (یہ جارج سیل مترجم قرآن ولہوسن مترجم واقدی اور مارگولیتھ مصنف محمد ﷺ کی تحقیق ہے، دیکھو سیل کا مقدمہ اور مارگولیتھ محمد ﷺ: ص، ۱۵)۔ ان عقلمندوں سے پوچھنا چاہئے کہ اللہ کی تانیث عربی قواعد کے موافق اللات کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس کی تانیث اگر ممکن ہے تو اللہۃ چاہئے یا الآلہۃ، اللہ کی ہائے اصلی کیونکر تانیث سے ساقط ہو گئی، اگر ہمارا مشورہ مستحق قبول ہو تو اس لفظ کے زمانہ پیدائش کے

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/۱۶۲-۱۶۶

لئے عربی کی خشک سرزمین کے بجائے ملک شام کا سرسبز علاقہ مناسب ہوگا، کیوں کہ عرب کے اکثر دیوتا ملک شام ہی کے باشندے تھے۔(ابن ہشام، اصنام العرب، بخاری شریف فتح مکہ ومناقب قریش)

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہیروڈوٹس مؤرخ نے مسیح سے چار سو برس پہلے عرب کے ایک دیوتا کا نام الیلات بتایا ہے، حالانکہ اس وقت قریش کا وجود بھی نہیں تھا، اس لئے ان کی زبان کا لفظ بھی اس وقت موجود نہیں ہوسکتا۔

قدیم سامی زبانوں میں خدائی کے لئے ال یا ایل کا لفظ عام طور سے موجود تھا، تائے تانیث لگنے سے ایلوت ہوگیا، جس کے معنی دیبی ہوں گے، عربوں نے جب اس لفظ کو اختیار کیا تو اپنا الف لام تعریفی اس پر اضافہ کیا، اور پہلے الف کو اپنے قاعدہ کے مطابق جیسا کہ اللہ میں ہوا ہے گرا کر اللوات بنالیا اور اس سے اللات ہوگیا، کیا اس ''فیلالوجی'' کو ہمارے یورپین محققین پسند کرتے ہیں؟ لات کا نام نبطی کتبات میں ایلات کی صورت میں ملا ہے، لات گول سفید پتھر اور اس پر ایک عمارت بنی ہوئی تھی۔(۱)

العزّی

اسکے متعلق تو ظاہر ہے کہ یہ ''عزّ'' سے مشتق ہے، جس کے معنی غلبہ کے ہیں، عزّ کا اسم تفضیل مؤنث عزی ہے، یعنی بہت غالب آنے والی دیبی، عجب نہیں کہ یہ قریش اور ان کے ہم نسب قبائل کی لڑائی کی دیبی ہو، اور غالباً یہی سبب ہے کہ جنگ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی اور وہ کوہِ احد پر چڑھ گئے تو ابوسفیان نے دامنِ کوہ میں کھڑے ہوکر مسلمانوں کو خطاب کر کے عزی کی جے پکاری تھی کہ "لنا العزّی ولاعُزّی لکم" (ہماری طرف ''عزی'' ہے، تمہاری طرف کوئی عزی نہیں)، آنحضرت ﷺ کی تعلیم سے حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا: اللّٰہ مولانا ولامولی لکم، (اللہ ہمارا آقا ہے، تمہارا کوئی آقا نہیں)۔(صحیح بخاری غزوۂ احد) عُزّی ایک درخت تھا، اس کے نیچے ایک

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۷۹/۲، ۱۸۰

بت تھا، چاروں طرف چہار دیواری تھی۔(۱)

مناۃ

اس لفظ کا اشتقاق چند مآخذوں سے ہوسکتا ہے، سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ منی سے مشتق ہے، جس کے معنی بہانے کے ہیں، اسی سے مکہ کے مقام منی کا نام ماخوذ ہے، یعنی خون بہانے کی جگہ، مناۃ شاید قربانی کا دیوتا تھا، جس کے نام سے خون بہایا جاتا ہوگا، لیکن بجز قیاس کے اس اشتقاق کی صحت کی کوئی اور دلیل نہیں، یاقوت نے اس کے مختلف اشتقاقات بتائے ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سے سب سے صحیح یہ ہے کہ وہ مناسے مشتق ہے، اس کے معنی تقدیر کے ہیں، اور اسکے معنی ثانی موت کے ہیں، صاحب لسان العرب نے بتایا ہے کہ اس میں (ۃ) فقط علامت تانیث کے لئے ہے، گویا ''مناۃ'' تقدیر اور موت کی دیبی تھی، نبطی کتبات میں یہی منات منوت کی صورت میں ہے، قرآن مجید میں بھی اس کا املا منٰوۃ ہے، مناۃ پتھر کی ایک چٹان تھی۔(۲)

ود

یہ وَدٌّ سے ہے، جس کے معنی محبت کے ہیں، اور اس کے مقابل دوسری دیبی نکرہ تھی، جس کے ناپسندیدگی اور عداوت کے معنی ہیں، یہ بت بھی کتبات میں مذکور ہے، ایک خیال یہ بھی ہے کہ ود کی اصل ''اد'' ہے، بابلی میں آفتاب کو کہتے ہیں، ود، دراز قد مرد کی مورت، ایک تہمد کمر میں لپیٹے، ایک چادر اوڑھے، گلے میں تلوار حمائل، کمان لٹکی ہوئی، ایک طرف ترکش پڑا ہوا، سامنے نیزہ اس میں جھنڈا بندھا ہوا۔(۳)

سواع

اس لفظ کا مشتق منہ کلام عرب میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ سوع سے مشتق ہو، جس

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۸۱/۲
(۲) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۸۱/۲
(۳) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۸۲/۲

کے معنی زمانہ کے ہیں، سواع کی شکل عورت کی تھی، آسمان میں مرۃ سلسلہ ذات الکرسی وغیرہ عورت کی شکلیں ہیں۔(۱)

یعوق

یعوق عوق سے (روکنا) مضارع کا صیغہ ہے، اہل یمن میں یہ بت پوجا جاتا تھا، ان کے ہاں صیغہ مضارع کو بطور علم استعمال کرنے کا خاص دستور تھا، چنانچہ یعرب، یشجب، یکرب، یعفر، یھرعش، یوھیمن وغیرہ اصلی نام کے ساتھ صفت کے طور پر مستعمل ہوئے ہیں، یعوق کے معنی روکنا ہے، یعنی مصیبتوں کو روکتا ہے، یعوق (مصیبتوں کو روکنے والا) کی صورت گھوڑے کی تھی۔(۲)

یغوث

یغوث بھی یعوق کے قاعدہ سے علم ہے، غوث (فریاد کو پہونچانا) اس کا مصدر ہے، یغوث کے معنی فریاد رسی کرنا ہے، یغوث دیوتا کا نام کتبہ میں بھی ملتا ہے، یغوث (فریادرس) کی شکل شیر کی تھی۔(۳)

نسر

نسر کے لغوی معنی گدھ کے ہیں، اسی شکل کا ایک مجموعہ کواکب آسمان میں ہے جس کو نسر کہتے ہیں، نسر دیوتا کی حیثیت سے سامی قوموں میں بہت مدت سے پوجا جاتا تھا، اہل بابل کے دیوتاؤں میں ایک نسروک تھا، اب بابل میں اس دیوتا کا مجسمہ بھی نکلا ہے، نسر ایک پرندہ کی شکل پر تھا۔(۴)

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۸۲/۲
(۲) تاریخ ارض القرآن ج۲ ۱۸۲/۲
(۳) ایضا: ج۲، ۱۸۲/۲
(۴) ایضا: ج۲، ۱۸۲/۲

بعل

یہ دیوتا شام کا معبد تھا، قرآن نے بھی اسی ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے، بعل کے لغوی معنی قوت کے ہیں، اسی سے مجازاً آقا کے معنی اور اس کے بعد شوہر کے معنی میں یہ لفظ مستعمل ہوا، چنانچہ دوسرے معنی میں یہ لفظ قرآن میں بکثرت آیا ہے، عرب کا مشہور دیوتا ہبل قریش کا خدائے اعظم تھا، اسی بعل کی تحریف ہے، عبرانی ''ہ'' میں کلمۂ تعریف ہے، بعل کو ہبعل کہتے تھے، عمرو بن لحی شام کے دیوتاؤں کو جب عرب لے کر چلا تو مکہ پہنچتے پہنچتے ہبعل کی صورت ہبل سے بدل گئی.....ایک غیر مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت گزشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے، جن کو اہل عرب نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا تھا، ممکن ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہوں، لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں، ہبل قریش کا معبود اعظم تھا، اس کی انسان کی مورت تھی، عقیق سرخ سے بنایا گیا تھا، اس کا داہنا ہاتھ ٹوٹا تھا، قریش کو اسی حالت میں ملا تھا، انہوں نے سونے کا ہاتھ بنوا کر لگایا تھا، یہودیوں کے بعل کی شکل بھی یہی تھی، فرق یہ ہے کہ یہ تمام تر سونے کا تھا، ہبل خاص خانہ کعبہ میں نصب تھا، فال کے پانسے اس کے آگے ڈالے جاتے تھے۔(۱)

بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام

بحیرہ: اس بچہ کو کہتے ہیں جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کر دیتے ہیں۔

سائبہ: اس جانور کو کہتے ہیں جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

وصیلہ: بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس ہی رکھیں گے، پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا۔

حام: وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چلتے تو

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج۲، ۱۸۲/۲، ۱۸۳۔

دیوتا کے نام پر آزاد کردیا جاتا تھا۔ بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا ہے، سورۂ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی، اور سورۂ مائدہ میں فرمایا: "ماجعل اللّٰہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام" [مائدہ:۱۰۳] خدا نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔(۱)

لسان عربی مبین

قرآن مجید میں ہے: إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً [یوسف:۲] (ہم نے اتارا اس کو عربی زبان میں)۔ أَنزَلْنَاهُ حُكْماً عَرَبِيّا [رعد:۳۷] (ہم نے اتارا اس کو عربی حکم)۔

أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً [طہٰ:۱۱۳] (ہم نے اتارا اس کو عربی قرآن)۔

قُرْآناً عَرَبِيّاً غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ [زمر:۲۸] (عربی قرآن، ٹیڑھا نہیں)۔

كتاب فصلت آياته قرآناً عربيّا [رعد:۳۷] (کتاب جس کی آیتیں مفصل ہیں، عربی قرآن)۔

أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآناً عَرَبِيّا [شوریٰ:۷] (عربی قرآن کو تیری طرف وحی کیا)۔ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّا [زخرف:۳] (ہم نے اتارا اس کو عربی قرآن)۔

وَهَـٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَاناً عَرَبِيّا [احقاف:۱۲] (یہ کتاب ہے جو تصدیق کرتی ہے، عربی زبان میں)۔

دو موقع پر لسان عربی مبین کہا گیا ہے:

وَهَـٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ [نحل:۱۰۳] (یہ عربی مبین زبان ہے)۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ [شعراء:۱۹۵] (یہ عربی مبین زبان میں ہے)۔

"مبینٌ" کے لغوی معنی ہیں: ظاہر کرنے والا، واضح کرنے والا، کھولنے والا، اکثر مفسرین نے ان آیتوں میں "مبین" کے یہی لغوی معنی مراد لئے ہیں، یعنی قرآن ایسی زبان میں اتارا گیا جو نہایت فصیح ہے، مطالب کھل جاتے ہیں، معانی واضح ہوجاتے ہیں،

(۱) سیرۃ النبی: ج۴/۲۲۸

سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی، ارض القرآن جلد اول کے اثنائے تحریر میں خیال آیا کہ مبین سے یہاں مراد اس کے لغوی معنی نہیں، بلکہ یہ لفظ بطور علم کے ہے، ظہور اسلام کے وقت بھی عربی مختلف بولیوں اور لہجوں میں منقسم تھی، ان میں فصیح ترین اور شیریں ترین زبان تھی، اس کا نام "لسان عربی مبین" تھا، مثلاً اردو زبان کا اطلاق لاہور، دلی، لکھنؤ، بنارس، پٹنہ، کلکتہ، ڈھاکہ، حیدرآباد، بمبئی اور مدراس کی تمام اردو زبانوں پر ہوتا ہے، حالانکہ مختلف اسباب سے ان زبانوں میں ذخیرۂ الفاظ، لب ولہجہ، تذکیر وتانیث اور بیسوں قواعد کا اختلاف ہے، تاہم ان سب پر اردو ہی زبان کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن ان میں سے بہترین اور فصیح ترین زبان کو ہم "اردوئے معلیٰ" کہتے ہیں جو قلعہ دہلی میں بولی جاتی تھی یا جو اب ہمارے قلم اور شاعری کی زبان ہے، اسی طریقہ سے باوجود اختلافات کے عربی زبان میں ایک خاص مستند اور ٹکسالی زبان تھی جس میں مختلف قبائل کے شعراء اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتے اور باہم قبائل ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے اور یہی لسان مبین تھی۔

یہ خیال ایک نظریہ کے طور پر میرے ذہن میں آیا تھا، لیکن اثنائے مطالعہ میں ایسے شواہد بہم پہنچے ہیں، جن سے معلوم ہوا کہ بعض اور علمائے کبار بھی یہی سمجھتے تھے۔

روى الحاكم فى المستدرك وصححه والبيهقى فى شعب الإيمان عن بريدة رضى الله تعالى عنه فى قوله تعالى " بلسان عربى مبين" قال: بلسان جرهم [مزہر:۱۸] (محدث حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور بیہقی نے "شعب الایمان" میں بیان کیا ہے کہ حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ لسان عربی مبین سے مراد لسان جرہم ہے)۔

جرہم قریش کے ننہالی مورث اول کا نام ہے جس کے خاندان میں حضرت اسماعیلؑ نے شادی کی تھی، یہ روایت اگر صحیح نہ ہو تو بھی اپنے زمانہ کے رواۃ کے خیال کی مترجم ہے، یاقوت نے معجم میں (تحت لفظ عرب) ہشام کلبی کی روایت سے لکھا ہے:

والـلسان السادس ممن أنطقه الله فى عربة بلسان لم يكن قبلهم

إسماعيل بن إبراهيم نطقوا بالمبين، وهوالسادس ممن تكلم بالعربية هو وبنوه ولسانهم المبين و كتابهم المبين وهو الغالب على العرب اليوم. (چھٹی زبان جو عربوں میں اللہ تعالی نے بلوائی اور جوان سے پہلے نہ تھی وہ اسماعیل کو بلوائی، بنو اسماعیل مبین زبان بولے اور یہ چھٹے بزرگ ہیں جو (اس چھٹی) عربی میں بولے، ان کی زبان اور تحریر مبین ہے، اور یہی زبان آج تمام عربوں کی زبان پر غالب ہے''۔ پھر کہتا ہے: المبين لمعد بن عدنان، مبین معد بن عدنان کی زبان ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد میں جب قرآن کی نقلیں کرائیں تو کاتبوں کو حکم دیا کہ جس لغت کے تلفظ اور قرأت میں تمہارے درمیان اختلاف ہو اس کو قریش کے لغت میں لکھو، نزل بلغة قريش کہ قرآن قریش کی زبان میں اترا ہے۔

قریش کی زبان کی خوبی اور فصاحت کے دو سبب ائمہ لغت نے بیان کئے ہیں، جو بالکل صحیح ہیں، عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو قوم دوسری قوموں سے الگ تھلگ رہتی ہے، اور ملتی جلتی نہیں، اس کی زبان خالص اور بے میل رہتی ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ گو تمام عرب میں مقامی بت خانے تھے، جہاں مراسم حج ادا ہوتے تھے، مقامی میلے بھی لگتے تھے، لیکن تمام ملک کا سالانہ مجمع صرف مکہ ہی کی سرزمین میں اکٹھا ہوتا تھا، ملک کے ہر گوشہ سے لوگ یہاں یکجا ہوتے تھے، عکاظ کا میلہ عرب کی اکیڈمی تھی، اس بنا پر شہر مکہ کی زبان ایک ایسی زبان ہوگی جو عرب کی تمام زبانوں کا خلاصہ اور عطر ہوگی۔(۱)

ھد ھد:

ہمارے تمام مفسرین نے ھد ھد سے یہی معروف مرغ مراد لیا ہے، لیکن اس زمانہ کے بعض ''فطرت پرست'' کہتے ہیں کہ مرغ کا بولنا اور اس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلاف عقل ہے، اس لئے ہدہد کسی انسان کا نام ہوگا، اور اُس زمانہ میں عموماً یہ نام رکھا جاتا تھا، ہم کو اس دعویٰ کی صداقت سے انکار نہیں کہ ہدہد آدمی کے نام ہوتے تھے، خود حضرت سلیمان کے

(۱) تاریخ ارض القرآن ج ۲/۱۱۵۔۱۱۸

عہد میں مدین کے شہزادہ کا نام ہدہد تھا، اور روایات عرب میں ملکہ کے باپ یا بھائی کا نام بھی ہدہد مذکور ہے، لیکن قرآن مجید کے لفظ: تفقد الطير ''(پرندوں کا جائزہ لیا) کا کیا جواب ہوگا؟ میری رائے میں اب جب کہ جانوروں کی عقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے، بندروں کی بولیوں کی ابجد تیار کی جارہی ہے، تو ہدہد کے بولنے پر تعجب کیوں ہو؟

''طیر'' کے معنی فوج کے لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے، اسی طرح بے ثبوت ہے، جس طرح سرسید کا سورۂ فیل کی تفسیر میں ''طیر'' سے فال بد لینا، اور اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کرلو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا، اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس ہونا سمجھ لو، جیسا کہ خود اسی موقع پر قرآن مجید میں ہے، حضرت سلیمان نے خط دے کر اس کو ملکہ سبا کے پاس بھیجا، اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا۔(۱)

(۱) تاریخ ارض القرآن: ج ۱/ ۲۱۸۔

باب چہارم

تفسیری نکات

باب چہارم

تفسیری نکات

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تصنیفات کا بنیادی مأخذ قرآن وحدیث ہیں، انہیں دونوں سرچشموں سے انہوں نے خوب کسب فیض کیا، اوران کی ہدایات کو مشعل راہ بنایا، قرآن میں تدبر وتفکر کی قرآن نے خود ترغیب دی ہے، اور جو حضرات مثبت انداز میں اس میں تدبر نہیں کرتے، ان کے بارے میں کہا: أفلا یتدبرون القرآن، أم علی قلوب أقفالها (یہ قرآن میں کیوں غور نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں)، تدبر قرآن حدیث اور آثار صحابہ اور لغت عرب کی روشنی میں محمود ہے، بصورت دیگر اس کے بارے میں بہت سخت وعید سنائی گئی ہے: من قال فی القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار (جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی تو اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنانا چاہئے)۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تفسیر قرآن کے شرائط کی روشنی میں قرآن میں غوطہ زنی کی تو اللہ تعالی نے ان کو ایک طرف جدت کردار عطا کیا تو دوسری طرف بیش قیمت نکات اور معانی ان کے لوح قلب پر منکشف فرمائے۔ سطور ذیل میں ان کی تصنیفات میں بکھرے نکات، خاص طور سے نکات سورۂ فاتحہ کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

نکات سورہ فاتحہ

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم

پناہ لیتا ہوں اللہ کی شیطان مردود سے

نکتہ: تعوذ درحقیقت اعلیٰ توکل ہے:

''کیونکہ حاصل ''تعوذ'' کا یہ ہے کہ اے اللہ! مجھ میں تو اتنی طاقت نہیں کہ اپنے کس ہاتھ سے شیطان کا مقابلہ کروں اور اس پر غالب رہ سکوں، اس لئے میں اپنی قوت کی نفی کر کے بس آپ کی ذات عزیز کا سہارا لیتا ہوں اب آپ ہی کی مدد میری قوت بازو ہے اور آپ ہی کی حفاظت کا یقین میری ڈھال، تعوذ کا یہ مفہوم عین مطابق قرآن ہے، سورۂ نحل میں حق تعالیٰ نے ''مومن متوکل'' ہی کو مکر شیطانی سے محفوظ قرار دیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ، إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ [نحل:۹۸۔۹۹] (پس جب تو قرآن پڑھنے لگے تو پناہ مانگ اللہ کی شیطان مردود سے، اس کا زور نہیں چلتا ان پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں)

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے، رحیم ہے۔

نکات: ۱- یہاں رحمٰن اور رحیم بدل معنی کے طور پر ہے۔
۲- اس میں عیسائیوں کے اعتراض کا بھی جواب ہو گیا جو مسلمانوں کے خدا کو محض جبار و قہار بتاتے ہیں۔

یعنی اللہ، رحمٰن، رحیم، ایک ہی مسمیٰ کے یہ سب نام ہیں، یہ معانی قرآن سے پوری طرح مؤید ہیں، سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ربانی ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَـٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ [بنی اسرائیل:۱۱۰] (آپ) کہہ دیجئے خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گے سو اس کے بہت اچھے اچھے نام ہیں)۔

اور یہ ارشاد کافروں کے اس سوال کے جواب میں ہے کہ وما الرحمن [فرقان:۶۰] (اور رحمٰن کیا ہے؟)

نوٹ:۔ عام طور پر مفسرین نے اللہ کو اسم ذات اور رحمٰن و رحیم کو اسمائے صفات قرار دے کر ان میں صفت و موصوف کا علاقہ بتایا ہے اور یہ بھی درست ہے، مگر جو معنی اوپر بیان کئے گئے وہ زیادہ بلیغ ہیں۔

- کیونکہ اسم اللہ کے بعد ہی قرآن پاک میں جو اسمائے ربانی لائے گئے ہیں وہ رحمٰن و رحیم ہیں اور ان دو میں سے بھی رحمٰن پہلے ہے جس کا اطلاق اسم اللہ کی طرح کسی اور پر ہوتا ہی نہیں اور اسی وجہ سے رحمٰن کو بھی اسم ذات ہی مانا گیا ہے، تو اب مفہوم صاف یہ نکل آیا کہ مسلمانوں کا خدا رحمتِ تمام ہے!

الحمدُ للّٰہ

حقیقت حمد اللہ ہی کے لئے ہے۔

نکتہ: الحمد میں ال تحقیق حقیقت کے لئے ہے یعنی حقیقت حمد اللہ کے لئے بہر حال ثابت ہے خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔

۱- عام طور پر مفسرین نے ال کو کلمہ استغراق بتایا ہے جس کی رو سے الحمد کے معنی ہوتے ہیں ساری تعریف خواہ کسی قسم کی بھی ہو، کوئی سی بھی ہو اور بظاہر کسی کے لئے بھی ہو، یہ معنی بھی درست ہیں لیکن ''ال'' کو تحقیق حقیقت کے لئے ماننے سے لفظ الحمد کے معنی میں اور بھی بلندی اور خوبی پیدا ہوگئی کہ غیر اللہ سے حمد کی نفی بھی ہوگئی اور ذات باری تعالیٰ کا کسی غیر کی حمد سے بے نیاز ہونا بھی ثابت ہوگیا جو ایک حقیقت کبریٰ ہے! قرآن پاک نے اس حقیقت کو بار بار بے نقاب کیا ہے:

فإن اللّٰہ ھو غنیُ حمید [لقمان:۱۲] (یہ تحقیق کہ اللہ تو بے نیاز اور خود تمام خوبیوں والا ہے) إنّ اللّٰہ ھو الغنیُ الحمید [حج:۶۴] (تحقیق کہ اللہ ہی تو بے نیاز اور خود تمام خوبیوں والا ہے) إن تکفروا فإن اللّٰہ غنیٌ عنکم [زمر:۷] اگر تم کفر کرو تو اللہ کو تو تمہاری کچھ بھی حاجت نہیں۔

زعشق ما تمام ما جمال یا رمستغنی ست
بہ آب و رنگ نہ خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا
(حافظ)

اسی ''حقیقت حمد'' سے انسانوں کی بے خبری کا ذکر بھی قرآن پاک میں کئی جگہ موجود ہے۔

اَلحَمدُ للّٰہِ، بل أکثرھم لا یعلمون [نحل:۲۵] (حقیقت حمد تو اللہ ہی کے لئے مگر بہت لوگ اس کو جانتے نہیں۔

رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الرَّحْمـنِ الرَّحِیْم مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْن
[فاتحہ:۲۔۳۔۴]
(جو مربی ہے ہر ہر عالم کا، رحمٰن و رحیم ہے، مالک ہے روزِ جزا کا)

نکات:

۱- ربط کلام: صفتِ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ یوم دین قائم ہو۔

۲- ان آیات میں قیامت کا عقلی ثبوت بھی آ گیا کہ اگر یوم جزا قائم نہ ہو تو نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی رحمانیت و رحیمیت پر حرف آئیگا اس لئے عقلاً بھی قیامت کا وقوع ضروری ہے۔

تا کہ برائی بھلائی نتیجہ خیز بن سکے ورنہ دنیا تو دار الجزا نہیں اور اگر مر کر بھی کافر و مومن کا انجام محض فنا ہی ٹھرا تو پھر دونوں میں امتیاز کیا باقی رہا؟ حق تعالیٰ کے نظام ربوبیت و عدل میں اس بے انصافی کا تصور بھی گناہ عظیم ہے، قیامت ہی کے تذکرے میں ذرا اس قرآنی للکار کو سنئے:

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْن مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ [قلم:۳۵۔۳۶] (تو کیا ہم مسلمانوں اور مجرموں (کافروں) کو یکساں کر دینگے؟ (ارے) تم کو کیا ہو گیا کیسا حکم لگاتے ہو!)

أَفَمَن كَانَ مُؤْمِناً كَمَن كَانَ فَاسِقاً لَّا یَسْتَوُوْنَ [سجدہ:۳۶] (تو کیا جو شخص مومن ہو گیا، اس شخص جیسا ہو جائے گا جو نافرمان ہے؟ وہ آپس میں برابر نہیں ہو سکتے!)

أَلَیْسَ اللّٰہُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِیْنَ [تین:۸] کیا اللہ (تبارک وتعالیٰ) سب حاکموں سے بہتر حاکم نہیں؟

نوٹ: مفسرین نے رب العالمین اور مالک یوم الدین میں کئی ربط نکالے ہیں مگر جو ربط حضرت علامہؒ نے بیان فرمایا وہ سب سے بہتر حقیقی ہے اور ففھمناھا سلیمان، والی حقیقت اس سے صاف جھلک رہی ہے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ[فاتحہ:۵]

(ہم تیری ہی عبادت کرتے اور ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں)

نکتہ: یہ آیت پاک ایک ہی جملہ ہے ''ایاک نعبد'' میں دعوے کی صورت تھی ''ایاک نستعین'' بڑھا دینے سے اس کی نفی ہو گئی کہ ہم عبادت تو کرتے ہیں مگر یہ عبادت بھی محض تیری ہی مدد (توفیق) کی بنا پر ہے ورنہ اپنے کئے سے کیا ہو سکتا تھا!

عام طور پر مفسرین اس آیت پاک کو ایک نہیں بلکہ دو جملہ الگ الگ قرار دیتے ہیں عبادت گذاری اور استمداد جن کے دو جدا جدا عنوان ہیں مگر جو بات اوپر بیان کی گئی ہے اس سے معنی میں کس قدر لطافت ونزاکت پیدا ہو گئی ہے اور کمال عبدیت کا اس میں کس درجہ اظہار ہے کہ اور تو اور ایک سجدۂ نیاز مندی میں بھی تو بندہ محض توفیق الٰہی کا ہی محتاج ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی اسی حقیقت کا اعتراف قرآن پاک میں ملاحظہ ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰه [ھود:۸۸] مجھ کو جو کچھ توفیق (عمل) مل جاتی ہے وہ محض اللہ کی طرف سے ہے!

اور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حکم ہے کہ اس بات کو قاعدۂ کلیہ کے طور پر سنا دیں:

قُلْ إِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰه [آل عمران:۷۳] (آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو (بس) اللہ ہی کی ہدایت ہے)

اهدِنَـــا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ[فاتحہ:۶]

(چلا ہم کو سیدھا راستہ)

نکات: ۱- ہدایت کے معنی راستہ دکھانے کے بھی آتے ہیں اور راستہ چلانے کے بھی۔ تو اب جب حق تعالیٰ سے مانگنا ٹھہرا تو بڑی ہی چیز کیوں نہ مانگی جائے کہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا دیجئے۔

صراط مستقیم سے مراد انبیاء کرام کا راستہ ہے خصوصا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا۔ اور اسی معنی میں لفظ ''ہادی'' سارے انبیاء کے لئے آیا ہے: ولكل قوم هاد [رعد:۷] ہر قوم کے لیے راہ نما ہوتے چلے آئے ہیں، اس معنی میں ہدایت مخصوص ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے چنانچہ سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے:

إِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَن يَشَاءُ[قصص:۵۶]

(اے محمد آپ جس کو چاہیں راہ پر چلا نہیں سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے راہ پر چلا دیتا ہے۔

جس کا مقصود یہ ہے کہ منزل مقصود تک پہنچا دیجئے، حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے بھی یہاں اھدنا کا ترجمہ ''چلا ہم کو'' ہی کیا ہے!

اس کا ذکر قرآن پاک میں مختلف مقامات پر آیا ہے مگر سورۂ انعام میں تو کلی طور پر یہ بات بتا دی گئی ہے کہ سارے انبیاء کرام ایک ہی راہ کے رہرو رہے ہیں اور وہ صراط مستقیم ہے، حضرت ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، یسع، یونس اور لوط علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اسمائے گرامی گنوا کر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْم [انعام:۸۷] (نیز ان کے کچھ باپ دادوں کو، کچھ اولاد کو اور کچھ بھائیوں کو (ہدایت

دی) اور ہم نے ان سب کو مقبول بنایا اور ہم نے ان کو سیدھے راستہ پر چلایا، اس مقام پر حضرت علامہ مسکراتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ اللہ میاں ملتے بھی تو صراط مستقیم ہی پر ہیں، دوسرے راستوں پر ڈھونڈنے سے وہ کہاں ملیں گے، پھر یہ آیت پاک تلاوت فرماتے ہیں:۔

إن ربی علیٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ [ہود:۵۶] (تحقیق کہ میرا رب صراط مستقیم پر ہے (یعنی صراط مستقیم پر چلنے سے ملتا ہے)

یہ تخصیص بھی قرآن پاک ہی میں کئی جگہ ملتی ہے مثلاً سورۂ نحل میں حضور اکرم ﷺ کو کیشِ ابراہیمی پر چلنے کی تاکید ہے، اس لئے کہ توحید میں کمال ورسوخ حضرت ابراہیم کا امتیازی وصف ہے، ارشاد ہے:

ثم أو حينا اليك أن اتبع ملة إبراهيم حنيفا، وما كان من المشركين.

[نحل: ۱۲۳] (پھر ہم نے آپ ﷺ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیمؑ کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک طرف ہو رہے تھے چلئے اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے!

صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنعَمتَ عَلَيْهِمْ [فاتحہ:۶]

(ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا)

نکتہ: ''انعمت علیھم'' سے مراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

یہی معنی تمام مفسرین نے بیان کئے ہیں جو ذیل کی آیت میں درج ہیں:

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُوْلَـئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِيْن [نساء:۶۹] (اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ اور رسول کی تو یہ لوگ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ [فاتحہ:۷]

(نہ ان لوگوں کا (راستہ) جو مغضوب ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔

نکات: ۱- ''مغضوب'' سے مراد یہودی ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ۔

۲- بتایا یہ گیا ہے کہ ان دونوں کا فتنہ ایسا اشد ہے کہ مسلمانوں کو قیامت تک ان سے چوکس رہنا چاہئے۔

چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے:

وَ ضُرِبتْ عليهِمُ الذلةُ والمسكنةُ و باءُوا بغضب من اللّٰه [بقرہ: ۶۱]

(اور دے ماری گئی ان (یہودیوں) پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے!

فباءوا بغضب علیٰ غضب [بقرہ:۹۰] (سو وہ لوگ (یہودی) غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے)

چنانچہ سورۂ مائدہ میں عیسائی عقیدہ مریم و مسیحؑ کے شریک فی الالوہیت ہونے کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہے:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاء قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيراً وَضَلُّوا عَن سَوَاء السَّبِيلِ [مائدہ:۹۹] (آپ ﷺ کہئے کہ اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلومت کرو اور ان لوگوں کے خیالات کی پیروی نہ کرو جو خود بھی گمراہی میں پڑ چکے ہیں اور بہت سوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ لوگ راہ راست سے دور ہو چکے تھے۔)

نوٹ: مذکورہ بالا معنی کے ساتھ، جس پر اکثر مفسرین متفق ہیں، حضرت والا رحمت اللہ علیہ علامہ ابن قیمؒ کا یہ قول بھی محض نقل فرما دیتے تھے کہ ''مغضوب'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر بھی گمراہ ہوں اور ''ضالین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خواہ جہالت کی بنا پر یا عیش و سرمستی کی وجہ سے راہِ حق سے بے خبر ہیں!

چنانچہ قرآن کریم کی یہ تنبیہ کس قدر واضح اور سخت ہے:

یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ[مائدہ:۵۱]

(اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ (تو) ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست رکھے گا وہ بلا شبہ انہیں میں سے ہوگا، یقیناً اللہ اس قوم کو ہدایت نہیں کرتا جو اپنا نقصان آپ کرتی ہے!)

نصاریٰ اور یہود کی تاریخ اسلام دشمنی سے بھری پڑی ہے، البتہ دونوں کے عناد میں ایک خاص فرق ہے۔ نصاریٰ مسلمانوں کے کھلے حریف رہے ہیں اور آج بھی خواہ وہ کیسے ہی لا مذہب اور کتنے ہی غیر متعصب بن گئے ہوں مگر اسلام اور مسلمانوں سے بغض ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اور اس وقت بھی ''سیرے سانس'' (saracens) کے لفظ سے انکے دماغ میں غیض وغضب کی وہی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو صلیبی جنگوں کے وقت سلگی تھی، چنانچہ آج پھر تاریخ اپنا یہی ورق الٹ رہی ہے، مسلمان کی چشم عبرت اے کاش اب تو کھل جائے!

نصاریٰ کے برعکس یہودی ہمیشہ مارِ آستین بن کر جسم اسلام میں زہر رسانی کرتے رہے ہیں، چنانچہ پہلا منافق عبداللہ بن اُبی یہودی ہی تھا، فرقۂ شیعہ کا بانی مختار شیعی بھی اسی گروہ کا ایک فرد تھا ''خارجیت'' کا فتنہ بھی ایک یہودی حجاج ناصبی ہی نے کھڑا کیا تھا، جنگ جمل اور جنگ صفین کا باعث منافقتِ یہود ہی تھی، اور آج بھی مسلم دماغ کی دینی بے نوری سے فائدہ اٹھا کر یہی یہودی ''اسلامک ریسرچ'' کی آڑ لیکر اسلام پر شبخون مار رہے ہیں۔

افسوس کہ مسلمان قرآنی تنبیہ اور تاریخی شواہد سے آنکھ بند کر کے اب بھی انھیں کی تقلید میں اپنی کامیابی ڈھونڈ رہے ہیں، حالاں کہ اسی دریوزہ گری کی بناء پر جو سرمایۂ ایمانی کی ناقدری کا نتیجہ ہے، اقوام عالم میں ان کی کوئی قدر و قیمت اور انفرادیت باقی نہیں ہے اور انکی اس زبوں حالی کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے ''تقویت ایمان''

یاایھاالذین اٰمنوا اٰمنوا. [نساء : ۱۳۶]

متفرق نکات

اسلام کی جامعیت

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِينًا (آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی، اور اسلام کو بطور دین تمہارے لئے پسند کیا[مائدہ۔۳]

قرآن کی ہمہ گیر تعلیمات جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں، چار ابواب پر منقسم ہیں، اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ ؐ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ، اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ، یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان، آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے، اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام عقیدہ ہے، اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ، ہمارے جسم و جان اور مال و جائیداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے،

اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں، اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور ان کی حیثیت قانون کی نہیں، بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے، اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے، اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں:۔

۱- خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل۔

۲- بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی، اور ان کے ساتھ محبت، الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ، اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو، اسلام عبادت کہتا ہے، لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے، الغرض محمدؐ جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴رص:۲۱۱-۲۱۲

دنیا کی ساری چیزوں کی غرض وغایت

قرآن میں ہے: أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ [حج] (اے انسان! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے)۔

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ [نحل:۱۲] اور (اے انسانو!) (اس نے رات اور دن کو سورج کو اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں)۔

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوق کی، ملاقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آرہی ہے، جمادات، نباتات کے، نباتات، حیوانات کے، اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آرہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہئے، مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلیٰ ہستی نہیں، تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض وغایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقائے زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں، بلکہ خدا کے لئے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [ذاریات:۵۶] (اور میں نے جن اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں)۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴رص۲۳-۲۴

اسمائے حسنیٰ کی معنویت

خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر توراۃ میں ہے، لیکن صحیفۂ محمدیؐ میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے، جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے، بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام، اور اس کی گرفت، عدل وانصاف اور حکمت ومصلحت پر مبنی ہوتا ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہوسکتا ہے، وہ دور ہوجاتا ہے، فرمایا: أَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ [آل عمران:۱۸۲] (بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں)۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عزیز (غالب) کے ساتھ حکیم (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے:

جہاں یہ کہا گیا کہ وما من الٰه الا اللّٰه الواحد القهار [ص:۳۸]۔ وہیں یہ بھی کہا گیا: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ [ص۔٦٦] قوموں کی تباہی وبربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمادیا: وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ [مومن۔۳۱] (اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا)۔

اس کی صفت ذو عقاب أليم (دردناک عذاب دینے والا)، جہاں بیان کی گئی تو

اس سے پہلے لذو مغفرة (یقینی بخشش والا) بھی فرمادیا گیا، غرض صفات جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہو، تاکہ خوف وخشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف وکرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔(۱)

ایک لطیف نکتہ

اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے الضار (نقصان پہنچانے والا) المذل (ذلت دینے والا) الخافض (پست کرنے والا) المانع (روکنے والا) وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے، ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف الضار کے ساتھ االنافع، الخافض کے ساتھ الرافع، المانع کے ساتھ المعطی اور المذل کے ساتھ المعز، قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا، کوئی خوبی نہیں، بلکہ ایک طرح کی برائی ہے، ہاں نقصان پہونچانے والا، عزت وذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو اگر ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا، اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی نفع پہنچانے والا ہے، جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں، یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس کی عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور ومضطر ہوگا اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا، البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔(۲)

(۱) سیرۃ النبی ج۴/۲٦۴
(۲) سیرۃ النبی ج۴/۳٦۷

رسالت کی حقیقت اوراس کے شرائط

قرآن پاک جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت ورسالت کی حقیقت اور شرائط ولوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کرکے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کئے ہیں:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَى قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاء إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحاً هَدَيْنَا مِن قَبْلُ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطاً وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ذَلِكَ هُدَى اللّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْ أَشْرَكُواْ لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُواْ يَعْمَلُونَ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلاء فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْماً لَّيْسُواْ بِهَا بِكَافِرِينَ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْعَالَمِينَ [انعام:۸۳۔۹۰]

(اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے، ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور اسی

طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو، ہر ایک نیکو کاروں میں سے ہے اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو، ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا، یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ جس کو چاہے چلاتا ہے، اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی، تو اگر کوئی ان باتوں کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے دوسرے لوگوں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، اے محمدؐ تو بھی ان ہی کی رہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاددہانی ہے)۔

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں، اگر ہم ان کو یک جا کر دیں تو نبوت ورسالت کے عام اوصاف، اور لوازم واضح ہو جائیں۔

۱۔ فرمایا ''ہم نے ابراہیم کو دلیل دی'' اور ''ہم نے ان کو ہدایت بخشی'' جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

۲۔ ارشاد ہوا کہ ''ہم نے ان کو سیدھی راہ پر چلایا'' اور ''یہ سب نیکوکار تھے'' اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ بھی کہا کہ ''ہم نے ان کو چن کر پسند کیا'' اور ''اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں یہ ہدایت عطا کریں'' جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی ومحنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

۴۔ فرمایا ''ہم نے ان کو کتاب، حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی'' اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

۵۔ حکم ہوا ''ان کی رہ نمائی کی پیروی کر'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی

رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

۶۔ فرمایا کہ ''اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا، یہ تو اہل دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے'' اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمح نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمدؐ کے تعلق ونسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بہ تصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

۱۔ اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح وسعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

۲۔ وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

۳۔ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

۴۔ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپؐ کی نسبت یہ فرمایا گیا: يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ [جمعہ : ۲] (وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے)۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴ ص ۳۴۔۳۶

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَى إِلَيَّ مِن رَّبِّي هَذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ [اعراف:۲۰۳]

(کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں، جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہے)۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں۔

نبی اور غیر نبی میں جو فرق ہے، وہ چار حیثیتوں سے نمایاں ہیں، مبدء اور منبع کا فرق، غرض وغایت کا فرق، طریق دعوت کا فرق اور علم وعمل کا فرق، نبی کے علم کا مبدء، منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی، شرح صدر اور وحی والہام ہوتا ہے، اور حکیم کے علم کا ماخذ ومنبع، تعلیم انسانی، گذشتہ تجربہ، استقرا اور قیاس ہوتا ہے، یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشا اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے، مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل واسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے مگر نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں، نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے، وہ صرف جلوت کے

منبر پر آراستہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر وباطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے، دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانیس وغیرہ ایک طرف، اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور محمدؐ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴،ص ۲۸۔۳۰

تین روحانی ذرائع

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لئے یقینی ہیں، اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لئے یقینی ہیں، مگر یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں، اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعۂ علم کا نام مکالمہ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱-وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز الفاظ کے آجانا، یہ اگر حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے، اور اگر خواب میں ہے تو رویا ہے۔

۲- خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا، مگر غیب سے آواز آتی ہے، اور الفاظ سنائی دیتے ہیں، اس کو الہام کہہ لو۔

۳- فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے آتا ہے، اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے، اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں، کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقے سے ہوا ہے، لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔

وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ [شوریٰ:۵۱]

(اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے

یہ یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جو چاہے اس کو وہ وحی کر دیتا ہے، بے شک اللہ بلند اور حکمت والا ہے)۔

الغرض اس امتیاز کے لئے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیئے گئے ہیں تا کہ بول چال میں ہر روحانی طریقۂ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے، بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے، اور خواب کے عالم میں رؤیا ہے اور پردے کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے، اور فرشتوں کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا، اور فرشتے کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں۔ اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے، یعنی یہ منقسم بھی ہے، اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتے کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا ہے، اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں سے جس طریقے سے بھی آنحضرتؐ کو غیبی تعلیم واطلاع دی گئی ہے، اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے: وماینطق عن الھویٰ، إن ھو إلا وحی یوحیٰ [نجم:۳۔۴]

(نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا، بلکہ وہ وحی نبوی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے)۔

نکتہ: اوپر کی آیت سے جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے، لیکن ان تین طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے، یعنی اس کی بلندی وبرتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے، مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگان خاص سے عام بندوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴ رص ۴۴

غیب کی حقیقت

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

ا۔ زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہوسکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل وفکر کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اگر ہوسکتا ہے تو تحریر وروایت کے ذریعہ لیکن جس کے لئے تحریر وروایت کا ذریعہ یقینی طور پر مسدود ہو، اس کے لئے ان کا علم اگر ہوسکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ ہوسکتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَـٰذَا [ھود:۴۹]

(یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف، تو تو ان کو پہلے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی)۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ [آل عمران:۴۴]

(یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا، جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے)۔

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا، اس کی

آنحضرتؐ سے نفی کی گئی کہ آپؐ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا، اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

ذَلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ [یوسف:۱۰۲]

(یہ غیب کی خبروں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے)۔

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا، بہر حال ان آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل وقیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو، تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے، قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا:

فَقُلْ انما الغيب لله فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ [یونس:۲۰] (تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لئے ہے، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں)۔

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں ''غیب'' کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے.

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ [لقمان:۳۴] (خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے)۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي [اعراف:۱۸۷] (وہ قیامت کو پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے)۔

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے:

مَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَداً وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ [لقمان:۳۴] (کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا)۔

۳۔ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانۂ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہوسکتا، ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے، مگر اس کے لئے کسی نہ کسی مسافت، عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے، جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر، بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے، نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لئے زمانہ حال کے علم کے لئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا وہ غیب ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے، مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کرسکتیں، کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے:

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ [لقمان:۳۴] (اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے)۔

آسمان وزمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دست رس سے اس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بنا دیے ہیں وہ پورے نہ ہوں:

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ [ہود:۱۲۳] (اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب)۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ [حجرات:۱۸] (بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب)۔

۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے

حواس اور عقل کے تنگ دائرۂ عمل سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت و دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آسکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں: الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ [انبیاء:۴۹] (وہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں)۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ [بقرہ:۳] (وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں)

الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ [مریم:۶۱] (وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں)۔ پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے، وہ انہی چاروں قسم کی امور غیب ہوتے ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم واطلاع کی دو صورتیں ہیں، ایک براہِ راست وحی الٰہی، جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم واطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی، اور دوسری اجتہاد نبوی، اجتہاد نبوی کی صورت وحقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے، مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے، اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجتمالی طور سے شریعت کے کلی اصول وقواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرمادیا ہے، اسی علم کے مطابق آپؐ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیات مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرمادیا کرتے تھے۔

پیغمبروں کا یہ اجتہاد دوسرے عام انسان مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطاوغلطی سے یکسر پاک ومنزہ ہوتا ہے، کیونکہ ان کی رائے خطاوغلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی، اسی لئے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بمنزلۂ وحی کے ہے۔

الغرض بعض امور وہ ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے، لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق رسالت ونبوت سے ہے، مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار، معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے، یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں، جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ رص۴۷۔۴۹

علوم نبوی کی قسمیں

رسول اللہؐ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

۱- ایک وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت: مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا [حشر:۷] (پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ)۔

۲- دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، رسول اللہ (ﷺ) کا یہ ارشاد کہ ''میں صرف ایک آدمی ہوں، جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں''۔

آنحضرتؐ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاء آئے ان کی وحی، کتاب اور نتائج حکمت نبویؐ میں فرق وامتیاز باقی نہیں رہا، چنانچہ توراۃ وانجیل وزبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آسکتا ہے، مگر محمد رسول اللہؐ چوں کہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے، اس لئے آپؐ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی، بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپؐ نے نتائج حکمت نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو، بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپؐ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہؓ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر وکتاب میں ہے، ان کی صحیح طور سے حفاظت وروایت وتبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ رص:۶۴۔۶۸

نبی کا مشن

وانـه لتـنزيل رب العالمين، نزل به الروح الأمين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربی مبين [شعراء:۱۹۲۔۱۹۵] (یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا، تا کہ تو ہشیار کرنے والے میں سے ایک ہو، فصیح عربی زبان میں)۔

یہ بالکل ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ ایک قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض وغایت سے کرتے ہیں، کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں، خودغرضی کی غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم ورواج ومعاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے، لیکن انبیاء کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصل چیز ہے، اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے، ان کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی معرفت ہوتی ہے، اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت وجلال کا ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے، تو یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت وطاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، خدا کی خوشنودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔ (۱)

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۳۲۔۳۳

نبی کی دو بعثتیں

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ [آل عمران:۱۱۰] (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے باز رکھتے ہو)۔

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مراد الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں، تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ [جمعہ:۲]

(وہی خدا جس نے اَن پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا، اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے)۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ [آل عمران:۱۱۰] (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے باز رکھتے ہو)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمدؐ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لئے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن

پاک کی یہ آیت بھی ہے: لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاء عَلَى النَّاس[حج:۷۸] (تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو)۔

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا:"فانما بعثتم میسیرین ولم تبعثوا معسرین (تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں) آنحضرتؐ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے، وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے، لیکن آنحضرتؐ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون ایک آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔(۱)

نبی کی یقینی کامیابی

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے)، قرآن پاک میں ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ[الصّٰفّٰت:۱۷۱۔۷۳]

(اور ہماری بات اے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ ان ہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا)۔(۲)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ ص۲۱۔۲۲

(۲) سیرۃ النبی: ج۴ ص۲۲۔۲۳

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان عبدیت

آنحضرتؐ باوجود اس کے کہ حاصل کون ومکان تھے، لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی: قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِد[کہف:۱۱۰]

(کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے)۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے، جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے، لیکن آنحضرتؐ باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے، آپ کا کیا لقب تھا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرتؐ کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت۔

أشهد أن محمدا عبده ورسوله (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور رسول ہیں)۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے، آنحضرتؐ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی، اس پر یہ آیت اتری۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ [آل عمران:۱۲۸] (تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا، یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں)۔

آنحضرتؐ کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہشمند تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ[قصص:۵۶] (تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے)۔

آنحضرتؐ نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا۔

اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ [توبہ:۸۰] (تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا)۔

آنحضرتؐ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپؐ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں، جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے: لا تطرونی کما أطرء الیھود والنصاری [بخاری ج۱/۴۹۰] (میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا)۔

ایک دفعہ آپؐ راستہ میں جا رہے تھے، ایک شخص نے دفعتہً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپ نے فرمایا: ڈرو نہیں، میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں، جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔ [شمائل ترمذی، باب القدید:۲۵۶]

بنو عامر کا وفد جب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کیا کہ آپ ہمارے سید و آقا ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: سید خدا ہے، لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپؐ نے فرمایا: اچھا یہ کہو، لیکن دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنالے۔ اصلی الفاظ یہ ہیں۔ قولوا بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان. [الأدب المفرد ص:۳۰۱]

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا: اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند، آپؐ نے فرمایا، لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گمراہ نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے، مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔ (مسند احمد) غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں، مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ رص:۲۲۱۔۲۲۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی القبلتین ہونا

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهِ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الأَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهُ لِنُرِیَهُ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ [بنی اسرائیل:۱]

(پاک ہے وہ ذات، جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام (کعبہ) سے اس مسجد اقصی (بیت المقدس) تک لے گیا، جس کے اردگرد ہم نے برکت نازل کی ہے، تاکہ ہم اپنے بندے کو اپنی نشانیاں دکھائیں، وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔)

حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا تھا، اور ان کو ارض مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا، جس کے حدود خدا نے خواب میں حضرت ابراہیمؑ کو دکھائے تھے، لیکن اسی کے ساتھ تورات میں بار بار اعلان کر کے یہ بھی ان کو سنا دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے خدا کے احکام کی اطاعت اور پیغمبروں کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب ان سے چھین لیا جائے گا، حضرت ابراہیمؑ کو اسماعیل و اسحاق دو بیٹے عطا ہوئے تھے، اور ارض مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا، یعنی شام کا ملک حضرت اسحاقؑ کو اور عرب کا ملک حضرت اسماعیلؑ کو ملا تھا، شام میں بیت المقدس اور عرب میں کعبہ واقع تھا، حضرت اسحاقؑ کے فرزندوں کو جن کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے (اسرائیل حضرت اسحاقؑ کے بیٹے یعقوبؑ کا لقب تھا)، بیت المقدس کی تولیت عطا ہوئی تھی، اور بنو اسماعیل کو کعبہ کا متولی بنایا گیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں جس قدر پیغمبر ہوئے، ان میں سے بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس اور اسماعیل کا کعبہ تھا، گویا آنحضرتؐ سے پہلے جس قدر انبیاء عرب یا شام میں مبعوث ہوئے، وہ ان دونوں

قبلوں میں سے کسی ایک کے متولی تھے، آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام دوسرے پیغمبروں کے متفرق اوصاف وخصوصیات کا جامع اور برزخ بنایا تھا، اسی طرح حضرت اسحاقؑ وا سماعیلؑ دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی ذات محمدیؐ کو قرار دیا، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی وارثت جو صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آتی تھی، وہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پھر ایک جگہ جمع ہوگئی، اور گویا وہ ''حقیقت ابراہیمیہ'' جو خاندانوں اور نسلوں میں منقسم ہوگئی تھی، ذات محمدی میں پھر یکجا ہوگئی، اور آپؐ کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی، اور نبی القبلتین کا منصب عطا ہوا، یہی نکتہ تھا، جس کے سبب سے آنحضرتؐ کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا، اور اسی لئے معراج میں آپ کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے جایا گیا، اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کی صف میں امامت پر مأمور کیا گیا، تاکہ آج اس مقدس دربار میں اس کا اعلان عام ہوجائے کہ دونوں قبیلوں کی تولیت سرکار محمدی (ﷺ) کو عطا ہوتی ہے، اور نبی القبلتین نامزد ہوتے ہیں، اور قرآن مجید میں سورۂ اسراء کی ابتداء اور واقعہ معراج کا آغاز اسی حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ[بنی اسرائیل:۱] پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندے کو مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم اپنے اس بندے کو اپنی چند نشانیاں دکھائیں، بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۳ ص:۲۴۷

ہجرت اور عذاب

وَإِن مِّن قَرْیَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِکُوهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَاباً شَدِیْداً کَانَ ذَلِكَ فِیْ الْکِتَابِ مَسْطُوراً[بنی اسرائیل:۵۸]

(دنیا میں نافرمانوں کی) کوئی آبادی ایسی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کرڈالیں، یا اس پر سخت عذاب نہ نازل کریں، یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے)

جس طرح اللہ نے اس عالم مادی میں کچھ طبعی اور فطری قوانین مقرر کر دیئے ہیں، جن میں عموماً تخلف نہیں ہوا کرتا، اسی طرح عالم روحانی میں بھی اس نے کچھ اصول وقوانین بنادئے ہیں، جن کے خلاف نہیں ہوا کرتا، من جملہ ان اصول وقوانین کے ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو ہر طرح اس کو سمجھایا جاتا ہے، تبلیغ کا ہر فرض اس کے سامنے ادا کیا جاتا ہے، شریر قوم معجزہ طلب کرتی ہے، بالآخر اس کے سامنے معجزے پیش کئے جاتے ہیں، اور جب اس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتی تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس بدبخت قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے، چنانچہ انبیاء کرام کی سیرتیں ان اصول کی بہترین تشریح ہیں، آج (واقعۂ معراج میں) اسی قاعدہ کی تعمیل کا آپ کو حکم ہوتا ہے، آپ کو معراج کی سب سے بڑی نشانی عطا کی گئی، مگر اس کو وہ جھٹلاتے ہیں:

وَإِن مَّن قَرْیَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِکُوهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَاباً شَدِیْداً کَانَ ذَلِكَ فِیْ الْکِتَابِ مَسْطُوراً وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالآیَاتِ إِلَّا أَن کَذَّبَ بِهَا الأَوَّلُونَ وَآتَیْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُواْ بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالآیَاتِ إِلَّا تَخْوِیْفاًوَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ أَرَیْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ

الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَاناً كَبِيراً [بنی اسرائیل:۵۸۔۶۰]

(دنیا میں نافرمانوں کی) کوئی آبادی ایسی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کر ڈالیں، یا اس پر سخت عذاب نہ نازل کریں، یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے، اور ہم کو (فرمائشی) معجزات کے بھیجنے سے سوا اس کے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اگلوں نے بھی ان نشانیوں کی فرمائش کی اور جب ہم نے ان کو بھیجا تو انہوں نے جھٹلا دیا، ہم نے ثمود کو ناقہ کی سوجھانے والی نشانی دی، تو انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم ان نشانیوں کو ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں، یاد کرو اے پیغمبر! (کہ یہ کفار تیری ایذاء، بلکہ قتل کے درپے ہیں، لیکن) ہم نے تم سے کہہ دیا کہ تیرا رب لوگوں سے تیری حفاظت کئے ہوئے ہے اور ہم نے (معراج کی جو) رویا تجھ کو دکھائی تو وہ لوگوں کے لئے آزمائش ہے، اور اسی طرح اس درخت کا ذکر جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے، وہ بھی لوگوں کے لئے آزمائش ہے، اور ہم ان کو آئندہ عذاب سے ڈراتے ہیں، لیکن اس سے ان کی سرکشی میں اور ترقی ہوتی جاتی ہے)۔

اس لئے حضرت آدمؑ اور شیطان کے قصہ سے اس واقعہ پر استدلال ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے: وَإِن كَادُواْ لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِيَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذاً لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئاً قَلِيلًا إِذاً لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيراً وَإِن كَادُواْ لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجوكَ مِنْهَا وَإِذاً لَّا يَلْبَثُونَ خِلافَكَ إِلَّا قَلِيلًا سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا [بنی اسرائیل:۷۳۔۷۷]

(ہم نے تم پر وحی کے ذریعہ سے جو نازل کیا ہے، قریب تھا کہ لوگ تم کو اس سے آزمائش میں ڈال دیں کہ اس وحی کے علاوہ تم کوئی اور وحی بنا کر ہماری طرف جھوٹ منسوب کر دو، اور اس وقت وہ تم کو اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ ان کی طرف جھک چلے تھے، اگر تم ایسا کرتے تو ہم تم کو زندگی اور موت کے دوگونہ عذاب کا مزہ چکھا دیتے، اور پھر تم کو میرے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی مددگار بھی نہ ملتا، اور وہ

تم کو اس سرزمین (مکہ) سے قریب ہے کہ دل برداشتہ کر دیں، تاکہ تم کو یہاں سے نکال دیں، اگر ایسا ہوا تو پھر وہ تمہارے چلے جانے کے بعد اطمینان سے بہت کم رہ سکیں گے، تم سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے سب کے ساتھ یہی دستور رہا ہے، اور تم ہمارے دستور میں ردوبدل نہ پاؤ گے)۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگا کہ معراج ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج آنحضرتؐ کے ذریعہ سے خدا کی وہ نشانی تھی جس کے نہ تسلیم کرنے پر عذاب الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۳ ص: ۲۵۳۔۲۵۴

حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت ﷺ کے واقعات اور حالات میں مماثلت

حضرت موسیٰ اور آنحضرتؐ کے واقعات زندگی میں متعدد حیثیتوں سے مماثلت ہے اور خود قرآن مجید نے اس مماثلت کو ظاہر کر دیا ہے: إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولاً شَاهِداً عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولاً [مزمل:۱۵] (لوگو! ہم نے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے)۔

اسی سبب سے قرآن مجید میں بار بار حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دہرایا گیا ہے، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے اپنے دشمنوں کے اندر زندگی بسر کی، یہی حال آنحضرتؐ کا تھا، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہل دربار کو ہر طرح سمجھایا، مگر وہ ایمان نہ لائے اور بالآخر حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنا پڑی، اسی طرح صنادید قریش بھی آپؐ پر ایمان نہ لائے اور بالآخر آنحضرت نے صحابہؓ کو لے کر مکہ سے ہجرت فرمائی، جس طرح ہجرت سے کچھ پہلے موسیٰؑ کو کوہِ طور پر خدا کی ہم کلامی نصیب ہوئی اور احکام عشرہ عطا ہوئے، اسی طرح آنحضرتؐ کو بھی ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج ہوئی اور احکام دوازدگانہ عطا ہوئے، جس طرح حضرت موسیٰ کی ہجرت کے بعد فرعونیوں پر بحر احمر کی سطح پر عذاب نازل ہوا، اسی طرح آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد صنادیدِ قریش پر بدر کے میدان میں عذاب آیا اور جس طرح اس کے بعد فرعون کی شامی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے، اسی طرح مکہ معظمہ کی حکومت بھی ہجرت کے بعد آپؐ کو عطا کی گئی۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر کفار قریش کو معلوم ہونا چاہئے کہ قانون الٰہی معراج کے بعد ہجرت کا حکم دے گا اور اس کے بعد ان پر عذاب الیم کا نزول ہوگا، چنانچہ سورۂ اسراء کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَى مَسْحُوراً قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنزَلَ هَؤُلاء إِلاَّ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ بَصَآئِرَ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُوراً فَأَرَادَ أَن يَسْتَفِزَّهُم مِّنَ الأَرْضِ فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ جَمِيعاً وَقُلْنَا مِن بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُواْ الأَرْضَ فَإِذَا جَاء وَعْدُ الآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفاً [بنی اسرائیل:۱۰۱۔۱۰۴]

(اور ہم نے (کوہ طور پر) موسیٰ کو کھلے احکام دیئے (جس طرح محمدؐ کو معراج میں عطا کئے) تو پوچھ لو بنی اسرائیل سے کہ جب بنی اسرائیل کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ! میں سمجھتا ہوں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (تمہاری عقل کھو دی ہے) موسیٰؑ نے کہا: اے فرعون! تجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان حکموں کو آسمان اور زمین کے مالک کے سوا کسی اور نے ان کو دانائی بنا کر نہیں اتارا ہے، اور اے فرعون! میں سمجھتا ہوں کہ تم اب ہلاک اور برباد ہو جاؤ گے، فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھیڑ دے تو ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو سب کو غرق کر دیا اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم ملک میں رہو، جب قیامت کا وعدہ پورا ہوگا تو سب کو سمیٹ کر ہم اپنے حضور میں لائیں گے)۔

ان آیتوں کے آغاز میں جن نو نشانیوں کے دیئے جانے کا حکم ہے، بعض مفسرین نے اس سے حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات مراد لئے ہیں، مگر بعض احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے، سامنے سے دو یہودی گزرے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں، دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو، سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا)، اس کے بعد وہ آپؐ کی خدمت میں آئے

اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئیں؟ آپؐ نے فرمایا: وہ یہ ہیں: (۱) کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ (۲) زنا نہ کرو (۳) کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو (۴) چوری نہ کرو (۵) جادو نہ کرو (۶) کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ (۷) سود نہ کھاؤ (۸) کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ (۹) میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود! یہ دسواں حکم ہے کہ ''سبت کے دن زیادتی نہ کرو''، یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپؐ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر میں ہے، امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے، ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسرے باب ماجاء فی قبلۃ الید والرجل میں اور دونوں جگہ کہا ہے کہ ''حدیث حسن صحیح''۔

بہر حال اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ان احکام عشرہ اور آنحضرتؐ کے احکام دوازدگانہ میں ایک وجہ مماثلت ہے، اس لئے ان دونوں کے منکروں کا ایک ہی حال ہوگا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۳رص:۲۵۸-۲۶۰

شق صدر، کیفیت اور اس کا تعدد

ألم نشرح لك صدرك[شرح : ۱]

(کیا اے پیغمبر! ہم نے تیرے سینے کو کھول نہیں دیا)۔

شق صدر کی صحیح کیفیت حالت معراج کے سلسلہ میں صحیح بخاری وصحیح مسلم اور نسائی وغیرہ میں متعدد روایتوں اور طریقوں سے مذکور ہے کہ ایک شب آنحضرت (ﷺ) خانۂ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے، آنکھیں سوتی تھیں، مگر دل بے دار تھا کہ ناگاہ حضرت جبرئیلؑ چند فرشتوں کے ساتھ نظر آئے، آپؐ کو اٹھا کر وہ چاہ زمزم کے پاس لے گئے، یا آب زمزم لے کر کوئی آپ کے پاس لایا، سینۂ مبارک کو چاک کیا، پھر آب زمزم سے دھویا اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان اور حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا، پھر اس طشت کے سرمایہ کو سینۂ مبارک میں بھر کو شگاف کو برابر کر دیا گیا، اس کے بعد فرشتے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔

تمام روایتوں کو جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپ (ﷺ) پر اس کیفیت کا گذرنا ظاہر ہوتا ہے، ایک جب چار پانچ سال کے تھے، اور حضرت حلیمہ کے ہاں پرورش پا رہے تھے، دوسرے جب عمر شریف دس برس کی تھی، تیسرے جب آپ بیس برس کی عمر کو پہونچے، چوتھے جب حضرت جبرئیل سب سے پہلی دفعہ وحی لے کر آئے، پانچویں معراج کے موقع پر، محدثین کے نزدیک تیسری دفعہ قطعاً غیر ثابت ہے، باقی چار موقعوں کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے تسلیم کیا ہے۔

امام سہیلی روض الأنف میں صرف دو موقعوں کی روایت کو صحیح سمجھتے ہیں، بچپن میں جب عقل وہوش کا آغاز ہوا تو سینۂ مبارک سے حصۂ شیطانی جو ہر انسان کے اندر ہے، اس کو نکالا گیا، ابھی علم وحکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی، مگر معراج کی رات جب اس عقل وہوش کی تکمیل ہوئی تو وہ دھو کر علم وحکمت سے معمور کیا گیا، جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے۔ (سیرۃ النبی: ج۳رص:۲۶۹-۲۷۰)

ضمائر کے استعمال میں نکتہ سنجی

ألم نشرح لك صدرك [شرح : ١]

اوردوسری جگہ ہے:رب اشرح لی صدری [طه : ٢٥]

ایک لطیف پہلو یہاں ذکر کے قابل ہے،حضرت موسیٰؑ کی دعا اور حضرت محمدؐ پر احسان دونوں موقعوں پر لی اور لك ہے،(رب اشرح لي صدري ،اور ألم نشرح لك) حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں، میرے سینہ کو کھول دے، اور آنحضرتؐ کیلئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا میں نے تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا۔سوال یہ ہے کہ ''میرے لئے'' اور ''تیرے لئے'' کے اضافہ کی ضرورت اور اس 'لام' کی حاجت کیا تھی؟مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے،حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے جیسا کہ خلق لكم ما فی الارض جمیعا میں ہے،مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھ کو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشفِ علم کے لئے یا تائید کے لئے،یا فائدہ کے لئے اور یہ کشفِ علم اور شرحِ صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہوا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۱۰۰

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اجتہادی امور

قرآن مجید میں بعض جگہ آپؐ کو آپ کی بعض چند فروگذاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپؐ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے، وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا،لیکن آنحضرتؐ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے،تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپؐ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا، بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے بہترین راستہ کو چھوڑ کر بہتر راستہ کو اختیار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی، ذیل میں وہ پانچ اجتہادی امور ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی۔

ان میں پہلا واقعہ روسائے قریش کے آپؐ کی مجلس میں بیٹھنے اور اسی درمیان غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم کے آنے پر اظہار ناگواری کا ہے، اس موقع پر وحی الٰہی نے سورۂ عبس کی ابتدائی آیات ۱ تا ۱۲ میں تنبیہ کی۔

دوسرا واقعہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے مال غنیمت حاصل کرنے اور قیدیوں سے زر فدیہ قبول کرنے کا ہے۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر قصوروار منافقین نے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے عذر بیان کئے تو آپ نے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگذر کیا، سورۂ توبہ آیت:۴۳ میں اس کا تذکرہ آیا ہے۔

چوتھا واقعہ منافقین کی نسبت آپؐ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپؐ کی دعائے مغفرت قبول نہیں ہوگی اور فرما دیا گیا تھا کہ اَسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ

إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً [توبہ:۸۰]۔اس حکم کے آنے کے بعد آپؐ نے عبداللہ بن بی بن سلول کی نمازۂ جنازہ پڑھائی اور فرمایا: میں سترہ دفعہ سے زیادہ ان کی مغفرت کی دعا مانگوں گا۔اس پر اس لئے حکم ہو:ا''وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَداً وَلَا تَقُمْ عَلَىَ قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُواْ وَهُمْ فَاسِقُونَ [توبہ:۸۴] (اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا، اور اسی گناہ گاری کی حالت میں مرے)۔

پانچواں واقعہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کسی مباح چیز کو جو آپؐ کو بہت محبوب تھی اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، اس موقع پر سورۂ تحریم آیت: انازل ہوئی۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ر ص۷۵۔۸۱

انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا [شوری:۱۳] (خدا نے تمہارے لئے وہی مشروع کیا، جو نوح وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا)۔

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزاء وسزا اور عمل کی پرستش، اس لحاظ سے انبیاء کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لئے فرمایا شَرَعَ لَكُم مِن الدين ما وَصّى به نوحا [شوری:۱۳] (تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جو نوحؑ وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا) اور اسی کا نام اسلام ہے، لیکن انبیاء کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گذرے ہوں، اور ان کی دعوت بھی مجید ہو، ان کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں، ہندوستان کے اوتار، لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبے کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہنچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيۤ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ [انبیاء:۲۵] (اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری ہی پرستش کرو)۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيۤ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ [نحل:۳۶]

(اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو)۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہوسکتی ہے اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جزء توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴ ص ۱۱۱۔۱۱۲

قرآن مجید میں آپؐ کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے؟

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ [عنکبوت:۵۰۔۵۱]

(اور انہوں نے کہا کہ پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں کیوں نہ اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کی قدرت میں ہیں، میں صاف صاف خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے اس پر کتاب اتاری، جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے)۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں انبیائے سابقین کے معجزے، جس تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، آنحضرتؐ کے معجزے اس تفصیل اور تکرار کے ساتھ اس میں مذکور نہیں، اسی سے ایک طرف تو مخالفین اسلام نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذات پاک اس عطیۂ الٰہی سے محرومی تھی، دوسری طرف اسلام کے عقل پرست فرقہ کو اس سے یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اسلام نے خوارق عادت کے ظہور سے انکار کیا ہے، کیونکہ جب اس کے نزدیک خاتم الانبیاءؐ کی زندگی ان سے خالی تھی تو گزشتہ انبیاء کے سوانح میں جو اعجاز نظر آتا ہے، وہ بھی سمجھنے والوں کے لئے وہم کا تصور ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیگر انبیائے کرام اور آنحضرتؐ کے معجزات اور آیات ودلائل میں جو یہ اختلافِ منظر نمایاں ہے اس کے متعدد وجوہات اور اسباب ہیں جن پر کوتاہ بینوں کی نظر

نہیں پڑی، اس لئے وہ مختلف قسم کے شکوک وشبہات میں گرفتار ہوگئے:

(۱) اس اختلاف منظر کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جس نے قرآن مجید کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے یا گزشتہ صفحات میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے معجزہ کی جو حقیقت واضح کی گئی ہے اس کو سمجھا ہے، وہ تسلیم کرے گا کہ اسلام نے نبوت کی تصدیق کے باب میں ظاہری اور مادی معجزات کو وہ اہمیت نہیں دی ہے جو خصوصیت کے ساتھ عیسائی مذہب اور اس کے مقدس صحیفہ میں نظر آتی ہے، بلکہ وہ انسانوں کو زیادہ تر غور وفکر، فہم وتدبر، سوچ اور سمجھ کی دعوت دیتا ہے اور نبوت کی اندرونی خصوصیات اور روحانی دلائل کو ایمان وتصدیق کی بنیاد قرار دیتا ہے، اس بنا پر اس کے لئے اپنے پیش کرنے والے کی سچائی کے ثبوت میں اس کے خوارق اور معجزات کو تفصیل اور تکرار کے ساتھ ہر جگہ دہرانا اس اصول کے خلاف تھا، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام ان گمراہیوں سے پاک رہا، جن کی تاریکیوں کے پردہ میں عیسوی مذہب کا نور چھپ کر رہ گیا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو جو نشانیاں ملی تھیں وہ چند محدود گنی ہوئی اور متعین شکل میں تھیں، اس لئے قرآن مجید کو جب کبھی ان پیغمبروں کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو خواہ مخواہ ان کے ان ہی چند حیرت انگیز واقعات کو بار بار دہرانا پڑتا ہے اور اس کی تفصیل اور تکرار سے کوتاہ بینوں کی نگاہوں میں ان پیغمبروں کی نشانیاں اجاگر ہوکر نظر آتی ہیں، اس کے برخلاف آنحضرتؐ کو جو نشانیاں عطا ہوئیں وہ اس قدر متنوع ومختلف اور غیر محدود تھیں کہ ان کے تذکرے کے وقت ایک ہی نشانی کو بار بار پھیلانے اور دہرانے کی حاجت نہ تھی، اس لئے یہ دلائل محمدی قرآن مجید کے سینکڑوں صفحات کے مختلف گوشوں میں اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ دوسرے انبیاء کے معجزوں کی طرح وہ اجاگر اور نمایاں ہوکر کم سوادوں کو نظر نہیں آتے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے معجزات، خوارق اور نشانیاں پیغمبر کی قوت اور اختیار سے نہیں، بلکہ خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ ومشیت سے

ظہور پذیر ہوتی ہیں، اس بنا پر آنحضرتؐ کے آیات ودلائل بھی ذات محمدیؐ کی طرف منسوب ہوکر نہیں، بلکہ قدرتِ الٰہی کی طرف منسوب ہوکر بیان ہوئے ہیں، اس لئے عام لوگوں کا خیال ان کو دلائل محمدی سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پاس ایک ہی مستند چیز یعنی ان کا صحیفہ ہے جس میں ان کے ربانی احکام، ان کے پیغمبروں کے اقوال، حالات، سوانح، معجزات سب کچھ ملے جلے ہیں، لیکن اسلام کے قبضہ میں دو چیزیں ہیں، ایک صحیفۂ الٰہی جس میں صرف خدائی احکام ومطالب ہیں، دوسرے حدیث وسنت، جس میں پیغمبر کے حالات، اقوال اور معجزات وغیرہ الگ اور مستقل حیثیت سے مذکور ہیں، اور وہ بجائے خود روایتی استناد کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے صحیفوں سے کہیں بلند تر ہے، اس لئے خدا نے پیغمبر کے ان دلائل ومعجزات کو عدم اہمیت کے باعث بہ تفصیل اپنے صحیفہ میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ اس کے لئے احادیث کے مستند ذخیرۂ روایات کی موجودگی کو کافی قرار دیا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۳ ص: ۲۷۴۔۲۷۵

قرآن معجزہ ہے، لغوی بھی اور معنوی بھی

هذا بصائر من ربكم وهدى ورحمة لقوم يؤمنون. [اعراف:۲۰۳]

(یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں، اور ہدایت ورحمت ہے مومنوں کے لئے)

قرآن کریم صرف فصاحت وبلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزۂ کامل ہے، اس کے معجزہ کامل ہونے کی مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال گزرے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک امی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے، تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گذر گیا، مگر ایک آواز بھی اس تحدی کو قبول کرنے کے لئے بلند نہ ہوئی۔

توراۃ قانون وشریعت ہے، لیکن اخلاق وموعظت نہیں۔ انجیل اخلاق وموعظت ہے، لیکن قانون شریعت نہیں، زبور مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے، لیکن دیگر صفات سے خالی، مسیحؑ کے صحیفہ میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں، مگر استدلال اور فکر ونظر کی دعوت نہیں، صحف بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں، مگر دقائق حکمت اور اسرار ایمان وعمل سے خالی ہیں، دنیا میں ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون وشریعت بھی ہے اور اخلاق وموعظت بھی، مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے، اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال وفکر بھی، اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائق حکمت واسرار ایمان وعمل سے معمور بھی، اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف وتغییر اور تراجم وتعبیر سے اپنی اصل زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں، اس کی بقاء اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک

لفظ، ایک حرف، ایک نقطہ میں تغیر وتبدل نے راہ نہیں پائی، وہ اپنی زندگی جاوید کے لئے کاغذ کے نقوش وحروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانہ کے صندوق ہیں اور وہ اسی زبان اور ان ہی الفاظ اور ان ہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دست قدرت نے اس کو ڈھالا تھا اور جبرئیل امین نے اس کو اتارا تھا اور محمد عربیؐ نے اس کو امت کے ہاتھوں میں سونپا تھا، کیا اعجاز نہیں؟ [سیرۃ النبی: ج ۳ ص: ۲۸۶]

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ ساتھ اپنے الفاظ وکلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے اور اس کی فصاحت وبلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں بن سکتیں، کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے وحی ہیں، چنانچہ نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام وعبارت کے لحاظ سے معجز کہا ہے، چنانچہ اسی لئے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحی موسوی (توراۃ) اور عیسوی (انجیل) نے ظہور کیا۔ مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہوگئی، تورات کی اصلی عبرانی زبان جو حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلی تھی، وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہوگئی، اور اس نے آرامی اور سریانی زبان کا قالب اختیار کرلیا اور آخر صدہا سال کے بعد حضرت عزیرؑ نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا، انجیل کے متعلق ابھی تک یہی طے نہیں ہوا کہ اس کی اصل زبان کیا تھی؟ اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں جو حضرت عیسیٰ فلسطین کے ملک میں بولتے تھے، ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت وبلاغت کے اعجاز اور اس کے الفاظ کے من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ برخلاف اس کے دنیا میں ''وحی محمدی'' سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے، جس نے اس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا، چنانچہ قرآن مجید کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا، اور

وہ ہر قسم کی تحریف وتغییر سے پاک ہے، اس لئے اس کے الفاظ، کلمات اور عبارات تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ (سیرۃ النبی: ج ۳/ص ۲۸۶۔۲۸۷)

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت وبلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر وخطابت کا بہت چرچا تھا، اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا، اس لئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح وبلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہ قرآن مجید فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے، لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت وانشاء میں ہے، اس سے کہیں زیادہ معانی ومطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا، جیسا اب ہے، لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہوسکتا تھا، قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت وبلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا، وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے، وہ خدا کی عظمت وجلالت، اصنام کی تحقیر وتذلیل،، انسان کا عجز وتعبد، سزا وجزا، بعث ونشر، جو روظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دلوں میں گھر کرتے جاتے تھے اور ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہِ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور مسلمان ہوجاتے تھے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۴/ص: ۲۰۳۔۲۰۴

نماز پنج گانہ کی فرضیت

قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے: ”أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَى أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا“ [بنی اسرائیل: ۷۸۔۷۹]

(آفتاب کے ڈھلنے کے وقت (ظہر، عصر، مغرب) سے لے کر رات کے اندھیرے (عشاء) تک نمازیں پڑھا کرو، اور صبح کی نماز میں حضور قلب خوب ہوتا ہے، اور رات کے ایک حصہ میں تہجد پڑھ لیا کرو، تمہارے لئے نفل ہے، عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم کو مقام محمود میں پہونچا دے)۔

لفظ لدلوک الشّمس (آفتاب کے ڈھلنے کے وقت) میں ظہر، عصر اور مغرب، نماز کے تین اوقات کی تعیین کی طرف لطیف اشارہ ہے، یہ معلوم ہے کہ دین محمدی ملت ابراہیمی کا نقش ثانی ہے، حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی، اور جس کی رسم کہن دنیا میں آج بھی قائم ہے، اس مذہب میں آفتاب کی پرستش کے وہ اوقات تھے، جن میں اس کی روشنی کا ظہور یا کمال ہوتا ہے، اور اسی لئے طلوع سے لے کر نصف النہار تک اس کی پرستش کی جاتی ہے، امت ابراہیمی نے اس کے برخلاف اپنے لئے وہ اوقات متعین کئے جو آفتاب کے زوال کے ہیں، یعنی سورج ڈھلنے سے لے کر آفتاب کے غروب ہونے تک، یہ تمام اوقات اس کے انحطاط نور اور زوال کے ہیں، آفتاب کے انحطاط اور زوال کی تین منزلیں ہیں، ایک وہ جب سمتِ راس (سر) سے وہ ڈھلتا ہے، (یہ ظہر کا وقت ہے)، اور دوسری منزل وہ ہے جب وہ برابر کی نگاہ سے نیچے اترتا ہے، یہ عصر

کا وقت ہے، اور تیسری منزل وہ ہے جب وہ سمتِ افق سے نیچے گر جاتا ہے اور یہ مغرب کا وقت ہے، چوتھی نماز کا وقت رات کی تاریکی کا مقرر کیا ہے، جب آفتاب کے بقیہ وجود کی سرخ نشانی کو جس کو عرفِ عام میں شفق کہتے ہیں، وہ بھی مٹ جاتی ہے اور صبح کی نماز ''واد بار النجوم'' یعنی ستاروں کی روشنی کے ماند ہونے کے بعد ہے، غرض آیت بالا میں پنج گانہ نماز کی فرضیت نہایت لطیف اور خوبی سے ادا کی گئی ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۳ ص: ۲۵۵

اسلامی اوقات نماز

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ

(نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت، رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نماز) [بنی اسرائیل: ۷۸]

اوقات نماز کی تعیین میں اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسد کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی، جس کی روشنی قلوب انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکتِ نیمروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالم کائنات سے رخصت ہو کر نقاب شب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی گل کیا حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملت ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کئے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں، بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق کی عبادت ہے جس کے آستانہ کمال کے سجدہ سے خود

آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دین محمدی، ملت ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملت ابراہیمی میں تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں جب سر (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقات انحطاط میں ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے:

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ [بنی اسرائیل:۷۸] (نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت، رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز)۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت، اس کے عروج وکمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۱/ص:۶۵۔۶۶

جمع بین الصلاتین

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا، اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورۂ مزمل میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا، جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جاسکتی تھی، لیکن جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا، اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی، واصبر لحكم ربك فانك بأعيينا وسبح بحمد ربك حين تقوم، ومن الليل فسبحه وادبار النجوم [طور:۴۸۔۴۹] (اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کیجئے، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر، جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے، اور کچھ رات کے حصے میں اس کی تسبیح کر، اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت)

یہ آیت سورۂ طور کے آخر میں ہے، اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی (صحیح بخاری) اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرتؐ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے، سورۂ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے، اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری ہے، انہیں معنوں کی ایک اور آیت ہے، جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ

کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہئے اور بڑھتی ہے: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِماً أَوْ كَفُوراً وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا [دھر:۲۴۔۲۶] (تو اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر، اور ان مخالفوں میں سے کسی کہنگار یا اللہ کے ناشکر گزار کا کہنا نہ مان، اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کر)۔

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب، مگر ہنوز ''اصیل'' ظہر وعصر اور ''من اللیل'' (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیونکہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ تین وقتوں کی ''تسبیح وتحمید'' باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہے، حکم ہوتا ہے: أقم الصلوٰة طرفی النهار وزلفا من اللیل (ھود:۱۱۴) (اور دن کے دونوں کناروں (فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر) غالباً نماز کے اوقات میں یہ پہلی آیت ہے، جس میں ''تسبیح'' کے بجائے باقاعدہ صلاۃ کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی، جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

فاستقم كما أريت ومن تاب معك ولا تطغوا [ھود:۱۱۲] (پس تو سیدھا چلا چل، جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے، اور وہ جنہوں نے تیرے ساتھ توجہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم حد سے آگے نہ بڑھو)

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں، ایک دن کے کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب، تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسرے دن کے دوسرے کنارہ میں دن کے خاتمہ کے قریب، اور تیسری رات کے ابتدائی حصے میں، پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی، جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا، اور تیسری سے عشاء کی نماز

مراد ہے، ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال وابہام تھا، دوسری میں ظہر وعصر، اور تیسری میں مغرب وعشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں، اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں، سورۂ ق میں جو مکی سورہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

فاصبر علىٰ ما يقولون وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب، ومن الليل فسبح وأدبار السجود [ق:۳۹۔۴۰]۔

(پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر، اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد وتسبیح کر، اور کچھ رات پر (عشاء) اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے) سجدہ کرنے کے بعد (غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر)۔

آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے، پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں، یعنی دونوں کو ایک لفظ ''قبل الغروب'' یا ''اصیل'' یا ''طرفی النہار'' کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے۔ آخری آیت میں جو سورہ روم کی ہے، ظہر عصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے۔ مگر شام کی نماز میں اجمال ہے یعنی مغرب وعشاء دونوں کو ''حین تمسون'' (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے۔ اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرتؐ کی عملی مثالیں اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۱/ص:۳۷

ایام روزہ کی تحدید

أياما معدودات، فمن شهد منكم الشهر فليصمه. [بقرہ:۱۸٤]

(چند گنے ہوئے دن، تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے)

روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا، اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے بارہ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی، تاکہ تمام افراد امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں، اور اس کے لئے وہی زمانہ موزوں تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا، یعنی رمضان۔ چنانچہ آنحضرتؐ اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گزارا، اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں ایک مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے۔ اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے، چوں کہ روزہ بہرحال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور پر کی گئی ہے۔ تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو۔ پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر کہا گیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ [بقرہ: ۱۸۳] اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا، بلکہ ”كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ“ [بقرہ:۱۸۳] جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔ اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا: ”ایاما معدودات“ (چند گنے ہوئے دن)، مدت کی تعیین اب بھی نہیں، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا۔ جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا چند گنے ہوئے دن اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر ہے، تاکہ طبیعت متوجہ رہے۔

”فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيْضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ [بقرہ:۱۸۴] (تو جو تم میں بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے چند دنوں کی گنتی)۔

مگر اس طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزہ کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے، کہ اگر خاص زمانہ ہوتا تو یہ کہنا بے کار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے، وہ گنے ہوئے مقررہ ہوں گے، ورنہ ”معدودات“ اور ”عدة من أيام أخر“ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر ”ولتكملوا العدة“ (تاکہ تم شمار پورا کرو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ [بقرہ:۱۸۴] (اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے)۔ اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے۔

”فَمَن تَطَوَّعَ خَيْراً فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ“ (تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے، تو یہ بہتر ہے اس کے لئے، اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو)۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۱/ص:۱۵۴۔۱۵۵

روزہ کی مشروعیت

روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ بارہ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے کہ رات دن میں ایک وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے، ان تمام احکام پر نظر ڈالئے جو فدیہ اور احکام سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرتاً کمزور یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں، ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا: ہے ''وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ''[بقرہ:۱۸۴] (اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں)۔

اسی طرح حج میں کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے ''فِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ''[بقرہ:۱۹۶] (تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے)۔

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں، جس کو تمتع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے۔ جو غریبوں میں ہی تقسیم کی جاتی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو: فصيام ثلاثة أيام في الحج و سبعة اذا رجعتم [بقرہ:۱۹۶] (تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات گھر آ کر)۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے، تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے۔ جو منیٰ لے جا کر ذبح کی جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو '' أَوْ

كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَو عَدْلُ ذَلِكَ صِيَامً '[مائدہ:۹۵](یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزہ، اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا)، اگر یہ نہ ہو سکے "فصيامُ ثَلاَثَة أيام" [مائدہ:۸۹] (تو تین دن کے روزے)۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو' فصيام شهرين متتابعين [مجادلہ:۴] تو دو مہینہ متواتر روزہ۔

اور یہ بھی ممکن نہ ہو "فإطعام ستين مسكينا" [مجادلہ:۴] (تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا)۔ ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ وخیرات، غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۱/ص:۱۶۶۔۱۶۷

اسلام کے ارکان پنج گانہ اور اخلاق

قد أفلح المؤمنون الذين هم فى صلاتهم خاشعون. [مؤمنون: ۱]

(بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرتے ہیں)

تعلیم محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات وتعلقات کا نام ہیں، اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں، اللہ تعالی نے جو ارحم الراحمین ہیں اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک وبد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں، بلکہ اپنے بندوں کے ہاتھ میں رکھی ہے، جن کے حق میں وہ ظلم وتعدی ہوئی ہے۔

بعض وہ حدیثیں جن کی بنا پر اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے، اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، حالانکہ ان عبادات کے دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ایک مقصد انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے، اور حج میں بھی مختلف طریقوں سے ہماری

اخلاقی اصلاح وتربیت ہوتی ہے، اور یہ بھی دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے، اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے۔ اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادات کے جوہر ومعنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں، جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں، جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں، جن میں روح نہیں۔ (۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۶/ص: ۱۲

امانت عظمیٰ کا حق

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ[احزاب:۷۲]

(ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا)۔

عقل وفہم اور ارادہ واختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:

۱-ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں: آفتاب وماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

۲- دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم وفہم رکھتی ہیں، لیکن قیاس واستقراء وتمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کرکے نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے، ان کا ارادہ واختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے، جیسے حیوانات۔

۳-تیسری وہ مخلوق ہے، جو عقل وادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقراء وتمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہونچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں، وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں، اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا، اسی لئے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار وحرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت ہوتے ہیں، لیکن ان کے ہر فرد سے ایک ہی

قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں، ان کے ان افعال، حرکات اور آثار کو جبلت، فطرت اور طبیعت کہتے ہیں، تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت وجبلت کے مطابق ہوتے ہیں، جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے بے ارادہ اور اضطراراً سرزد ہوتے ہیں، مگر اس کے اور دوسرے افعال وحرکات تمام تر اس سے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں، صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر وشر اور نیک وبد کا حکم جاری ہوتا ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ[احزاب:۷۲]

(ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا)۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر وشر کی ذمہ داری سے بری ہیں، جمادات ونباتات تو اس لئے کہ ان کے افعال وحرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں، یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہمیشہ ہوئے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دے دیئے ہیں، حیوانات بھی اس لئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ افعال وحرکات بھی تمام تر جبلی وطبعی ہیں، اور وہ جبلت وطبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کئے بغیر عامل ہیں، یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں۔اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں، کیونکہ وہ بھی انہی خلقت وجبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں، اور اسی لئے ان سے عصیان سرزد نہیں ہوتے، صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے، جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، لیکن انسان کو دوسرے موجودات ومخلوقات کی طرح مجبور محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جاچکا کہ وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے، انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے، اسی طرح وہ

ارادی قدرت واختیار، جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے، انسان میں ایک حدتک وسیع ہے، علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے، اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی ''ارادی تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لئے نہیں، بلکہ بارادہ اطاعت کے لئے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ [احزاب:۷۲]

(ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا)۔

یہ امانت اس کی نیکی اور بدی کی تمیز اور خیر وشر کا فرق ہے، جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے، انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت وجبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے، اسی طرح باارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال وحرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام ووحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام ووحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام واوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو، انبیاء ورسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے، اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ وباخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعًا مجبور اور مجہول ہیں، اور کسی قدر بااختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں۔ خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَاب [حج:۱۸]

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا)۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے، لیکن خاص بارادہ اور باعقل اور انجام میں انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں، مطیع اور سرکش۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ رص۲۶۔۲۷

فقہ اسلامی کا مدار

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰه [نساء:۱۰۵] (ہم نے اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ لوگوں کے درمیان جو کچھ اللہ سمجھائے، اس کے ذریعہ فیصلہ کرے)۔

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے، جو ایک طرف اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہوسکے، لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جاسکتا، تاہم ان کو کم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح وتبیین کرادی، گو انسانی ذرائع حفظ وروایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح وتبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہوگیا، مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح وتبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرتؐ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول وکلیات کے ماتحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے اس کے فیصلے فرماتے رہے، خلفائے راشدین نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ

واقعات کے فیصلوں کے لئے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرتؐ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت، نور بصیرت اور ارادت الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا، اور یہی اصول بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا اور ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلہ نبوی کے معصوم ومسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کرکے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل وانصاف، رسم ورواج، عقل وفکر واستحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ رص۱۰۲

ریا اور عدم اخلاص معنوی شرک

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ [فرقان:۴۳]
(تم نے ان کو دیکھا، جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے)۔

حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب وروح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے، کوئی طلب شہرت کے لئے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی معاوضہ کے لئے کرتا ہے، کوئی نمائش اور دکھاوے کے لئے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے، ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے، جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے کہا:

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ [فرقان:۴۳] (تم نے ان کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے)۔

اس لئے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے، اس بت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے، آپ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے، انما الاعمال بالنیات. اس لئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہئے، جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی، اس کے ایمان وتوحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بناء پر وحی محمدیؐ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض وغایت مرضاۃ

اللہ، (اللہ کی خوشنودی) مخلصین لہ الدین (مخلص) اور وجہ ربہ الاعلیٰ (ذات خدا) کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض ونیت سے کرے تو درحقیقت اس کام کے لئے اس نے ایک موقت خدا الگ بنایا وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں، لیکن معنوی ونفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپ نے فرمایا: جس نے خدا کے لئے دیا اور خدا ہی کے لئے رد کیا، خدا کے لئے چاہا، اور خدا ہی کے لئے عداوت کی اور خدا ہی کے لئے بیان کیا، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ رص: ۲۳۷۔۲۳۸

تعلیم اخلاق کا تنوع

لقد کان لکم في رسول الله أسوة حسنة [احزاب:۲۱]
(تمہارے لئے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے)

اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں، بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰؑ کے مکتب میں عفو ودرگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی ہر وقت نشوونما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم وفن کا شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد وعابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں، اور اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، مدینۃ النبی کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے

دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبوی تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ وزبیرؓ، معاویہؓ وسعد بن معاذؓ اور سعد بن زبیرؓ جیسے ارباب رائے وتدبیر ہیں۔ کہیں خالدؓ وابوعبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں۔ کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمراں، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے۔ کہیں ان زہاد وعباد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ وسلمانؓ وابودرداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح اسلام کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب علم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گزارا کرتے اور رات دن علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ ومحدث تھے۔ جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا۔ ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرست کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے، اور سب اخلاق واعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج/۶ص:۲۴ـ ۲۵

قانون اوراخلاق

ان اللّٰہ یأمربالعدل والاحسان [نحل:۹۰]

(بےشبہ خداعدل اوراحسان (دونوں) کاحکم دیتاہے)

ایک شخص جو جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا ہے، بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پاکر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے، اس لئے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کردینے کا پورا پورا حق نہیں ہے، کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کرکے جماعت کے ہزاروں اور لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کررہا ہے، اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں ’’ان اللّٰہ یأمر بالعدل والاحسان‘‘ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ اور فساد اور برائیوں کے انسداد کے لئے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، گو ان دونوں کا منشا ایک ہی ہے، مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے، قانون برائیوں کو تو روک لیتا ہے، مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا، جو انسانیت کی جان ہے، اور اخلاق پر عمل کرنے کے لئے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس کے ذریعہ عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہوسکتا، توراۃ محض قانون ہے، اور انجیل محض اخلاق، اس لئے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ اور فساد اور بدیوں اور برائیوں کے

انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہیں، آنحضرتؐ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں کی جامع ہے، اس جامعیت کا اصول شریعت محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی، اور نہ ہی عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کرکے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا، بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرکے ہر ایک کی حد مقرر کردی، اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہونچادیا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/ص:۵۰۔۵۱

نکاح کے برکات

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت، بلکہ آزاد وغلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر وبرکت کا سبب قرار دیا، فرمایا: وَأَنكِحُوا الْأَيَامَى مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ [نور:۳۲] (اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہو یا بیوہ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا، اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے)۔

اس آیت پاک کا فقرہ کہ وہ اگر غریب وتنگ دست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنے مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا، یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر وبرکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بناء پر کہ اگر ایک ہی کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے میں فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہونچے گا اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے، ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے، اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے، اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں، خصوصا مزدور اور کاشتکار۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لئے جو بیکاری سے غریب ہے، بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے، خصوصا اس لئے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کر دے گی جس کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہیں ہوسکتا، آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے، اس کی

گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لئے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں، پھر قرآن نے زن وشو کے باہمی اخلاص ومحبت کو اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ [روم:۲۱] (اور اس خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کی، تا کہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی نشانیاں ہیں)۔

قرآن پاک نے ایک لفظ سکون سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے۔(۱)

---

(۱) سیرۃ النبی: ج/۶ ص:۱۲۲-۱۲۴

صلہ رحمی

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى [شوریٰ:۲۳] (کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو)۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں۔اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے، کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات، اور حقوق محبت واعانت کی اصل گرہ ہے، یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہم سائیگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لئے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے۔لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے، جس کا موطن رحم مادر ہے، یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے، اور جس کو توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لئے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے، ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحی محمدی نے فاسق کا خطاب دیا ہے، اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے: ''وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ [بقرہ:۲۶۔۲۷] (اس سے وہ ان ہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے، جو خدا کا عہد باندھ کر توڑ دیتے ہیں، اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا اس کو کاٹتے ہیں)۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/ص:۱۳۴

یتیموں کے حقوق

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَاماً وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوفاً وَابْتَلُوا الْيَتَامَى حَتَّى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْداً فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ [نساء:۵۔۶] (اور بیوقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو، اور ان سے معقول بات کہو، اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو)۔

ان آیات پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے کہ تم ''اپنا مال'' ان کو نہ دو، اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے، وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی ہے، کہ تم ''ان کا مال'' ان کو واپس کر دو، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے، جیسے اپنے مال کی، جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے۔جس پر تمہارا کوئی حق نہیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/ص:۱۴۱۔۱۴۲

احسان کی وسعت

و أحسن کما أحسن الله الیك (قصص:۷۷)

(اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر)

لوگ احسان کو غلطی سے دولت وتمول اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لئے دولت کی نہیں، دل کی ضرورت ہے۔ اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرتؐ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا: تمہاری تقریر گو مختصر ہے، مگر تمہارا سوال بہت بڑا ہے: تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھوڑاؤ، اس نے کہا یا رسول اللہ! یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا: نہیں، اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو، تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے، اور دوسرے کے ساتھ شریک ہوکر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھوڑانا ہے، اور لگاتار دیتے رہو، اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کرسکو، تو بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ، اور نیکی کے کام کرنے کو کہو، اور برائی کے کام سے باز رکھو۔ اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو (مستدرک حاکم)۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے، فرمایا: جو روزی خدا نے دی اس میں سے دوسروں کو دے۔ عرض کی کہ اے خدا کے رسول

!اگر وہ خود مفلس ہو، فرمایا: اپنی زبان سے نیک کام کرے، عرض کی: اگر اس کی زبان معذور ہو، فرمایا: مغلوب کی مدد کرے، عرض کی: اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو، فرمایا: جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو، اس کا کوئی کام کردے، عرض کی: اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو، فرمایا: اپنی ایذاء رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔ (مستدرک حاکم) (۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج/۶ ص: ۲۲۶

حلم و بردباری

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

إِن تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ [تغابن:۱۷] (اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دونا کر دے گا، اور تمہیں معاف کرے گا، اور اللہ ہے قدر دان اور تحمل والا)۔

اس کی قدر دانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلے دو دے گا، اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا، اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں، اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں، اس لئے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے، لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے، یا اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/ص:۲۳۳

خودداری کا اعلیٰ درجہ

فقر و فاقہ کی حالت یا حرص و طمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے، اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابل ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحاب صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْباً فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً [بقرہ۲۷۳] (خیرات تو) ان حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر سے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے، بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے، تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صوت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے)۔

اس آیت میں فقر و فاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے، صاحب کشاف نے "لایسألون الناس الحافا" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "وہ سوال تو کرتے ہیں، لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں" لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی، اصحاب صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لئے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے

آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے، جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر وفاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت واصرار کا سوال ہے، کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لئے یہ حالت خود لجاجت واصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت واصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے، لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے، بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر وفاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔ (تفسیر کبیر ج ۲/۵۲۶) (۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۶/ص ۲۴۹۔۲۵۰

جھوٹ برائیوں کا مجموعہ ہے

جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے:

أفاك اثيم [شعراء:۲۲۲] (جھوٹ بولنے والا گنہگار)

كذب كفار [زمر:۳] (جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا)۔

مسرف كذاب [مومن:۲۸] (بے باک جھوٹا)

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپا لوں گا، اس لیے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا، اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کا ہے کو آنے لگا، اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔ (۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج ۶/ص ۲۷۶۔۲۷۷

چغل خوری قتل کا پیش خیمہ

اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو، فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِن جَاءكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ [حجرات:٦] (اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو، کہیں کسی پر نادانی سے جا نہ پڑو، پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو)۔

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصیتوں، بالخصوص عزیز واقارب اور دوست واحباب میں نااتفاقی پیدا کرنا ہوتا ہے، اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسولؐ نے فرمایا: میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں، پھر خود ہی فرمایا: المشاؤن بالنميمة المفسدون بين الأحبه [مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید] (جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں)۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اور قتل وخون ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اسی

کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے، اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب وفریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن ومعاشرت کا ایک جزو ہوگئی ہے، اگر امراء کے درباروں میں تملق وخوشامد کے لئے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریح خاطر اور لطف صحبت کا کام لیا جاتا ہے، اس لیے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے، اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہیں سمجھتے، اسی نکتہ کو رسولؐ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا، فرمایا ان پر عذاب ہو رہا ہے، لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا، حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں، ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا، اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں، یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپؐ نے یہ فرمادیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں، پھر جب وحی کے ذریعہ آپؐ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کردیا، اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں، بلکہ کبائر وموبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افکِ عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّناً وَهُوَ عِندَ اللّهِ عَظِيْمٌ [نور:۱۵] (جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل در نقل کرنے اور اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو

ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے)۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج/۶ ص۲۹۲۔۲۹۴

باہمی تعلقات برقرار رکھنے کا ذریعہ

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت وآبرو محفوظ رہے اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں، اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت وآبرو کو صدمہ پہنچتا ہے، اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کردیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاء مِّن نِّسَاء عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللّهَ إِنَّ اللّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ [حجرات:۱۱۔۱۲]

(مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی برا ہے، اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی خدا کے نزدیک ظالم ہیں، مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو، کیونکہ بعض شک داخل گناہ ہیں، اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو، اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے

مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو، بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول وعمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہیے، لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقہ سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے، امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز واشارات، تحریر وکتابت اور محاکات ونقالی، ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جاسکتے ہیں، اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین ودنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جاسکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے، اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے، جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں:

۱۔ انسان کا گوشت محض اس کی عزت وحرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس لیے جو چیز اس کی عزت وحرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

۲۔ لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدت غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں اگر چہ یہ بھی ایک برا فعل ہے، تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رودرو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی۔

لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے، اور بعینہ ایسا ہے، جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

۳۔ لوگ شدت محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت وسنگدلی اور بغض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ اس لطف ومحبت کے منافی ہے جس کو اسلام

مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا، اس لئے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے، اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے، اور صرف رمز واشارہ سے کام لینا چاہئے، اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶ ص: ۲۹۵۔۲۹۶

بخل کی وسعت

بخالت ان بیماریوں میں سے ہے، جو درحقیقت اعمال کی جزاء وسزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوسکتا، سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے، تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دین حق پر اعتراض کیا کرتے تھے، اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا وسزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ [مدثر:۴۲۔۴۶]

(تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے، اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روز جزاء کو جھٹلاتے تھے)۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے، اور وہ عمل کی جزا وسزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہا گیا، جو مذہبی جزا وسزا کا قائل نہیں، وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کرسکتا، یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ [ماعون:۱۔۳] (کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے، اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے)۔

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں، کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہوسکتی، جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے، اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی تو وہ ایک ڈھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے، اور کبھی ضائع نہیں جاسکتی۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال ودولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ خدا کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں، جس کو علم ملا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے، جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لئے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللّٰه [بقرہ:۱۴۰]

(اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے)۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا، اس لیے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶ ص:۳۰۳۔۳۰۸

غصہ پر قابو پانے کے طریقے

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظ [آل عمران:۱۳۴] (اور وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں)

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے، اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے اس لیے ایک مسلمان کو چاہئے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے:

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظ [آل عمران:۱۳۴] (اور جب وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں) اور دوسری جگہ فرمایا وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ [شوریٰ:۳۷] (اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں)۔ انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے، اسی لئے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔ (صحیح مسلم)

آنحضرتؐ نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ خداوند! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کر لے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ

غصہ شیطانی حرکت ہے تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کر لے، اس سے منشاء یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی، اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔ (۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶ ص:۳۲۶۔۳۲۷

اسلامی سلام اور غیر اسلامی سلام

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے، اور ان سے سلام علیک کئے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) [نور:۲۴]

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لئے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنالیا۔ [ترمذی]

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا، اور ہے، عرب کے لوگ ملاقات کے وقت " أنعم الله بك عينا، وأنعم الله بك صباحا" کہتے تھے، یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، تمہاری صبح خوشگوار ہو، امرا و سلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے، ایرانی، ہزار سال بزی، ہزار برس جیو، کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو گڈ مارننگ (اچھی صبح) شام کو گڈ ایوننگ (اچھی شام) رات کو گڈ نائٹ (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے اس سب کے بجائے "السلام علیکم" کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں:

۱۔ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے

استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں وَالسَّلَامُ عَلَيَّ (مریم۳۳) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ [صافات:۱۸۱] ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی گھر میں جانے کے لئے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيْهَا أَحَداً فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِن قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْمٌ [نور:۲۴۔۲۷]

(مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے، اور اور ان سے سلام علیک کئے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے، اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے)۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶ ص:۳۶۶۔۳۶۹

دن میں عربوں کے آرام کا وقت

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:۔

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُم بِاللَّيْلِ (روم:۲۳) (اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے)۔

سورۂ فرقان میں فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاساً وَالنَّوْمَ سُبَاتاً وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورا [فرقان:۴۷] (اور اسی نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا)۔

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے، اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لیے ہے، یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گذرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور آیت ۵۷ میں ہے:۔ حِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ اور رات آرام میں گزاری جائے اور ہوسکے تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں، آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے (بخاری)۔

یہ تو عام افراد کے لئے ہے، لیکن خاصان خدا ایسے بھی ہوسکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے: كَانُوا قَلِيلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ [ذاریات:۱۷] یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶ ص:۳۷۷

لباس کے دو مقصد

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِي سَوْءَاتِكُمْ وَرِيشاً وَلِبَاسُ التَّقْوَى ذَلِكَ خَيْر [اعراف:۲۶] (اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک، جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان، اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے)۔

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں: ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی، جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے، اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے، وہ چھپے رہیں، اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جز ٹھہرایا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہوسکتی۔

مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لئے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں اور گٹوں تک اور لونڈیوں کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے، جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تنہائی میں ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں، ایک صحابی نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا: خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے (ترمذی)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہوجاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو، اور ان کا لحاظ رکھو۔

حضرت آدمؑ اور حوا کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے، خدا کی نافرمانی کرنے

سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے:

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْءَاتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ [اعراف:۲۲] تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا، ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خداتعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا میں آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انہوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے، (صحیح مسلم) ورنہ یونہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب وسلیقہ کا یہ سبق دیا:

يَا بَنِيْ آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِيْ سَوْءَاتِكُمْ وَرِيْشاً وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَلِكَ خَيْر [اعراف:۲۶] (اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک، جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان، اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے)۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۶/ص۳۷۹

کتاب اور میزان

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ [حدید:۲۵] (اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں)۔

میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے، جس سے سارا نظام کائنات تُل رہا ہے، اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ [رحمٰن:۱-۹]

(رحمت والا خدا جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھدی، تاکہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور قول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں)۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے

جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے اس لیے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد وارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد وارادہ کے بغیر کس طرح عدل وانصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام واصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد وارادہ کی دولت ونعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہئے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد وارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے:

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ [انعام:۱۵۲] (اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو)۔

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ [اعراف:۸۵] (تو ناپ اور تول کو پورا رکھو)۔

أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ [ہود:۸۵] (ناپ اور تول کو پورا کرو)۔

وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ [ہود:۸۴] (ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں)۔

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید وفروخت کی اشیاء بھی مراد لے جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں، ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لیے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسری ترازو سے، اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ [تطفیف:۱-۳] (پھٹکار ہے ان کم کردینے والوں پر جو اپنے لیے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں)۔

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ

بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ [حدید:۲۵] (اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں)۔

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب، یعنی احکام الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح وعادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے، اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکام الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں، ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت وریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانون الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہئے، جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۷/ص:۱۲-۱۴

لطف ومسرت کا اعلیٰ ترین تخیل

وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [آل عمران:۱۸۵]
(اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی)۔

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے، جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کیلئے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو، تو بالآخر ان کی انتہا ان ہی باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں، وہ یہی ہیں: باغ وبہار، لباس وطعام، حور وقصور، خدم وحشم، سامان واسباب اور زر وجواہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا، اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے، اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا، اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے، اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے، اس لئے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی ومانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی، اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

اس دنیائے کون وفساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں، ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے، لیکن اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر وشکر کا دامن نہیں پکڑا ہے، تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور وتخیل کی تکلیف میں کوئی اور

گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی: لهم فيها مايشاؤن عند ربهم [زمر:۴] (ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں گے)۔

الغرض جنت وہ مقام ہے، جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا، جہاں تک ہمارا مرغ خیال اُڑ کر پہنچ سکتا ہے، لطف ومسرت کا وہ بلند سے بلند معیار جو تصور میں آسکتا ہے۔ وہاں ہمارے لئے مہیا ہوگا۔

صحابہؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے، جنت کے سامان مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ ﷺ سے پوچھتے رہتے تھے، اور آپ ﷺ جواب دیتے تھے، حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا، اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کرے گا، تو خدا فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب کچھ دیا گیا، جس کی تو نے آرزو کی تھی، اور اس کے برابر اور۔ (صحیح مسلم) یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا، تو بازار بھی لگے گا، لیکن وہ حقیقی خرید وفروخت نہ ہوگی کہ وہاں کی کس چیز کی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی، الا الصور من الرجال [ترمذی]۔

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری، یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائے گا، ایک بدوی نے پوچھا: یارسول اللہ (ﷺ)! وہاں گھوڑے بھی ہوں گے، فرمایا کہ اگر تم کو جنت ملی تو اگر یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو، جو تم کو جہاں چاہو، بہشت میں لئے پھرے تو وہ بھی ہوگا، دوسرے نے پوچھا کہ یارسول اللہ! (ﷺ) اونٹ بھی ہوگا، فرمایا: اگر تم جنت میں گئے اور تمہارے لئے وہ سب کچھ ہوگا، جو تمہارا دل چاہے گا، اور تمہاری آنکھیں پسند کریں گی (ترمذی)۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی: ج۴ ص۴۲۶

باغ جنت کا استعارہ

بشر الذین آمنوا وعملوا الصالحات أن لهم جنات تجری من تحتها الأنهار [بقرہ :۲۵](اوران کو جوایمان لائے اوراچھے کام کئے یہ خوشخبری سنا کہ ان کے لئے وہ باغ ہیں،جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی)۔

آخرت کے خانہ عیش وراحت کے لئے قرآن پاک نے عموما جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شوروبے حاصل اور خشک صحرامیں بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبزوشاداب باغوں ہی کی ہوسکتی ہے اس لئے ان کے لئے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لئے قرآن نے استعمال کیا ہے،مگر یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں، بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اس لئے عرب کی تخصیص بے معنی ہے،کیا دنیا کے سرسبزوشاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ وراغ اور رنگ وگل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے،اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان وگلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے،انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو،مگر وہ سرسبزوشاداب قطعات باغ وبہاراور کنار آب ونہر کو عیش ومسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے،انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن وغم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے،اہل وعیال اور دولت ومال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوئی ہیں،مگر جب انسان سیروتفریح کے لئے باغ وچمن کا رخ کرتا ہے،تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور

ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے،اور ایسا شاداں وفرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہوجاتے ہیں،وحی محمدی علی صاحبہا السلام نے اس لفظ کو اسی لئے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش ومسرت شادی وخوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی ج ۴/۴۲۰

مراجع کتاب

قرآن مجید

افکار سلیمانی مولانا مجیب اللہ ندوی ،ندوۃ التألیف والترجمۃ، جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

بیان القرآن مولانا اشرف علی تھانوی، تاج پبلیشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

بریدفرنگ علامہ سید سلیمان ندوی مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۹۱ء

ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، دہلی ۲۰۰۴ء

تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی تاج کمپنی نئی دہلی ۱۹۹۹ء

ترجمہ قرآن مولانا فتح محمد

تفسیر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۰۸

ترجمہ قرآن مولانا محمد جوناگڑھی، شاہ فہد قرآن پرنٹنگ کامپلکس، مدینہ منورہ

تاریخ ارض القرآن علامہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۰۳ء

تذکرۂ سلیمان مولانا غلام محمد حیدرآبادی ادارہ نشر المعارف کراچی طبع ثانی ۱۹۸۴ء

تراجم علمائے اہل حدیث مولانا ابویحیی نوشہروی

پرانے چراغ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ،مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ ۱۹۹۳ء

الجھد والجھاد لعلمی المعاش والمعاد علامہ سید سلیمان ندوی

حیات امام مالکؒ علامہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء

حیات سلیمان مولانا شاہ معین الدین ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء

خطوط سلیمان (مخطوط) مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، شعبہ مخطوطات کتب خانہ شبلی نعمانی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

خطوط سلیمانی ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، ادارہ تصنیف وتحقیق، کراچی، پاکستان ۱۹۹۳ء

دعوت فکر وعمل مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

روح البیان شیخ اسمٰعیل حقی

سنن ترمذی

سنن ابوداود

سنن نسائی

سنن ابن ماجہ

سیرۃ النبی علامہ سید سلیمان ندوی، مکتبہ مدنیہ لاہور صفر ۱۴۰۸ھ

سیرت عائشہ علامہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۳ء، طبع یازدہم

شذرات سلیمانی مرتب شاہ معین الدین ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۹۰ء

صحیح بخاری

صحیح مسلم

عروج سلطنت انگلشیہ منشی ذکاء اللہ

علامہ سید سلیمان ندوی کے چند نادر خطبات ورسائل کا مجموعہ مرتب ڈاکٹر سید سلمان ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۲۰۰۳ء

علامہ شبلی کی قرآنی فہمی ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، فاران اکیڈمی علی گڑھ، یوپی ۲۰۰۵ء

علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں

قرآنی افادات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، محمد الحسنی ٹرسٹ، تکیہ کلاں، رائے بریلی، جنوری ۲۰۰۵ء

کاروان رفتہ مولانا اسیر ادروی، دارالمؤلفین، دیوبند ۱۹۹۴ء

مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں مولانا محمد عمران خان ندوی، ادارہ احیاء علم ودعوت لکھنؤ ۲۰۰۴ء

مشاہیر علمائے ہند کے خطوط مفتی ظفیر الدین مفتاحی، قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء

موطا امام مالکؒ

موضح القرآن شاہ عبدالقادر
معارف القرآن مفتی محمد شفیع عثمانی، یاسین بکڈپو، ۲۰۱۱ء
معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلوی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
مطالعہ سلیمانی مولانا محمد عمران خان ندوی
مقالات سلیمان علامہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء
مکاتیب شبلی مرتب علامہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، طبع چہارم
مکتوبات سلیمانی مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی
مکاتیب سلیمان مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ چراغ راہ، لاہور، مئی ۱۹۵۴ء
مولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیفات مولانا شاہ معین الدین ندوی
نکات سورۂ فاتحہ مرتبہ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
نوائے حیات مؤلفہ یحیی اعظمی
ہماری ملی ذمہ داریاں علامہ سید سلیمان ندوی
یادرفتگاں مولانا سید سلیمان ندوی

رسائل و جرائد

الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء
تعمیر حیات ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۱۹۶۴ء
ذکر و فکر دہلی
ریاض کراچی، پاکستان
صدق لکھنؤ ۱۹۳۷ء
معارف دارالمصنفین، اعظم گڑھ
الندوہ، ندوۃ العلماء